آفت زادہ
طاہر جاوید مغل
Ph: 7311965

عرض مصنف

میری ابتدائی کہانیوں کے موضوعات خاصے مختلف رہے ہیں۔ ان کہانیوں کی بنیاد صرف ٹھوس حقائق اور قابل محسوس واقعات پر ہوتی تھی۔ ماورائی موضوعات اور مافوق الفطرت کرداروں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ اس دنیا میں سب کچھ وہی نہیں ہے جو ہمیں نظر آتا ہے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو واقعی ہے لیکن قابل محسوس نہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے میں سمندر کے کنارے کھڑا ہوں اور سمندر کا صرف وہی حصہ دیکھ رہا ہوں جو افقی لائن تک مجھے نظر آتا ہے۔ اس سے آگے کا لامتناہی سمندر میری نگاہوں سے اوجھل ہے۔

یہ زیرنظر ناول بھی اسی سمندر کی ایک جھلک ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس کہانی کے کردار آپ کے گرد کے جیتے جاگتے کردار ہیں، قریباً آدھی کہانی کا ماحول بھی وہی ہے جو ہمارے آس پاس نظر آتا ہے، تاہم اس ماحول میں بھی آپ کچھ ایسے پراسرار واقعات پڑھیں گے جو آپ کو سوچنے اور کھوجنے پر مجبور کریں گے بعد کی کہانی آپ کو ایک اجنبی ان دیکھے ماحول میں لے جائے گی۔ یہاں آپ انسانی ذہن کی اس مسخر کر لینے والی قوت کے بارے میں پڑھیں گے جو پراسرار ہونے کے باوجود سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ درحقیقت ہم سب ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جب انسان کا ذہن، (جو اپنے اندر اسرار کا ایک جہاں ہے) آہستہ آہستہ انسان پر کھلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں سے پھوٹنے والی قوتوں کو اہل دانش مختلف نام دے رہے ہیں۔ مسمریزم، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی یہ سب نام ہم نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق رکھ تو لئے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ آنے والی صدیوں میں یہ نام کیا کیا رنگ بدلیں گے اور کیا کیا معنی اختیار کریں گے۔

زیرنظر کہانی حسین وجمیل دوشیزہ آرزو کے گرد گھومتی ہے لیکن اس کہانی کا اہم ترین کردار جلال ہے۔ وہ آرزو سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت اسے اتنی طاقت بخشتی ہے کہ وہ اپنے حسین خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے دیوانہ وار بحر طلسمات میں کود پڑتا ہے۔ یہ سچے جذبوں اور لگن کے عروج کی روئیداد بھی ہے۔

شاید میں یہ ناول نہ لکھتا اگر ناول کے پبلشر آفتاب ہاشمی صاحب کے اندر مجھے اتنا شوق اور ایسی لگن نظر نہ آتی۔ وہ جواں سال ہونے کے علاوہ جواں ہمت اور ہواں ارادہ بھی دکھائی دیتے ہیں، ان کا ادارہ اچھی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی آفتاب ہاشمی کے ذریعے آپ سے ملاقات ہو۔ زیرنظر کتاب کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

طاہر جاوید مغل

طاہر جاوید ٹمبرز 51۔ ملتان روڈ لاہور۔

وہ ستمبر کی ایک خوش رنگ شام تھی' افق پر ہلکی ہلکی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے پھول پتوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ہر چیز خوب اجلی اور چمکدار نظر آتی تھی۔ ایسی شامیں دل کی گہرائی میں دور تک اتر جاتی ہیں اور انسان کو ایک نئی امنگ ترنگ سے بھر دیتی ہیں۔ میں چھت پر ورزش کرنے کے بعد سیڑھیاں اتر رہا تھا جب جھروکے میں سے میری نگاہ اس پر پڑی وہ حسب معمول سیاہ برقع میں تھی۔ آنکھوں سے نیچے کا سارا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ پیشانی بھی چھپی ہوئی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں برقع سے باہر تھیں لیکن ان پر بھی اس نے سیاہ عینک چڑھا رکھی تھی۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتی ہمارے دروازے کے سامنے سے گزری اور دو گھر چھوڑ کر اس گھر کے دروازے میں داخل ہوگئی جہاں وہ رہتی تھی۔ ایک پانچ چھ سالہ بچہ بھی اس کے ساتھ تھا یہ اس کا بھائی تھا۔

وہ گلی سے گزر کر گھر میں داخل ہوگئی تھی لیکن فضا میں جیسے ابھی تک اس کے قدموں کی آہٹ اور بدن کی کھن کھناہٹ موجود تھی۔ گلی کی نکڑ پر ہیرو وڈیو شاپ کے باہر بیٹھے ہوئے لڑکے چہ مگوئیاں کر رہے تھے اور ان میں سے کچھ کی نگاہیں ابھی تک بند دروازے پر لگی تھیں۔ ان کے چہروں کی مسکراہٹیں اور دیگر حرکات و سکنات دور ہی سے

بتا رہی تھیں کہ موضوع گفتگو کیا ہے۔ انہوں نے نئے کرائے داروں کی اس برقعہ پوش لڑکی کو ڈاکو رانی کا خطاب دے رکھا تھا اور سرگوشیوں میں اس کے متعلق اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔ بہرحال اس لڑکی کا اور اس کے گھر والوں کا رہن سہن شریفانہ اور باوقار تھا ان کے حوالے سے کوئی ایسی ویسی بات بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی لہٰذا لڑکوں کو کبھی جراٴت نہیں ہوئی تھی کہ دبی دبی سرگوشیوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔

لڑکی کے والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے اور اب ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے۔ وہ صبح سویرے اپنی مہران گاڑی میں نکلتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے ان کا نام انوار احمد معلوم ہوا تھا۔ انہیں اس محلے میں آئے ہوئے اب ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آیا تھا لیکن امام صاحب اور قریبی جنرل اسٹور کے مالک مشتاق بھائی کے علاوہ کسی کو ان سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کتنے کم آمیز اور کم گو ہیں۔ کچھ یہی کیفیت ان کی بیوی کی تھی۔ وہ قریباً پینتالیس سال کی خوب گوری چٹی اور خوش شکل خاتون تھیں۔ ایک چادر انہیں سرتاپا ڈھانپے رکھتی تھی۔ چہرے کا بھی بہت تھوڑا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ایک خوش شکل مگر دکھوں کی ماری ہوئی عورت کا چہرہ ہے۔

وہ بہت کم بولتی تھیں اور جو بولتی تھیں وہ بھی اتنی دھیمی آواز میں ہوتا تھا کہ کان لگا کر سننا پڑتا تھا۔ وہ صرف دو چار بار مشتاق بھائی کے جنرل اسٹور پر نظر آئی تھیں یا پھر میں نے انہیں گھر کے دروازے کے سامنے ریڑھے والے سے سبزی خریدتے دیکھا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر گھریلو ملازم بھی ان لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اس کا نام خیرو تھا۔ وہ گم صم تو نہیں تھا مگر فالتو بات وہ بھی نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے چھت پر دیکھا تھا۔ وہ نقاب پوش لڑکی کے چھوٹے بھائی کو پتنگ اڑا کر دے رہا تھا۔ اس چھوٹے بھائی کا نام گڈو تھا۔ نام تو کچھ اور ہوگا مگر محلے کے ”دل پھینک“ لڑکوں کو یہی معلوم ہوا تھا۔ وہ کھیلنے کودنے کے لئے کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

صبح ادھیڑ عمر ملازم خیرو اسے سائیکل پر اسکول لے جاتا تھا اور سائیکل پر ہی واپس

لے آتا تھا۔ ہلکی براؤن آنکھوں والا ”گڈو“ بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ انور صاحب کو، ان کی بیگم کو اور اس بچے کو دیکھ کر ہی یار لوگوں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ پورا گھرانہ ہی خوبصورت لوگوں کا ہے اور گھرانے میں یقیناً نقاب پوش بھی شامل تھی۔ ان دیکھی چیز کا تجسس زیادہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محلے کے لڑکے چپکے چپکے نقاب پوش کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ ایک دو دفعہ میری موجودگی میں بھی ایسی باتیں ہوئی تھیں۔ احسان باڈی بلڈر کا خیال تھا کہ لڑکی کے چہرے پر کوئی داغ وغیرہ ہے جسے وہ پردے کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ میرا پڑوسی توفیق کہتا تھا کہ داغ واغ کا چکر نہیں۔ یہ کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔ زیادہ خوبصورت لڑکیوں کے چہروں پر دل جلے عاشق تیزاب وغیرہ بھی تو پھینک دیتے ہیں۔ اسلم ہیرو کا تجزیہ تھا کہ اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ ماضی میں کوئی سخت قسم کی بدتمیزی ہو چکی ہے جس کے ردعمل میں وہ ضرورت سے زیادہ باپردہ ہوگئی ہے۔

اس قسم کے تبصروں نے جب طول پکڑا تھا تو میں نے دوستوں کو خیال آرائی سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ خوامخواہ جیمز بانڈ بننے کی کوشش نہ کریں اور اپنے کام سے کام رکھیں۔ میں دوستوں کی اس ٹولی میں چونکہ قدرے بڑا تھا۔ ویسے بھی وہ میری عزت کرتے تھے۔ لہٰذا میرے کہنے پر اس روز یہ بے کار کے تبصرے اختتام پذیر ہوگئے تھے۔ بہرحال سچی بات یہ ہے کہ میں خود بھی اس نقاب پوش کے متعلق شدید قسم کے تجسس میں مبتلا تھا اور وہی کچھ سوچتا تھا جو یہ لڑکے سوچتے تھے۔

میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ستمبر کی ایک خوش رنگ شام کا ذکر کیا ہے۔ مجھے ہرگز ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ شام میری زندگی میں اتنی اہم ہے اور اس شام میں چند لمحے ایسے آئیں گے جب میری زندگی کا رخ تبدیل ہو جائے گا۔ بالکل جیسے اپنے زور میں بہتا ہوا پہاڑی دریا کسی چٹانی دیوار سے ٹکرائے اور ایک دم اپنی سمت بدل لے۔ یا کوئی تند و تیز جھونکا آئے اور ایک آوارہ پتے کو اپنی من چاہی سمت میں اڑا لے جائے۔ ورزش کے بعد میں چھت سے نیچے اتر آیا منہ ہاتھ دھویا اور امی...... امی کی آوازیں دینے لگا۔ امی جانتی تھیں کہ یہ میرے دودھ کا وقت ہے۔ وہ فریج میں سے میرے لئے ٹھنڈا دودھ لے کر آگئیں۔ دودھ کا گلاس لے کر میں اپنے کمرے میں پہنچا ڈیک آن کیا تو پتہ چلا کہ لائیٹ

گئی ہوئی ہے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی شام کا سہانا رنگ پوری طرح مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ میں کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھ کر دودھ کے گھونٹ بھرنے لگا۔ یہی وقت تھا جب اچانک لائٹ پھر سے آگئی میری نگاہ اس دو منزلہ مکان کی طرف اٹھی جہاں وہ نقاب پوش رہتی تھی۔ مکان کی ایک کھلی کھڑکی میں سے مجھے ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ لڑکی بھی شاید کھڑکی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ان لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی گردش رک گئی ہے۔ ہر چیز' ہر منظر' ہر آواز تھم گئی تھی۔ وہ لمحے یا شاید وہ لمحہ منجمد ہوگیا تھا۔ لڑکی تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی میں جان گیا کہ وہ کھڑکی بند کرنے کے لئے آرہی ہے۔ جب وہ کھڑکی بند کر رہی تھی میں نے اس کو زیادہ واضح اور بھرپور طریقے سے دیکھا۔ اس کو حسین کہنا بے معنی تھا بلکہ یہ لفظ اور اس جیسے تمام دوسرے لفظ جو شاعروں اور ادیبوں نے اس حوالے سے استعمال کئے ہیں۔ ان لمحوں میں بے کار اور حقیر محسوس ہوئے۔ اس کی ناقابل بیان دلکشی بجلی کی کڑک سے مشابہہ تھی جو آنکھوں کے راستے میرے جسم میں اتر گئی اور میری رگ رگ میں پھیل گئی۔ اس کی عمر بائیس چوبیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ لمبا قد لمبے بال رنگت ایسی کہ جیسے صبح صادق میں چاندنی دودھ اور گلاب کی رنگت کو ملا دیا گیا ہو۔ اس کے سنگ مرمر کے تراشے ہوئے بدن پر ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ تھا۔ اس نے اپنا بازو بڑھایا اور ایک انداز غلط سے میری طرف دیکھ کر کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی بند ہوگئی لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا میری آنکھ میں جنبش تھی نہ جسم میں۔ میں جیسے پتھرا گیا تھا۔ میرے پاؤں کسی نے جکڑ لئے تھے۔ میری سانس کسی نے تھام لی تھی اور دھڑکن......... دھڑکن تو پتا نہیں کب کی تھم چکی تھی۔

میں نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا اور سریلا سا قہقہہ کانوں میں گونجا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا یہ میری بھابی تھی انہوں نے مجھے شوخ نظروں سے سرتاپا گھورا اور بولیں۔ "کیا ہو رہا ہے بھئی! کہیں کانوں میں کچھ ٹھونس تو نہیں رکھا۔"

میں نے کہا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

وہ بولیں۔ "تین چار آوازیں دی ہیں میں نے تم کو تم جیسے یہاں تھے ہی نہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ میرے کانوں میں انگلیاں گھمائیں اور بولیں۔ "روئی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" میں خجل سا ہو کر کھڑکی سے ہٹ آیا اور صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ بھابی بدستور کھوجنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "جلال! عرصہ تین سال سے تمہاری بھابی کے عہدے پر فائز ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کیا کرو۔"

"میں نے چھپانے کی کوشش کب کی ہے۔"

انہوں نے رسٹ واچ دیکھی اور بڑے انداز سے بولیں۔ "دو منٹ اور کوئی پچیس سیکنڈ ہوئے ہیں جب تم نے پہلی بار کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔"

"وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔" میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا انکل لقمان کے بارے میں پھر بات کریں گے۔" بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جن کو انکل لقمان کہہ رہی تھیں وہ میرے تایا تھے۔ تایا لقمان سے جو میرا رشتہ تھا اس کے بارے میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ بھابی کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور ہاتھ پشت پر باندھ کر عجیب بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ میں خود کو جیسے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے کمرے کی کھڑکی میں سے میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خواب نہیں ہے اور میں نے اپنے ہوش و حواس میں اپنی ان آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں کوئی ٹین ایجر نہیں تھا نہ ہی لڑکی میرے لئے کوئی انوکھی اور ان دیکھی شئے تھی میری عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تھا۔ کو ایجوکیشن کے ماحول میں پلا بڑھا تھا۔ ذاتی طور پر بے شک میں حسن و عشق کے خار زار سے نہیں گزرا تھا لیکن اس حوالے سے لاعلم بھی نہیں تھا۔ پہلی نظر کا عشق ایک عام اصطلاح ہے یہ لفظ یقیناً میری نگاہ سے بھی بارہا گزرا تھا۔ کبھی میں نے اسے سنجیدگی سے سنا تھا۔ کبھی مذاق میں لیا تھا۔ نہ جانے کیوں کمرے میں ٹہلتے ہوئے میری چھٹی حس پکار پکار کر مجھے خبردار کرنے لگی کہ مستقبل قریب میں اس لفظ سے میرا واسطہ پڑ سکتا ہے۔

☆==========☆==========☆

سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے لگ رہا تھا کہ میرے اندر کچھ ہوگیا ہے۔ کوئی ایسی تبدیلی واقع ہورہی ہے جو نہیں ہونی چاہئے۔ میں ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے کے اندر ٹہلتا رہا اور اس چکا چوند حسن کے بارے میں سوچتا رہا جو سرشام میں نے پڑوس کے جھروکے میں دیکھا تھا۔ مجھے سوفیصد یقین ہوگیا تھا کہ یہ وہی نقاب پوش ہے۔ اسے نقاب پوش ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ کھلے منہ گھر سے نکلتی تو ایک خلقت کو دیوانہ کردیتی۔ فتنے کھڑے ہوجاتے' بہت کچھ درہم برہم ہونے لگتا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میں نے بھی اسے اتفاقاً ہی دیکھ لیا ہے ورنہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں اس کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ دراصل یہ سارا بجلی کی رو منقطع ہونے کا کرشمہ تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی رکھنے کے لئے کھڑکی کھولی تھی۔ اس دوران میں لائٹ آگئی تھی اور میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ کھڑکی بند کرنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھی تھی اور مزید آشکار ہوگئی تھی۔

رات کو دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک دو بار اٹھ کر کھڑکیوں میں سے جھانکا۔ رات تیسرے پہر آنکھ لگ گئی۔ صبح دم جاگتے ساتھ ہی جو پہلا خیال ذہن میں آیا وہ کھڑکی کا تھا۔ لپک کر کھڑکی تک پہنچا اور اس کھڑکی کو تکنے لگا جس میں سے کل شام میں نے جاگتی آنکھوں سے ایک حسین سپنا دیکھا تھا۔ کھڑکی بند تھی' جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھی جیسے کبھی کوئی اس کی چوکھٹ تک آیا ہی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ کہیں وہ سب کچھ کوئی بصری واہمہ تو نہیں تھا۔

میں نے ایم ایس سی سائیکالوجی میں کیا تھا۔ کیوں کیا تھا؟ اس کا علم خود مجھے بھی نہیں تھا' بس یہ مضمون مجھے اچھا لگا تھا۔ ویسے بھی پڑھ کر مجھے کوئی نوکری ووکری تو کرنا نہیں تھی۔ پاکستان کا دل لاہور ہے اور لاہور کے دل شاہراہ قائداعظم پر ہماری اسپورٹس کے سامان کی ایک بڑی دکان تھی۔ ہم اسپورٹس کی کچھ اشیاء خود بھی بناتے تھے اور بیرون ملک سپلائی کرتے تھے۔ فی الوقت والد اور بڑے بھائی ابدال صاحب نے کام سنبھال رکھا تھا تاہم کاروبار میں میری ضرورت بھی دم بدم بڑھتی جارہی تھی۔ بڑے بھائی ابدال نے میرے لئے آفس بھی تیار کر چھوڑا تھا اور ہر دوسرے تیسرے روز یاد دہانی کے لئے مجھ سے فرماتے تھے۔ "جالی صاحب تمہاری کرسی تمہارا انتظار کررہی ہے۔"

کبھی کبھی وہ یہ بات بھابی سمن سے بھی کہلوا دیتے تھے۔

میرے شوق بڑے مختلف قسم کے رہے تھے اور اس حوالے سے کزن حضرات میرا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ ایک طرف تو میں نے سائیکالوجی بڑے شوق سے کی تھی' دوسری جانب ایک بالکل مختلف قسم کا شوق بھی مجھے لاحق تھا۔ یہ مارشل آرٹ کا شوق تھا۔ سائیکالوجی نازک مزاج لوگوں کا شعبہ سمجھا جاتا ہے' مارشل آرٹ اور کراٹے وغیرہ سے بھلا اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن میں نے بڑی کامیابی سے یہ تعلق قائم کرکے دکھایا تھا۔ اس طرح لڑکپن میں مجھے پالتو جانوروں سے پیار اور شکار کے شوق بھی ساتھ ساتھ لاحق ہوئے تھے' حالانکہ یہ دونوں خاصے مختلف قسم کے شوق ہیں۔ اسی طرح ایک طرف مجھے خالص کلاسیکل موسیقی پسند تھی اور دوسری طرف پاپولر قسم کے فلمی گانے بھی دل کو بھاتے تھے۔

یہ مختلف اقسام کے شوق میری ذات کا حصہ تھے۔ بہرحال ان میں سے ایک شوق ایسا تھا جسے میں نے ماضی میں بڑی سنجیدگی سے لیا تھا اور کافی آگے تک پہنچایا تھا اس شوق سے میری زندگی کا ایک نہایت تلخ واقعہ بھی وابستہ تھا۔ ایک ایسا واقعہ جو ناقابل فراموش یاد بن کر میرے ذہن کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا.......... میں اپنے مارشل آرٹ کے شوق کی بات کررہا ہوں۔ میں لاہور میں کراٹے کے ایک اہم تربیتی ادارے میں درجہ بدرجہ مراحل طے کرتا ہوا بلیک بیلٹ تک پہنچا تھا۔ میرے محترم استاد جو پولیس فورس اور آرمی کے ٹرینر تھے بڑے وثوق سے کہا کرتے تھے کہ میں نہ صرف ملک میں بلکہ ملک سے باہر بھی نام روشن کروں گا.......... انہوں نے اور میرے ساتھیوں نے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کی تھیں مگر پھر ایک ایسا سانحہ ہوا تھا جس نے سب کچھ اتھل پتھل کردیا تھا' اور میرے راستے اچانک تبدیل ہوگئے تھے.......... ایک قومی سطح کے ٹورنامنٹ میں میرا مقابلہ عبدالواحد نام کے ایک سندھی نوجوان سے ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ وہ حافظ قرآن بھی تھا۔ تنومند جسم اور مسکراتے چہرے والا لڑکا تھا۔ تین منٹ کا مقابلہ تھا۔ مقابلے میں آخری منٹ میں حافظ عبدالواحد مجھے "اپرپام" کک مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ میں نے اس کی کک "بلاک" کرکے اسٹریٹ پنچ مارا۔ میں ہرگز شدید ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا لیکن عبدالواحد اپنی جھونک میں ضرورت سے زیادہ آگے آگیا تھا'

یا پھر شاید کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس فرشتہ اجل کو ایک بہانہ چاہئے تھا۔ میرا مکہ حافظ عبدالواحد کے سینے کی ہڈی سے ذرا نیچے لگا۔ اسے ہم اپنی زبان میں "پن پوائنٹ" کہتے ہیں۔ عبدالواحد کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گر گیا تھا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی اور اس نے ایسی درد بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا جنہیں میں بھول نہیں سکا اور شاید زندگی کی آخری سانس تک نہ بھول سکوں۔ ان نظروں نے کرب میں ڈوب کر مجھ سے پوچھا تھا۔ "یار یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میں تو گھر سے کھیلنے اور کھیل کھیل میں کپ جیتنے کے لئے نکلا تھا۔ اپنی ماں کی دعاؤں کے ساتھ' اپنی بہنوں کی نیک تمناؤں کے ساتھ۔ تم نے کھیل کو موت بنا دیا۔ میری ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی کڑی سزا دے دی تم نے؟"

فرش پر گرتے ہی حافظ عبدالواحد کے منہ سے خون نکل آیا تھا۔ اسے بڑی تیزی سے لاہور سروسز اسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ فوری طور پر تو اس کی جان بچ گئی تھی مگر اس کی حالت بدستور مخدوش رہی تھی۔ اسپتال پہنچنے کے ٹھیک بارہ دن بعد اس نے دم توڑ دیا تھا۔ جس وقت مجھے اس کی موت کی خبر ملی تھی اس گھڑی میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اب زندگی میں کبھی کراٹے کے رنگ میں داخل نہیں ہوں گا اور نہ کسی سے مقابلہ کروں گا۔

ان واقعات کو اب پانچ چھ برس گزر چکے تھے' میں اپنے عہد پر قائم رہا تھا اس حوالے سے میں نے ہر ترغیب' دباؤ اور پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے عزیز ترین اور محترم ترین استاد نادر احمد درانی صاحب کی بات بھی نہیں مانی جاتی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ کچھ چیزیں چھوٹنے کے باوجود مکمل طور پر چھوٹتی نہیں ہیں' مارشل آرٹ بھی میں مکمل طور پر چھوڑ نہیں سکا تھا۔ یہ شوق میرے خون میں شامل تھا' جدا ہو کر بھی کچھ زاویوں سے جدا نہیں ہوا تھا۔ میں روزانہ ورزش اور مشق کرتا تھا۔ سخت ورزش اور مشق کے بغیر میری وہی حالت ہوتی تھی جو کسی عادی نشہ باز کی نشے کے بغیر ہوتی ہے۔ میں مارشل آرٹ کے بارے میں تازہ ترین تحریریں بھی پڑھتا تھا اور اس حوالے سے خود کو باخبر رکھنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ مارشل آرٹ سے میرا ایک بڑا اداس اور رومانی سا رشتہ اب بھی قائم تھا۔ بالکل جیسے بیتی ہوئی رت کے گیت گائے جائیں یا بچھڑ جانے والی

محبوبہ کے پرانے خط پڑھے جائیں۔

.........ہاں تو میں بات کر رہا تھا ایک کھڑکی کی اور اس میں سے نظر آنے والی حسین و جمیل تصویر کی جو میرے دل ودماغ سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میرے اندر کچھ ہو گیا تھا اور مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایک کھلبلی سی تھی جو پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ میں اس کھلبلی کو محسوس کر رہا تھا مگر اسے ماننے سے انکار بھی کر رہا تھا۔ وہ سارا دن میں نے عجیب بے قراری کے عالم میں گزارا۔ درجنوں بار اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر نقاب پوش کے گھر کی کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن ہر بار وہ کھڑکی مجھے بند ہی ملی۔ اس طرح میں نے کئی بار گلی میں بھی جھانکا کہ شاید وہ برقعہ پہنے کہیں جاتی ہوئی نظر آئے لیکن یہ امید بھی بر نہیں آئی۔ شام ہوئی تو ورزش کے بعد میں نے کمرے میں آکر پھر کھڑکی کھولی اور دہلیز پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں پیاس کا ایک صحرا تھا جو کسی کی دید کے ایک قطرے کے لئے ترس رہا تھا۔ میری ساڑھے چار سالہ ننھی منی بھتیجی ارم کمرے میں آئی اور اپنی توتلی زبان میں بولی۔ "چاچو' آپ تصویل (تصویر) بنوا رہے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

وہ بولی۔ "ایک دفعہ ماماں نے تصویل بنوائی تھی۔ وہ ایسے ہی شام تک بیٹھی لہیں تھیں۔ ذلا بھی نہیں ہلتی تھیں۔"

"نہیں بھئی۔ میں تو یونہی ذرا تازہ ہوا کے لئے بیٹھ گیا۔"

وہ میری گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک اٹھکیلیاں کرتی رہی پھر اپنی پالتو بلی کے پیچھے بھاگ گئی۔

رات کو بھی میں دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا۔ نگاہوں کا مرکز نقاب پوش کا گھر ہی تھا۔ ایک دو بار ادھ کھلی کھڑکیوں کے پیچھے سے اہل خانہ کی جھلک بھی نظر آئی مگر نقاب پوش دکھائی نہیں دی.......... یہ دوسری رات کا واقعہ ہے۔ دس ساڑھے دس کا وقت تھا۔ میں اداس اُلو کی طرح چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹیکے کھڑا تھا اور نقاب پوش کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا.......... گھر کی چھت روشن تھی مگر وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چھت پر وہ لوگ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے تھے' کم از کم میں نے تو کبھی کسی خاتونِ خانہ کو چھت پر نہیں دیکھا تھا۔ اچانک میری نگاہوں میں بجلی سی چمک گئی۔ نقاب پوش کا پانچ چھ سالہ بھائی

گڈو بھاگتا ہوا چھت پر آیا۔ اس کے عقب میں نقاب پوش خود تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ دوپٹہ گلے میں تھا' لمبے بال لہرا رہے تھے۔ اس کا رنگین لباس قوس قزح کی طرح ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمکا۔ جسم ایک لچکیلی کمان سا تھا۔ دونوں چیختے ہوئے کسی چیز کی طرف لپکے۔ یہ دراصل سفید رنگ کی ایک شٹل تھی۔ گڈو شٹل تک پہلے پہنچ گیا تھا مگر نقاب پوش نے بڑی چالاکی سے گڈو کو تھوڑا سا دھکیلا۔ وہ اپنی جھونک میں شٹل سے بھی آگے نکل گیا۔ نقاب پوش نے شٹل اٹھائی اور ہنسی سے دہری ہوتی ہوئی نیچے بھاگ گئی' گڈو اس کے پیچھے تھا۔

یہ سب کچھ دو یا تین سیکنڈ کے اندر ہوا اب چھت پھر خالی تھی اور ہمیشہ کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا۔ بالکل جیسے کوئی شخص تاریک رات کے سنسان اندھیرے میں کھڑا ہوا۔ اچانک زور سے بجلی چمکے' چند لمحوں کے لئے قرب وجوار کی ہر شے کو روشن تر کردے.......... اور اس کے بعد پھر گھٹاٹوپ تاریکی چھا جائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نقاب پوش اپنے گھر کے بالائی صحن میں بھائی کے ساتھ بیڈ منٹن کھیل رہی تھی۔ اس کھیل کے دوران میں شٹل اوپر آئی تھی۔ نقاب پوش کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ رات کے ساڑھے دس' گیارہ بجے' سامنے والی تاریک چھت پر کوئی دید کا پیاسا یوں ٹکٹکی لگائے اس کے گھر کی طرف دیکھ رہا ہوگا۔ اگر اس کے ذہن میں یہ بات ہوتی تو شاید وہ کبھی چھت کا رخ نہ کرتی۔

اگلے روز میری آنکھوں کی قسمت چمک اٹھی۔ میں نے نقاب پوش کو برقعہ پہنے گلی سے گزرتے دیکھا۔ آج وہ تین چار دن کے بعد یوں دکھائی دی تھی۔ وہ سر تاپا برقعے میں چھپی ہوئی گلی سے گزر رہی تھی۔ برقعہ بھی ذرا کھلا سا تھا۔ اس کے جسم کو دکھانے کی بجائے چھپانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ یعنی وہی کام کر رہا تھا جو برقعے کو کرنا چاہئے۔ وڈیو شاپ کے سامنے موجود لڑکوں نے دلچسپی نظروں سے نقاب پوش کو دیکھا۔ چند دبی دبی سرگوشیاں بھی کی ہوں گی۔ چند راہگیروں نے بھی اس سیاہ برقعے پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ دکانداروں نے بھی برقعہ پوش کو سامنے سے گزرتے دیکھا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس برقعے میں کیسا چکا چوند حسن ان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ میرے قدم جیسے خود بخود نقاب پوش کے تعاقب میں اٹھنے لگے۔ میں اس قبیل اور اس مزاج کا نوجوان

نہیں تھا پھر بھی آج ایک بے خودی کا عالم مجھے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ نقاب پوش ڈیڑھ دو فرلانگ چل کر بڑی سڑک پر آگئی اور اسٹاپ پر کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اسٹیشن وین آئی۔ اس کی کھڑکیوں پر خوبصورت نیلگوں پردے آویزاں تھے اسٹیشن وین میں کچھ دیگر خواتین بھی نظر آرہی تھیں' نقاب پوش وین میں داخل ہوئی اور وین آگے بڑھ گئی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی انگریزی اسکول کی وین ہے بہرحال اسکول کا نام وغیرہ وین پر درج نہیں تھا۔

میں نے فوراً ایک رکشا رکوایا اور اسٹیشن وین کا تعاقب شروع کر دیا۔ وین لاہور کے پوش علاقے گلبرگ میں پہنچی اور ایک شاندار اسکول کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ یہ انگلش میڈیم اسکول' لاہور کے چند مہنگے ترین اسکولوں میں شامل تھا۔ میں اس اسکول کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا اور کیوں نہ جانتا میری پیاری بھتیجی ارم جس کا نک نیم رومی تھا اسی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ وہ پلے گروپ میں داخل ہوئی تھی اب پری نرسری میں تھی۔ ایک دو بار جب وین والا چھٹی پر تھا میں بھی رومی کو لینے کے لئے آیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ نقاب پوش اس شاندار انگلش میڈیم اسکول میں ٹیچرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میرے لئے یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ خوش ہو کر میں نے رکشا والے کو اچھی خاصی ٹپ بھی دے ڈالی۔

اس سے تیسرے روز کی بات ہے کھانے کی ٹیبل پر میں رومی سے پیار کر رہا تھا اور اپنے رومال سے اس کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اسکول سے لوٹی تھی اور تھکی تھکی نظر آتی تھی۔

میں نے بھابی ثمن سے پوچھا۔ "رومی کو کتنے بجے چھٹی ہوتی ہے بھابی؟"

"ایک بجے۔"

"اور اب ڈھائی بج رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ وین والا پورے لاہور کا چکر لگا کر رومی کو یہاں پہنچاتا ہے۔ بے چاری گرمی سے کملا سی جاتی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" بھابی نے سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے بھابی! رومی کو میں لے کر آیا کروں اسکول سے۔"

بھابی نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

ان کی حیرت بجا تھی۔ اس سے پہلے وہ اشاروں کنایوں میں کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ رومی بڑی دیر سے گھر پہنچتی ہے۔ ایک دو مرتبہ امی نے بھی کہا تھا کہ دوسری گاڑی گھر میں کھڑی رہتی ہے' اگر کوئی رومی کو لے آیا کرے تو بڑا اچھا ہو۔ یوں تو بھابی سمن خود بھی ڈرائیو کرلیتی تھیں لیکن ان کے پاس لائسنس نہیں تھا۔

"آپ حیرت سے کیا دیکھ رہی ہیں؟" میں نے بھابی سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کہ کسی نے درست ہی مقولہ بنایا ہے۔ بدھ کام سدھ.......... آج بدھ ہے شاید اسی لئے تمہارے منہ سے اچھی اچھی باتیں نکل رہی ہیں۔"

"میں تو ہر دن ہی اچھی باتیں کرتا ہوں۔ شاید آپ ہی غور نہیں فرماتیں۔" میں نے رومی کو گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"رومی بھئی تم گواہ رہنا کہ تمہارے چاچو نے آج کیا وعدہ کیا ہے۔"

رومی نے زور زور سے سر ہلایا۔

"بھئی میں خود بھی تو گواہ ہوں۔" ایک طرف سے امی نمودار ہوگئیں۔

"بس۔ آپ دو عورتوں کے ملاپ سے ایک گواہی مکمل ہوگئی۔ میں نے کہا۔

اگلے روز سے بڑے اہتمام کے ساتھ میں نے رومی کو کار پر اسکول لے جانا اور لانا شروع کردیا۔ رومی خوش تھی' گھر والے خوش تھے اور میں تو خوش تھا ہی۔ یہ تصور ہی بڑا خوشگوار تھا کہ ہر روز میری اور نقاب پوش کی منزل ایک ہوتی ہے۔ ایک دو بار میں نے نقاب پوش کو اسکول وین میں بیٹھتے بھی دیکھا' پھر ایک دو بار چھٹی کے وقت وہ گیٹ پر بھی نظر آئی لیکن ہر مرتبہ نقاب اور سیاہ عینک میری نگاہ کے راستے میں حائل رہے۔ میں صرف اس کی پیشانی کا مختصر سا حصہ ہی دیکھ پاتا تھا اور یہ مختصر سا حصہ اس کے پورے چہرے کی یاد میرے ذہن میں تازہ کردیتا تھا۔ میرے ذہن کا حسین ترین تصور قوی تر ہو کر میرے دماغ کو روشنی سے بھر دیتا تھا۔

وہ جب بھی نظر آتی تھی میں اسے بغور دیکھنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ شاید ایک دوبار اس نے بھی میرے اس انداز کو محسوس کیا ہو۔ بہرحال اس کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر ٹکٹکی باندھنے کا شغل بھی جاری تھا' اس کے علاوہ رات کو چھت پر چہل قدمی بھی معمول بن چکی تھی۔ دل میں آس تھی کہ ایک نہ

ایک دن پھر نقاب پوش اور اس کے بھائی کی شٹل چھت پر گرے گی اور وہ دونوں آگے پیچھے بھاگتے چھت پر نمودار ہوں گے اور میری آنکھوں کو ایک اور حسین ناقابل فراموش منظر کا تحفہ مل جائے گا۔

ایک روز میں رومی کو اسکول سے لینے گیا تو وہ چہک کر بولی۔ "چاچو آج ہمالی (ہماری) نئی ٹیچل (ٹیچر) آئی ہیں۔ اتنی پیالی ہیں اتنی پیالی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔" اس نے زور سے آنکھیں میچ کر کہا۔

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ میں نے اس حوالے سے رومی کو کچھ اور کریدا۔ معلوم ہوا کہ پہلے یہ خوبصورت "ٹیچل" فورتھ کلاس کو پڑھاتی تھیں' اب وہ پری نرسری کو پڑھانے لگی ہیں اور ان کی کلاس ٹیچر بن گئی ہیں۔ میں جان گیا کہ یہ خوبصورت ٹیچل کون ہے؟"

"میں نے ذرا رعب سے کہا۔ "تمہیں نئی ٹیچر سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

"نہیں چاچو! وہ تو ڈھیر ساری اچھی ہیں۔"

اب ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں روزانہ رومی سے اسکول کے حالات پوچھتا۔ کلاس ٹیچر کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتا' وہ بھی مزے مزے سے جواب دیتی۔ آج ٹیچل نے ہم کو ٹافیاں دیں.......... آج ٹیچل نے ہم کو نظم گا کر سنائی۔ آج ٹیچل نے ہم کو سنو وائٹ کی کہانی سنائی۔

رومی جیسے نئی ٹیچر کی گرویدہ ہوگئی تھی' اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کیفیت صرف رومی ہی کی نہیں' پوری کلاس بلکہ شاید اسکول کا ہی یہ حال ہے۔ میں نے اب خوامخواہ رومی کی پڑھائی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ میں اس کی کاپیاں چیک کرتا۔ ٹیچرز کے لکھے ہوئے نوٹس پڑھتا تھا۔ خوبصورت ٹیچل کی لکھائی اب میں دور ہی سے پہچاننے لگا تھا۔ اس کی لکھائی بھی اس کی طرح خوبصورت تھی بلکہ اسے حسین و جمیل کہنا چاہئے۔ یوں لگتا تھا کہ ورق پر کسی نے موتی سجا دیئے ہیں۔ اب مجھے خوبصورت ٹیچل کا نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا نام آرزو تھا۔ کسی نے بہت سوچ سمجھ کر نام رکھا تھا۔ شاید اس سے بہتر اس پری جمال کے لئے کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جو بھی ایک بار اسے دیکھ لیتا ہوگا' اسے قریب سے دیکھنے اور جاننے کی خواہش رکھتا ہوگا اور اس میں

بچے، بوڑھے یا مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ آنکھ کے راستے سیدھی دل میں اترتی تھی اور آرزو بن جاتی تھی۔ جیسے پھول چاند اور خوشبو کی آرزو ہوتی ہے، جیسے کسی حسین شام، خوبصورت موسم یا رنگ رنگیلے تہوار کی آرزو ہوتی ہے اس آرزو کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا مگر اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس کے دستخط دیکھتا اس کے لکھے ہوئے خوبصورت لفظوں کے دائرے نظر میں سموتا اور اس کا حسن سراپا میری نگاہوں کے سامنے اجاگر ہونے لگتا۔

ایک شام میں ورزش سے فارغ ہو کر بندر کی طرح کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھا بیٹھا تھا کہ بھابی آدھمکیں۔ آج کل میں ان کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ گاہے گاہے امی کے سامنے افشاں کا نام لے کر مجھے چھیڑتی رہتی تھیں۔ افشاں میری اس تایا زاد کا نام تھا جس سے میری منگنی ہونے والی تھی۔ میرے اور امی کے سامنے بار بار افشاں کا نام لینے سے بھابی کا مقصد غالباً یہی تھا کہ وہ مجھے یاد دہانی کرانا چاہتی تھیں۔ اشاروں کنائیوں میں مجھ سے یہ کہنا چاہتی تھیں کہ میاں صاحبزادے! تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ اگر کہیں اِدھر اُدھر ٹانگ پھنسانے کا سوچ رہے ہو تو باز آجاؤ' ورنہ یہ نہ ہو کہ سر میں خاک ڈال کر اور گریبان پھاڑ کر ریگستانوں میں لیلیٰ لیلیٰ پکارنا پڑے۔ مجھے چوکھٹ میں دیکھ کر بھابی بڑے انداز سے مسکرائیں اور بولیں۔ "بھائی! اب تو مجھے بھی اس چوکھٹ پر بیٹھ کر دیکھنا پڑے گا کہ یہاں سے کیا کیا نظر آتا ہے؟"

"دیکھ لیں گی تو پھر کیا ہوگا؟"

"دوسروں کو دکھاؤں گی اور بتاؤں گی کہ ہماری کھڑکی کی یہ چوکھٹ کوئی معمولی چوکھٹ نہیں ہے۔ یہاں سے دنیا بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔ اتنی خوبصورت کہ بندہ بغیر کچھ کھائے پیئے، گھنٹوں بیٹھا رہے تو بھی بور نہ ہو۔"

"بغیر کچھ کھائے پیئے؟ کیا مطلب؟"

"میں جناب کو یہ یاد دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ نے آج دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"اُفوہ۔" میں چونک گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"تبھی میں سوچ رہا تھا کہ پیٹ کچھ خالی خالی سا کیوں لگ رہا ہے؟"

"یہ نہ ہو کہ کل دماغ بھی خالی خالی سا لگنے لگے۔ ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ مٹھو میاں تم مجھے کسی گہرے چکر میں لگ رہے ہو۔"

"بھابی گہرا چکر ہوتا تو آپ کو پتہ نہ ہوتا' قسم سے ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا چھوڑو.......... بات بات پر قسم نہیں کھاتے.......... کل تھوڑا سا وقت ہوگا تمہارے پاس؟" بھابی نے موضوع بدلا۔

"کہیں جانا ہے؟"

"ہاں رومی کے اسکول میں والدین کا دن ہے۔" ذرا مجھے لے جانا۔

میرے سینے میں شادیانہ سا بج اٹھا۔ بہرحال میں نے دلی تاثرات چہرے پر نہیں آنے دیئے۔ کل ایک ضروری کام تھا مجھے "میں نے آہستہ سے کہا۔" کوشش کروں گا کہ جلدی آجاؤں۔ کتنے بجے جانا ہے آپ کو؟"

"نو دس بجے جانا تھا لیکن اگر تمہیں کام ہے تو رہنے دو' میں رکشے پر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں نہیں بھابی! آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ گاڑی ہوتے ہوئے آپ رکشے پر کیوں جائیں گی.......... ویسے میں خود بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ ایک دو باتیں میں بھی کروں گا ٹیچر سے۔ کاپیاں اب پہلے جیسی توجہ سے چیک نہیں کی جا رہیں۔ ابھی پرسوں دو غلطیاں پکڑی ہیں میں نے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" بھابی نے میری فکر مندی پر خوش دلی کا اظہار کیا۔

اگلے روز دس بجے میں رومی کے اسکول میں اس شعلہ بدن مہ جبین کے روبرو بیٹھا تھا جس کے تصورات شب وروز امر بیل کی طرح مجھ سے لپٹے رہتے تھے۔ اس پری جمال کا چہرہ آج بھی پوری طرح عیاں نہیں تھا۔ آنکھوں کے نیچے نیچے اس نے چادر کے پلو سے خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ نصف چاند تھا۔ پھر بھی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ دیکھنے والے کا دل بھی کھنچ کر آنکھوں میں چلا آتا تھا۔ وہ بھابی سے باتیں کرنے لگی' میں مبہوت سنتا رہا۔ کانوں میں جلترنگ سے بج رہے تھے۔ پتہ نہیں دس پندرہ منٹ کا وہ وقت کب اور کیسے گزر گیا۔ مجھے تو بس یہی لگا

کہ شاید میں نے ایک دوبار پلکیں جھپکی ہیں۔ اس ساری گفتگو میں بس آخری ایک فقرے ہی مجھے یاد رہے۔ بھابی نے آرزو سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ رومی کے چچا ہیں۔ اکثر رومی کو پڑھاتے بھی یہی ہیں۔"

"رومی بڑی ذہین بچی ہے۔ بس ذرا سی شرارتی ہے۔ آپ اس کی رائٹنگ پر تھوڑی سی توجہ دیں۔" آرزو نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"جی بہت اچھا۔" میرے ہونٹوں سے الفاظ اٹک کر نکلے۔

تھوڑی دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے واپس گھر جا رہے تھے۔ راستے میں بھابی نے کہا۔ "گھر میں تو تم بہت بول رہے تھے۔ ٹیچر سے یہ کہوں گا' وہ کہوں گا۔ وہاں منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔"

"بھابی آپ جو بول رہی تھیں۔"

"میں تو اس لئے بول رہی تھی کہ تم چپ تھے۔ بس ٹکٹکی لگا کر دیکھے جا رہے تھے اس کی طرف۔"

"ویسے بھابی لڑکی خوبصورت ہے۔ رومی ٹھیک ہی ہر وقت تعریفیں کرتی رہی ہے۔"

بھابی نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس دوران میں ہم اپنے گھر کو جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

☆=========☆=========☆

ایک دن چھٹی کے وقت میں نے رومی کو گاڑی میں بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی اسکول سے تین چار فرلانگ ہی دور آیا ہوں گا کہ ایک جگہ سڑک کے کنارے جمگھٹا سا نظر آیا کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ لوگوں کے درمیان وہ اسٹیشن وین بھی دکھائی دے رہی تھی جو اسکول کی ٹیچرز کو لے کر جاتی تھی۔ میں نے گاڑی روکی اور موقع پر پہنچا۔ اس وقت تک اسٹیشن وین کا پٹھان ڈرائیور دو افراد سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے مکے مار کر ڈرائیور کو لہولہان کر دیا۔ دو تین افراد بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ ان میں' میں بھی شامل تھا۔ اسی دوران میں اوباش نوجوانوں کا ایک ہٹا کٹا ساتھی مزید پہنچ گیا۔ وہ کرولا گاڑی میں سوار تھا۔ یہ تینوں افراد ڈرائیور کو غلیظ گالیاں دینے

لگے' وہ سخت مشتعل تھے ان کی کوشش تھی کہ ڈرائیور کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیں اور لے جائیں۔ ان کا ارادہ بھانپ کر میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ وہ پہلے تو مجھے بیچ میں سے ہٹاتے رہے پھر ان میں سے ایک گرج کر بولا۔ "پیچھے ہٹ جا۔ ورنہ تیرے بھی ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ایک شخص نے مجھے مکہ رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو وہ ڈرائیور کو اپنی کار کی طرف کھینچنے لگے۔ میرا دماغ بھنا گیا میں ان جیسے چار چھ غنڈوں کو باآسانی ناکوں چنے چبوا سکتا تھا مگر پتہ نہیں کیا بات تھی' پانچ سال پہلے پیش آنے والے سانحے کے بعد میرا دل کسی پر ہاتھ اٹھانے کو چاہتا ہی نہیں تھا۔ اگر کبھی کوئی ایسا موقع آیا بھی تھا تو مجھے یہی لگا تھا کہ میرے سامنے حافظ عبدالواحد کھڑا ہے' وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں جان کنی کا کرب ہے۔

مکہ کھانے کے بعد بھی میں نے دفاعی انداز ہی اختیار کئے رکھا اور ڈرائیور کو اوباش نوجوان سے چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے اپنے راستے میں حائل دیکھ کر نوجوان بھنا گئے اور پوری شدت سے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میری قمیض پھٹ گئی۔ منہ سے خون نکل آیا مگر میں نے ڈرائیور کو ان کے حوالے نہیں کیا۔ قریباً دو منٹ اسی شدید کشمکش میں گزرے' پھر اچانک تینوں نوجوان اپنی گاڑی میں بیٹھے اور وہاں سے رفوچکر ہو گئے۔ دراصل انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہجوم بڑھتا جا رہا ہے اور کسی بھی وقت یہ ہجوم ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے..........

نوجوانوں کے رفوچکر ہونے کے بعد اسکول کی ٹیچرز بھی اسٹیشن وین سے باہر نکل آئیں معلوم ہوا کہ اس جھگڑے کا تعلق آرزو سے تھا۔ یہ نوجوان کئی ہفتوں سے گاہے گاہے آرزو کا پیچھا کر رہے تھے۔ چند روز پہلے بھی اس بات پر پٹھان ڈرائیور دوست محمد سے ان نوجوانوں کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ دوست محمد نے ایک لڑکے کو تھپڑ بھی جڑ دیا تھا۔ یقیناً اس واقعے سے مشتعل ہونے کے بعد نوجوانوں سے آج دوست محمد کو بری طرح زدو کوب کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر میں ان کی بھرپور مزاحمت نہ کرتا تو وہ اسے اٹھا کر لے جاتے۔

میری نظر آرزو پر پڑی' وہ ڈری سہمی ہوئی سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس

اسٹیشن ویگن میں وائس ہیڈ مسٹرس بھی موجود تھیں' وہ آگے آئیں اور انہوں نے بڑے خلوص سے میرا شکریہ ادا کیا۔ زخمی ڈرائیور دوست محمد کو مرہم پٹی کے لئے ایک قریبی کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ اس دوران میں ایک ٹیچر نے پی سی او سے اسکول فون کردیا تھا۔ اسکول کی گاڑی میں انتظامیہ کے افراد پہنچ گئے اور انہوں نے اس سارے معاملے کو سنبھال لیا۔

اس شام یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ نقاب پوش آرزو کی والدہ محترمہ ہمارے گھر کے لان میں میری بھابی اور والدہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر والدہ نے آواز دی اور اپنے پاس بلالیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ بھابی نے آرزو کی والدہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "جلال! یہ رومی کی ٹیچر کی والدہ ہیں۔ رومی نے پرسوں ہی مجھے بتایا تھا کہ یہ ہماری ہی گلی کے آٹھ نمبر مکان میں رہتے ہیں۔"

"السلام علیکم آنٹی" میں نے کہا۔

انہوں نے باقاعدہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے پیار دینا چاہ رہی تھیں۔ میں نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔ "بیٹا' اس دور میں سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ بُرے لوگ آپس میں ملے ہوئے ہیں اور اچھے لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔ کسی کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہو' کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ ہم اپنے اپنے حال میں مست ہیں.........."

انہوں نے بازو تھام کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ میرے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرے پر بھی ایک دو چوٹیں آئی تھیں۔ وہ میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولیں۔ "آرزو نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ تم تو ان لڑکیوں کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آگئے' ورنہ وہ غنڈے پتہ نہیں کیا کرتے۔ اور کچھ نہ بھی ہوتا تو ڈرائیور کو تو انہوں نے گاڑی میں ڈال کر لے ہی جانا تھا۔"

میں نے کہا۔ "بس آنٹی' جب اللہ تعالیٰ نے مدد کرنی ہوتو کوئی نہ کوئی سبب بھی لگ ہی جاتا ہے۔ میں رومی کو اسکول سے لے کر آرہا تھا اتفاقاً میری نظر اسٹیشن ویگن پر پڑ گئی۔"

وہ بدستور گلوگیر آواز میں بولیں۔ "بیٹا! میں نے تو فیصلہ کرلیا تھا کہ آرزو کو نہیں بھیجوں گی اسکول۔ چار پانچ ہزار کے لئے بچی کی جان کو تو مصیبت میں نہیں ڈالنا' لیکن پھر

ڈائریکٹر صاحب کا فون آگیا۔ کہنے لگے ہم نے ان غنڈوں کے خلاف رپورٹ درج کرا دی ہے۔ ان کا ٹھیک ٹھاک سدباب ہوگا۔ ہم آپ کو بچی کی حفاظت کی پوری گارنٹی دیتے ہیں۔ میں نے کہا' اچھا ہم سوچ کر بتائیں گے۔"

..........اس واقعے کے بعد دونوں گھروں کی خواتین میں تعلق سا قائم ہوگیا۔ کبھی والدہ یا بھابی ان کی طرف چلی جاتیں' کبھی کبھار آرزو کی والدہ ہمارے ہاں آجاتیں۔ اس آمدورفت کے سبب ان لوگوں کے بارے میں چند اور باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ حیدر آباد سے شفٹ کرکے یہاں پہنچے تھے۔ آرزو نے ایم ایس سی کے علاوہ انگلش میں بھی ماسٹر کی ڈگری لے رکھی تھی۔ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی کہیں منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں ان لوگوں کے بہت کم عزیز رشتے دار تھے۔ کچھ انڈیا میں مقیم تھے باقی یورپ وغیرہ میں سیٹل تھے۔ آرزو کے والد انور صاحب ایم بی اے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے ایک دوست کی فرم میں کام کرتے تھے' اس فرم میں ان کا کچھ شیئر بھی تھا۔ آرزو کی والدہ کے بقول اسی نئی جاب کی وجہ سے ان لوگوں کو حیدر آباد سے لاہور آنا پڑا تھا۔

آرزو کی والدہ کا نام تابندہ تھا۔ آنٹی تابندہ جوانی میں یقیناً بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔ وہ جتنی خوبصورت تھیں اتنی ہی کم گو اور کم آمیز بھی تھیں۔ پورے محلے میں واحد گھر ہمارا تھا جہاں انہوں نے کبھی کبھار آنا جانا شروع کیا تھا۔ بہرحال ان ملاقاتوں میں بھی وہ زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کرتی تھیں۔ بات کرتے کرتے ایک پُراسرار سی خاموشی انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتی تھی۔ وہ اپنے مخاطب سے ایکدم کہیں بہت دور چلی جاتی تھیں۔ ان کی گردن پر بائیں شانے کے نزدیک ایک پرانے زخم کا نشان تھا۔ ایک دن میری نگاہ اتفاقاً ہی اس نشان پر پڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی جانور کے پنجے سے بنا ہوا کھرونچا ہے۔ بہرطور آنٹی تابندہ کا کہنا تھا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہی تھیں' ایک تانگے سے ان کی ٹکر ہوئی تھی اور یہ زخم آیا تھا۔ آنٹی تابندہ صرف مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اگر بھائی جان یا والد صاحب گھر میں داخل ہوتے تو وہ فوراً اپنی چادر کو گھونگھٹ کی سی شکل دے لیتی تھیں۔ بازار میں بھی ہم نے انہیں کبھی کھلے منہ نہیں دیکھا تھا۔ آنٹی تابندہ کے ساتھ آرزو صرف ایک مرتبہ ہمارے گھر آئی

تھی۔ میری بدقسمتی کہ میں اس وقت گھر موجود نہیں تھا۔ اپنے دوست شاہ زیب کے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے اس وقت کو سینکڑوں ہی مرتبہ کوسا تھا جب میں نے شاہ زیب کے گھر جانے کے لئے اپنے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔

ایک روز میں کمرے کی کھڑکی کھولے ڈیک پر گانے سن رہا تھا کہ بھابی سمن نے مجھے گھیرلیا۔ میرے سر پر بیڈمنٹن کے ریکٹ سے ضرب لگاتے ہوئے بولیں۔ ”میں بھی کہوں کہ چاچو صاحب کو اپنی بھتیجی سے ایک دم اتنی الفت کیوں ہوگئی ہے‘ کیوں ان کی پڑھائی کی فکر سر پر چڑھی ہوئی ہے اور کیوں اسے بنفس نفیس اسکول سے لایا اور لے جایا جارہا ہے.........؟“

”اگر آپ کو پتہ چل ہی گیا ہے تو پلیز اب ایک اچھی بھابی ہونے کا ثبوت دیجئے۔ بالکل ویسی ہی بھابی جیسی انڈین فلموں میں ہوتی ہے۔“

”میں انڈین فلموں کی نہیں پاکستانی اصلاحی فلموں کی بھابی بننا پسند کروں گی۔“ بھابی نے گردن تان کر کہا۔ ”میں آج ہی رومی کو اس اسکول سے اٹھوا رہی ہوں اور تمہارے کمرے کی اس کھڑکی میں بھی میخیں لگوا رہی ہوں۔“

”کھڑکی بند ہوگئی تو میں تو حبس سے مرجاؤں گا بھابی۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ دوسری منزل میں کتنی گرمی ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی بند نہیں کرواتی لیکن رومی کو تو میں نے اسکول سے ضرور اٹھوالینا ہے۔“ بھابی نے خم ٹھونک کر کہا۔

میں نے گھٹنے پکڑے‘ پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”خدا کے لئے بھابی یہ ظلم نہ کرنا‘ رومی کی پڑھائی کا بیڑہ غرق ہوجائے گا۔ اس بے چاری کا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ آپ جانتی نہیں ہیں۔ اسکول بدلنے سے بچے کی پراگرس پر کتنا اثر پڑتا ہے۔“

”اسکول نہ بدلنے سے بھی بعض ”بچوں“ کی پراگرس پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ ان کا سوا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ ان کے بارے میں جو کچھ سوچا گیا ہوتا ہے وہ سب الٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔“

”میرا کیا الٹ پلٹ ہوا ہے۔“ الٹ پلٹ تو ان کا ہوتا ہے جس کا کچھ سیدھا ہو میرا کیا سیدھا ہے۔ شاید آپ میرے رشتے کی طرف اشارہ کررہی ہیں‘ لیکن اس بارے میں تو

ابھی کچھ بھی طے نہیں ہوا ہے۔“

”یہ تمہارے کہنے کی بات ہے جلال۔ امی سے پوچھو.......... ابو سے پوچھو۔ وہ تو پورا پورا ذہن بنائے بیٹھے ہیں۔ پرسوں بھی افشاں کے گھر والوں سے فون پر لمبی بات کر رہے تھے اور یہ بات یقیناً تمہارے بارے میں ہی تھی۔“

”آپ کو تو ہر بات میرے بارے میں ہی نظر آتی ہے۔“

”کچھ بھی ہے جلال‘ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تم ٹھیک راستے پر جارہے ہو۔“ بھابی قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

انہوں نے شفقت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”جلال! بے شک آرزو بہت خوبصورت ہے۔ ہزاروں میں بلکہ شاید لاکھوں میں ایک ہے‘ لیکن..........“

”لیکن کیا؟“

”بس پتہ نہیں کیا بات ہے۔ وہ لوگ کچھ اپنے اپنے سے نہیں لگتے۔ کوئی دوری سی کوئی فاصلہ سا ہے ان کے اور ہمارے درمیان.......... بڑے اچھے لوگ ہیں‘ پڑھے لکھے ہیں‘ شائستہ ہیں‘ مگر الگ تھلگ ہیں۔ اپنے اندر سمٹے سمٹائے ہوئے۔ اپنے بارے میں کم بتاتے ہوئے اور زیادہ چھپاتے ہوئے۔“

”بھابی! اکثر لوگ کم آمیز ہوتے ہیں لیکن اسے خامی تو قرار نہیں دیا جاسکتا اور ابھی ہمیں ان لوگوں سے متعارف ہوئے وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ بے تکلفی بھی آجائے گی۔“

”تم سے بحث کرنا بے کار ہے۔“ بھابی نے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

میں نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لئے ایک لمبی آہ بھری۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر سر کے پچھلے حصے کو سہارا دیا اور صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”بھابی! کہاں سے لائی ہے وہ اتنا حسن.......... اور پھر حسن کے ساتھ ذہانت بھی۔ میں تو چکرا گیا ہوں۔“

”زیادہ خوبصورتی بھی تو خطرناک ہوتی ہے۔“

”بھابی! اگر آپ ہمارے لئے خطرناک ثابت نہیں ہوئیں تو پھر وہ بھی نہیں

ہو گی۔" میں نے بالواسطہ بھابی کی تعریف کی۔

انہوں نے پھر سے ریکٹ اٹھالیا۔ "شرارت کرو گے تو سر توڑ دوں گی۔"

ایک روز میں رومی کو اسکول سے لے کر نکلا تو کچھ فاصلے پر آرزو پیدل جاتی نظر آئی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اسے "لفٹ" کے لئے کہوں۔ مگر یہ بھی ڈر تھا کہ وہ انکار نہ کردے۔ اگر وہ انکار کردیتی تو کیا ہوتا۔ پھر فوراً ذہن میں چند ہفتے پہلے والا واقعہ آگیا۔ کچھ اوباش نوجوان آرزو کو مسلسل زچ کرتے رہے تھے۔ یہ ایک بڑا معقول جواز تھا کہ وہ ایسے مزید واقعے سے بچنے کے لئے یوں سڑک پر پیدل مارچ نہ کرے۔ میں نے اپنے اندر دانائی اور عقلمندی کی لہر سی محسوس کی۔ گاڑی آرزو کے قریب جاکر روکی اور رومی سے کہا کہ وہ ٹیچر کو ساتھ چلنے کی پیش کش کرے۔ رومی نے کھڑکی سے سر نکال کر توتلی زبان میں کہا۔ "ٹیچل ہمارے ساتھ آجائیں۔ بالش (بارش) بھی آنے والی ہے۔" حالانکہ ایک چھوٹی بدلی کے سوا دور دور تک بارش کے آثار نہیں تھے۔

آرزو یقیناً نقاب کے پیچھے مسکرائی تھی۔ اس نے کہا۔ "شکریہ رومی۔ میں وہاں اسٹاپ سے رکشا لے لیتی ہوں۔ دراصل وین آج آئی نہیں ہے۔"

"یہ رش آور ہے۔ اس وقت رکشا بھی مشکل سے ملے گا' آپ آجائیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بہت شکریہ لیکن۔"

"لیکن کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "آپ کا یوں اکیلے جانا ٹھیک نہیں۔"

میری کوشش کامیاب رہی۔ آرزو کے ذہن میں چند ہفتے پہلے والا وہ ناخوشگوار واقعہ آگیا اور وہ کچھ کمزور سی پڑ گئی۔ رومی نے اپنی توتلی زبان میں پھر درخواست کی تو آرزو جھجکتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ آئی۔

میری رگوں میں ایک عجیب سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی۔ آرزو کے بدن کی مہک ایک خوش رنگ روشنی کی طرح پوری گاڑی میں بھر گئی تھی۔ اس کے قرب کا تصور میرے لئے اتنا نشاط انگیز تھا کہ اسٹیئرنگ وہیل پر میرے ہاتھ بہکنے لگے۔ یہ خیال مجھے

نہال کئے دے رہا تھا کہ اس بند گاڑی میں آرزو کے سانسوں کی مہک میرے سانسوں کے ذریعے سینے میں داخل ہو رہی ہے۔ بے ڈھنگی خاموشی کو توڑنے کے لئے آرزو نے رومی سے کلاس ورک اور ہوم ورک کے بارے میں بات کرنا شروع کردی تھی۔ پتہ نہیں کیوں آرزو کو اپنے ساتھ گاڑی میں پاکر میرے اندر حوصلے کا ایک پہاڑ کھڑا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ جو بات شاید میں ابھی کئی ماہ تک نہ کہہ سکتا وہ مجھے اپنی نوک زبان پر محسوس ہو رہی تھی۔ راستے میں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور پڑتا تھا۔ رومی کبھی کبھار وہاں سے آئس کریم بار لیتی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹور کے عین سامنے آئس کریم والے کے قریب روکی اور رومی سے کہا کہ وہ آئس کریم لے آئے۔ رومی کے نکلنے کے بعد آرزو بے چینی سے پہلو بدلنے لگی تھی۔ میں نے اسے عقب نما آئینے میں دھیان سے دیکھا پھر دل کی بات جیسے خود بخود میری زبان پر آگئی۔ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "آرزو صاحبہ یہاں سڑک کے کنارے اس اسٹور کے سامنے کھڑے ہو کر یہ بات کہنا مجھے کچھ عجیب لگ رہا ہے مگر کسی بھی ماحول میں اس بات کی اہمیت کم نہیں ہوسکتی کیونکہ میں یہ بات اپنے دل کی گہرائی سے کہہ رہا ہوں.......... میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ پچھلے تین ماہ سے سوتے جاگتے میں مسلسل آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

یہ بات کہنے کے بعد ایک پہاڑ سا بوجھ میرے دل و دماغ سے اتر گیا تھا اب میں آرزو کے ردعمل کے لئے تیار تھا۔ یہ ردعمل کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے ملامت کرسکتی تھی' بھڑک کر مجھے بُرا بھلا کہہ سکتی تھی۔ مجھے میرے عامیانہ انداز کی سزا دینے کے لئے دروازہ کھول کر بڑبڑاتی ہوئی گاڑی سے اتر سکتی تھی.......... مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نفی یا اثبات کا اشارہ تک نہیں دیا' بس خاموش اپنی جگہ بیٹھی رہی کسی پتھریلے مجسمے کی طرح ساکت۔ اسی دوران میں رومی بھاگتی ہوئی واپس آگئی.......... قریباً دس منٹ بعد اپنے گھر کے سامنے میری کار سے اترتے ہوئے آرزو نے سپاٹ لہجے میں شکریہ کہا۔ رومی سے ہاتھ ملایا اور شولڈر بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

گھر واپس پہنچ کر میں کئی گھنٹے کمرے میں بند رہا اور سوچتا رہا۔ صورت حال حوصلہ افزا نہیں تھی تو حوصلہ شکن بھی نہیں تھی۔ خاموشی کو نیم رضامندی بھی کہا جاتا ہے۔ میں اس خاموشی کے بارے میں ہزار ہا زاویوں سے سوچتا رہا کبھی دل بلیوں اچھلنے لگتا' کبھی برف

کا ڈھیلا بن کر کسی کنویں کی گہرائی میں اتر جاتا۔ شام ہوئی' میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی اور اس کمرے کی کھڑکی کھلنے کا انتظار کرتا رہا جہاں سے میں نے پہلی بار اس حسن دلنواز کی صورت دیکھی تھی۔ کھڑکی نہیں کھلی۔ میں چھت پر ٹہلنے کے لئے چلا گیا۔ نگاہیں ہر ہر زاویے سے محبوب کے آستانے کا طواف کرتی رہیں۔ کہیں سے کوئی مثبت اشارہ نہیں ملا۔ کہیں کوئی نگاہ نواز منظر دکھائی نہیں دیا۔ پتہ نہیں کیسے لوگ تھے۔ گھر میں کہاں دبک جاتے تھے۔ اکا دکا روشنی کے علاوہ کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ پھر ہمارا گھر بھی کچھ ایسے زاویے پر تھا کہ ان کے گھر کی چھت اور چند کھڑکیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ میں ایک عذابِ مسلسل میں گرفتار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آرزو نے میرے اظہارِ محبت کو کس انداز سے لیا ہے۔ میں آرزو کے موڈ کا اندازہ لگانے کے لئے رومی سے باتیں کرتا رہتا۔ اس سے پوچھتا کہ اس کی خوبصورت ٹیچر آجکل کیا پڑھا رہی ہے۔ ہنستی مسکراتی ہے یا چپ چاپ رہتی ہے' رومی کو لطیفے وغیرہ سناتی ہے یا نہیں۔ رومی کے جوابات بھی کسی خاص سمت میں روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے۔ ایک دن رومی نے توتلی زبان میں میرا مسئلہ حل کر دیا۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے بتایا کہ ماماں یعنی بھابی نے اس کے ہوم ورک کے بارے میں پوچھنے کے لئے خوبصورت ٹیچر کو فون کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بھابی کے پاس آرزو کے گھر کا فون نمبر موجود تھا.......... تھوڑی سی کوشش کے بعد یہ فون نمبر مجھے مل گیا۔ اب مجھے فون کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کا انتظار تھا۔ یہ انتظار بھی زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ اگلے دن میں سڑک پر چند دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا کہ آنٹی تابندہ چادر میں لپٹی لپٹائی بازار جاتی دکھائی دیں۔ آرزو کا بھائی گڈو چھت پر تھا اور پتنگ اڑا رہا تھا۔ نوکر خیرو نے اس کی چرخی پکڑ رکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میں فون کروں تو نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ آرزو ہی فون اٹھائے گی۔ میں بھاگم بھاگ گھر پہنچا اور دھڑکتے دل سے نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے جو آواز ابھری وہ میری بنجر سماعت کو ہی نہیں جسم کو بھی سیراب کر گئی۔ "ہیلو کون؟"

"پلیز آپ فون بند نہ کریں۔ میں.......... رومی کا چاچو جلال بول رہا ہوں۔"

لائن پر چند لمحے سکتہ طاری رہا۔ پھر میں نے ہمت کر کے کہا۔ "آرزو صاحبہ! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

"ناراض ہوں گی تو کیا کر لوں گی؟" اس نے جواب دیا۔

"پلیز مجھے معاف کر دیں۔ وہ میرے دل کی بات تھی جو بغیر کسی ارادے اور پروگرام کے میری زبان پر آ گئی۔"

آرزو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے حوصلے میں تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ میں نے کہا۔ "آرزو صاحبہ! میں نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ جو بھی آپ کو قریب سے دیکھے گا وہ آپ کو چاہے گا لیکن یہ بات میرے لئے اس لحاظ سے انوکھی تھی کہ میں نے یہ بات پہلے کسی لڑکی سے نہیں کہی۔"

جواب ایک بار پھر خاموشی کی صورت میں تھا۔

"آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

"کچھ باتوں کے جواب نہ ہی دیئے جائیں تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔" اس نے غالباً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

میرے دل و دماغ میں مسرت کے شادیانے بج اٹھے۔ حوصلہ مزید کچھ بڑھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جواب نہ دیں۔ مگر میری بات سن تو لیا کریں۔"

"سن تو رہی ہوں۔"

"آئندہ بھی سنیں گی؟"

"جی نہیں' اتنا کافی ہے۔" اس کے لہجے میں ایک بار پھر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

پھر ایک آہٹ سنائی دی۔ غالباً خیرو یا گڈو میں سے کوئی نیچے آ گیا تھا اور آواز دے رہا تھا۔ "اچھا جی۔ گڈ بائے۔" آرزو نے کہا اور جلدی سے فون بند کر دیا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کروں۔ اونچی آواز میں ڈیک لگاؤں اور ناچنا شروع کر دوں۔ آرزو کے حوصلہ افزاء رویئے کے سبب دل و دماغ میں عجیب سی مستی بھر گئی تھی۔

اس کے بعد فون پر دو تین مرتبہ آرزو سے مختصر مختصر بات ہوئی۔ یہ گفتگو مختصر ہونے کے علاوہ شائستہ بھی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی واشگاف بات کی وجہ سے

آرزو بدک جائے اور فون سننا بند کردے۔ وہ جیسے شیشے کا پیکر تھی اور پتھروں کی بارش میں گھری ہوئی تھی۔ ڈری ڈری، سہمی ہوئی۔ انجانے خدشے اسے گھیرے رہتے تھے۔ کوئی عام سی بات بھی زبان سے نکالتے ہوئے وہ دیر تک سوچتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ پھر کسی دن ویسا ہی حسین اتفاق ہو، آرزو کو اسکول سے لانے والی وین خراب ہوجائے۔ وہ میرے اور رومی کے ساتھ گاڑی میں لفٹ لے اور میں اس کے حسین قرب کے نشے میں سرشار ہوکر اس سے کوئی خوبصورت بات کہہ سکوں۔ مگر اس قسم کا امکان یوں معدوم ہوگیا کہ رومی کی طبیعت خراب ہوگئی، ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ تشخیص کیا اور دو تین ہفتے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ دوسری طرف فون کا سلسلہ بھی منقطع تھا کیونکہ آرزو کا فون خراب تھا۔ میرے دل میں یہ اندیشہ بھی گھر کر رہا تھا کہ کہیں فون جان بوجھ کر تو بند نہیں کردیا گیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ میں بوریت اور اداسی کو کم کرنے کے لئے ورزش میں مصروف ہوگیا تھا۔ میرے جسم پر صرف ایک پتلون تھی۔ میرے سامنے سفید بیگ تھا اور میں جیسے اپنی ساری محرومیوں کا بدلہ اس پر مکے برسا کر لے رہا تھا۔ اچانک دروازے کی کال بیل بجی۔ میں نے شانوں پر تولیہ رکھا اور دروازہ کھولا، سامنے آرزو کی حسین وجمیل آنکھیں نظر آئیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح برقعہ پوش تھی۔ ساتھ میں آنٹی تابندہ بھی تھیں۔ میں نے خود کو بمشکل آرزو کی آنکھوں کے سحر سے آزاد کرکے آنٹی کو آداب پیش کیا اور اندر آنے کے لئے انہیں راستہ دیا۔ وہ رومی کی مزاج پرسی کے لئے آئی تھیں، سیدھی بھابی کے کمرے میں چلی گئیں۔ عورتوں کی باتیں شروع ہوئیں تو لمبی ہوتی چلی گئیں۔ میں کمرے کے اردگرد ہی منڈلاتا رہا۔ کبھی اندر جاکر آنٹی تابندہ سے ایک دو باتیں کرلیتا کبھی باہر آجاتا۔ آرزو سے بھی براہ راست ایک دو باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کا تعلق رومی کی صحت سے ہی تھا۔ باتوں باتوں میں جب آرزو نے بتایا کہ آنٹی تابندہ فون ٹھیک کرانے کے لئے صبح سے ایکسچینج گئی ہوئی تھیں اور اب فون ٹھیک ہوگیا ہے، تو میرا دل خوشی سے اچھل گیا۔ مجھے یہی لگا کہ آرزو نے یہ بات مجھ سے مخاطب ہوکر کہی ہے اور مجھے بتایا ہے کہ میں اسے پھر سے فون کرسکتا ہوں۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرا جذبہ یک طرفہ نہیں ہے۔ ابھی کچھ نہیں ہوا تھا لیکن ابھی سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی قسمت پر رشک

کروں۔ آرزو جیسی لڑکی کے ساتھ ایک بے نام تعلق کے دھاگے جڑ رہے تھے۔

چائے پیتے پیتے اچانک پیالی آرزو کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ چیخ کر کھڑی ہوگئی۔ نہ صرف کھڑی ہوگئی بلکہ جوتے سمیت صوفے پر چڑھ گئی اور مسلسل چیختی چلی گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہوگیا تھا۔ نقاب سرک گیا تھا اور پورا جسم تھرا رہا تھا۔ آنٹی تابندہ بھی آرزو کو سنبھالنے کی کوشش میں چیخ رہی تھیں۔ آرزو کے دہشت زدہ ہونے کی وجہ رومی کی پالتو بلی تھی، پتہ نہیں وہ اچانک کہاں سے آئی تھی اور پھدک کر آرزو کے پاؤں میں لوٹنے لگی تھی۔ میں نے جلدی سے بلی کو اٹھایا اور کمرے سے باہر پھینک کر دروازہ بند کردیا۔

آرزو کا خوف قدرے کم ہوا۔ وہ صوفے سے اتر آئی لیکن اس کا سینہ مسلسل ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔ وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ پہلے آنٹی تابندہ اور پھر میری والدہ نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی اور بہلاتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ میں اور بھابی سمن حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پالتو بلی سے ڈرنا اور اتنی شدت سے ڈرنا بہت عجیب لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آنٹی تابندہ، آرزو کو لے کر واپس چلی گئیں۔ انہوں نے بتایا، یہ بچپن سے ہی بلی کتے وغیرہ سے بہت ڈرتی ہے۔ کسی وقت تو اتنا ڈرتی ہے کہ دیکھنے والا بھی ڈر جاتا ہے۔ آرزو اب زیر لب مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں میں ابھی بھی آنسو چمک رہے تھے۔ دھوپ چھاؤں کا یہ منظر اتنا دلفریب تھا کہ میں دیکھتا رہ گیا۔

☆=========☆=========☆

آرزو سے ایک بار پھر کبھی کبھی فون پر بات ہونے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب وہ بھی میرے فون کا انتظار کرتی ہے۔ مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کرنا اسے بھی اچھا لگتا تھا' تاہم وہ اس تعلق کو صرف اور صرف دوستی کی حد تک رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی قسم کا تعلق بمشکل ہی برقرار رہ سکتا ہے' یا تو وہ بڑھتے بڑھتے پیار بن جاتا ہے یا گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتا ہے' لیکن وہ مصر رہی۔ کہنے لگی کہ ہم اس مقولے کو غلط ثابت کرکے دکھا دیں گے۔ ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔ اب چونکہ بے تکلفی میں کچھ اضافہ ہوگیا تھا اس لئے میں اسے بلی والے واقعے کے حوالے سے کسی وقت چھیڑ بھی دیتا تھا۔ آرزو نے اعتراف کیا تھا کہ وہ بچپن سے ہی اکثر جانوروں سے بے تحاشہ خوف کھاتی ہے اس نے خود ہی بتایا تھا کہ ڈاکٹری زبان میں اس قسم کی کیفیت کو Zoo Fobia کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”کبوتروں' چوزوں' طوطوں وغیرہ سے بھی خوف کھاتی ہیں؟“

”بالکل نہیں۔ کبھی آپ سے ڈری ہوں میں؟“

”یعنی آپ نے مجھے ان پرندوں کی قطار میں شامل کیا ہے؟“

”آپ ایک بات سے چھ چھ معنی نکالتے ہیں' اب جو معنی مرضی نکال لیں۔ ویسے

میرا خیال نہیں کہ آپ ان پرندوں کی قطار میں شامل ہوسکتے ہیں۔ یہ سارے پُرامن اور دابو سے پرندے ہیں۔ جب کہ آپ تو خاصے دبنگ اور سخت جان قسم کے بندے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ جب ان اوباش لڑکوں نے ڈرائیور دوست محمد کو کار میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”اچھا اس معاملے کا کیا بنا؟“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”معاملہ دب گیا ہے۔ اب وہ لوگ صلح کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ڈائریکٹر صاحب اڑے ہوئے ہیں کہ نہیں انہیں سزا دلوا کر رہیں گے۔ دراصل وہ اسکول میں کام کرنے والے ایک کلرک کے ہی یار دوست ہیں۔“ چند لمحے توقف کرکے وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ایک بات پوچھوں' سچ بتائیں گے ناں۔“

”آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے' ہمیشہ سچ ہی بولوں گا۔“

”اس دن لڑائی میں آپ ان غنڈوں کو صرف روکتے رہے۔ انہوں نے آپ کے کپڑے پھاڑے آپ کو مارا بھی........... مگر آپ نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔“

”مارا ماری کوئی اچھی بات ہے؟“

”غلط بات ہے' لیکن کبھی کبھی یہ بندے پر تھوپ دی جاتی ہے۔ میں جو بات کہہ رہی ہوں وہ یہ ہے کہ آپ انہیں مار سکتے تھے پھر بھی آپ نے انہیں مارا نہیں۔“

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں انہیں مار سکتا تھا؟“

”میرا دل کہتا ہے کہ آپ ایسا کر سکتے تھے۔ ویسے بھی رومی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کراٹے شراٹے کھیلتے رہے ہیں اور زبردست قسم کے چیمپئن بھی رہے ہیں۔“

”رومی کی باتوں پر مت جائیں' وہ تو مجھے عالمی چیمپئن بھی ثابت کر سکتی ہے۔ بہرحال تھوڑا بہت مارشل آرٹ میں جانتا ہوں اور مارشل آرٹ ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ مارپیٹ سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے۔“

وہ اچانک تیزی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ مارشل آرٹ آپ کو یہ نہیں بتاتا کہ بہت لمبی فون کال سے گریز کرنا چاہئے۔ جناب پورا آدھ گھنٹہ ہوگیا ہے ہمیں کال کال کرتے ہوئے۔ شاید امی بھی آرہی ہیں۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔“ اس نے آخری

الفاظ ذرا شوخی سے کہے اور فون بند کردیا۔

اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ساتھ ہمارا تعلق پروان چڑھتا رہا۔ آ اس تعلق کو دوستی تک محدود رکھنے پر بضد تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ ٹوٹ پھوٹ اس اندر بھی ہو رہی ہے۔ میرے سینے میں بھڑکنے والی آگ کی چنگاریاں مسلسل اس کے میں بھی گر رہی تھیں اور وہ خود کو کسی نادیدہ شعلے کی لپیٹ میں محسوس کر رہی تھی لا اس کا رویہ اٹل تھا اور وہ اپنے ارادوں میں ثابت قدم تھی۔

دوسری طرف میرے رویے میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ مثال یہ بھی صادق آئی تھی کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے' میرا اہل خانہ نے میرے اطوار سے ہوا کہ رخ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس رخ کو دیکھ کر والدہ صاحب نے زور و سے کہنا شروع کردیا تھا کہ افشاں کے ساتھ اب میری منگنی ہوجانی چاہیے' لیکن پھر روز بعد انہوں نے چپ سادھ لی تھی اور خود ہی اس معاملے کو ٹھنڈا کردیا تھا۔ دراص میں نے اپنی ہمراز بھابی کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ فی الحال میرے ر کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی جائے۔ بعد میں' میں نے ابو سے خود بھی سلسلے میں تھوڑی سی بات کرلی تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ آرزو کے بغیر میری زندگی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر مستقبل کے خاکے کو آرزو سے جدا کرکے دیکھتا تھا تو ایک دھوئیں سے بھرے ہوئے کے سوا مجھے کچھ بھی......... کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دسمبر کی ان خوبصورت شامو ذکر تھا جب عید الفطر کی آمد آمد تھی۔ عید کی آمد کا ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے اور کبھی ک یہ حسن عید سے بھی زیادہ اچھا لگتا تھا' جوش اور خوشی کی ایک لہر سی قریہ قریہ کوچہ کو دوڑتی نظر آتی ہے۔ یہ عید سے تین چار دن پہلے کی بات ہے۔ میں تھوڑی سی شاپنگ کرنے کے لئے شاہراہ قائداعظم پر گیا۔ افطاری میں نے شاپنگ کے دوران میں ہی کی اور اب نئی مارکیٹ کے قریب گھوم رہا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ آرزو پر پڑی۔ وہ حسب معمول سر تا پا پردہ پوش تھی' ایک حسن بلاخیز جو پردے کی اوٹ میں پوشیدہ تھا۔ آر کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ یقیناً وہ اس کی کوئی بے تکلف سہیلی تھی۔ اس۔ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ .... مجھے دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئیں اور پھر مسکرانے لگیں

دونوں نے آپس میں ایک آدھ سرگوشی بھی کی' میرے لئے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ آرزو کی یہ سہیلی میرے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔ رسمی کلمات ادا کئے گئے۔ وہ دونوں بھی شاپنگ کے لئے آئی تھیں۔ قریب ہی ایک بڑا اچھا اور پُرسکون ریستوران تھا۔ میں نے آرزو سے کہا کہ چند منٹ وہاں بیٹھتے ہیں' جوس وغیرہ پی لیتے ہیں۔ شاپنگ کی تھکاوٹ دور ہوجائے گی۔

آرزو کی دوست کی آنکھوں میں شوخی نظر آنے لگی۔ اس کے علاوہ وہ نیم رضامند بھی نظر آرہی تھی' مگر آرزو نے صاف انکار کردیا۔ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ "اُف گاڈ! سات بج گئے ہیں۔ نہیں جلال۔ مزید دیر ہوئی تو گھر سے پٹائی ہوجائے گی۔"

میں نے آرزو کی دوست جس کا نام انیلا تھا سے کہا۔ "آپ ہی سفارش کیجئے۔"

اس سے پہلے کہ انیلا کچھ کہتی آرزو تیزی سے بولی۔ "پلیز جلال ہمیں جانے دیجئے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"اچھا چند منٹ بیٹھ کر ایک کولڈ ڈرنک ہی لے لیں۔"

"جلال پلیز' اس وقت میں نہیں رک سکتی۔" آرزو کے لہجے میں ہلکی سی رکھائی آگئی تھی۔

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ دونوں خداحافظ کہہ کر آگے نکل گئیں۔

اس شام آرزو کے رویے نے مجھے خاصا مایوس بلکہ دل برداشتہ کیا تھا۔ شاید وہ ابھی تک مجھے ایک اجنبی ہی سمجھتی تھی' جس کے ساتھ گھر سے باہر ملنا اس کے لئے سخت معیوب تھا۔ وہ عید بڑی بیزار گزری۔ میں نے آرزو کو فون کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ عید کے روز وہ ایک دوبار اپنے گھر کی کھڑکی میں نظر آئی۔ شام کے وقت چھت پر بھی چند سیکنڈ کے لئے اس کا رنگین آنچل لہرایا لیکن میں اپنے تاریک کمرے میں دبکا بیٹھا رہا۔ ٹرو کے روز دل کچھ اور بھی اداس ہوگیا۔ میں نے ایک گورے چٹے کلین شیو نوجوان کو دیکھا۔ وہ آرزو کے گھر موجود تھا اور گڈو کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ دونوں چھت پر پتنگ بازی کرتے رہے اور کھاتے پیتے رہے۔ یہ نوجوان اس سے پیشتر بھی دو تین مرتبہ آرزو کے گھر نظر آیا تھا' وڈیو شاپ کے سامنے محفل جمانے والے نوجوان میں سے احسان باڈی بلڈر کا خیال تھا کہ یہ نوجوان "نقاب پوش" کا ہونے والا

منگیتر ہے۔ میرے پڑوسی توفیق کا تجزیہ تھا کہ یہ نوجوان چونکہ خوب گورا چٹا ہے اس لیے انھی"
نقاب پوش کا کزن ہے اور حیدرآباد سے نوکری وغیرہ کی تلاش میں لاہور آیا ہوا ہے اگلے روز رومی کو اسکول سے گھر چھوڑنے کے بعد میں سیدھا آرٹس کونسل پہنچ گیا
غرض مختلف قسم کے خیال ظاہر کئے جارہے ہیں۔ ٹرو کے روز شام کے وقت گورے گیلری میں خوش پوش لوگوں کا ہجوم تھا' ہر طرف رنگین آنچل لہرا رہے تھے اور انہی
نوجوان سمیت سارے اہل خانہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے اور رات کو ڈیڑھ بجے کے آنچلوں میں وہ سادہ سا سیاہ برقعہ بھی تھا۔ نمائش واقعی اچھی تھی' آرزو مجھ سے یوں ملی
قریب لوٹے' غالباً فلم وغیرہ دیکھ کر آئے تھے۔ جیسے اتفاقاً ہی اس آرٹ گیلری میں ہماری ملاقات ہوگئی ہو۔ پھر اس نے مجھ سے
عید کے بعد دو ہفتے اسی اداسی کے عالم میں گزر گئے۔ میں نے آرزو کو اپنی صورت درخواست کی کہ اگر میں گھر کی طرف جارہا ہوں تو اسے بھی ڈراپ کردوں۔ میں تو آیا ہی
تک نہیں دکھائی تھی' ایک روز جب امی اور بھابی آنٹی تابندہ کے گھر ملنے گئی ہوئی تھیں اس لئے تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نیم گرم گاڑی میں پہلو بہ پہلو بیٹھے شاہراہ قائداعظم پر
قطعی غیر متوقع طور پر آرزو کا فون آگیا۔ فون پر اس کی آواز سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ رواں تھے۔ قربِ حسن نے جسم پر عجیب سی لرزش طاری کردی تھی۔
دلنشیں آواز میں بولی۔ "لگتا ہے کہ آپ ناراض ہیں۔" "اب کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اگر ہوں بھی تو آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔" "اپنی ضد پوری کرلیجئے۔ اسی ریستوران میں چلتے ہیں۔"
"بہت فرق پڑتا ہے جی' دوست خفا ہوجائے تو فرق کیوں نہیں پڑتا۔ کھانا پینا سب "شکریہ!" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔
"مارشل آرٹ والوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ دوستی میں شکریہ نہیں ہوتا۔" وہ
حرام ہوجاتا ہے۔"
"ہوجاتا ہوگا......... لیکن دوست کے لئے ہوتا ہوگا۔ ہمارے درمیان تو ایسا کوئی مسکرا کر بولی کچھ ہی دیر بعد ہم نہایت پُرسکون اور نیم تاریک ریستوران میں آمنے سامنے
تعلق ہی نہیں ہے۔" بیٹھے تھے اور کافی پی رہے تھے۔ اس ریستوران میں ہمارے درمیان قریباً ایک گھنٹہ گفتگو
"ہے......... بالکل ہے......... اور ہمیشہ رہے گا۔" وہ یقین سے بولی۔ ہوئی۔ اس گفتگو کا موضوع شروع تا آخر وہ تعلق ہی تھا جو پچھلے چند مہینوں میں ہمارے
"نہیں ہے۔" درمیان پروان چڑھا تھا۔ آرزو کے نزدیک یہ تعلق ایک نہایت پاکیزہ اور بے لوث جذبہ
"میں جانتی ہوں' آپ جناب کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے........" اس نے کہا تھا جسے دوستی کہا جاسکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ تعلق پاکیزہ اور پُرخلوص تو ضرور تھا لیکن
.... پھر ذرا توقف سے بولی۔ "کل سہ پہر کو آپ کیا کر رہے ہیں؟" اسے دوستی کہنا اور صرف دوستی سمجھنا اپنے آپ کو دھوکا دینا تھا۔ میں نے آرزو کی
"وہی جو روز کرتا ہوں......... کمرے کی کھڑکی کھول کر بیٹھا رہوں گا اور آپ کے آنکھوں کے اندر کہیں بہت گہرائی میں چاہت کے رنگ اور خواہشوں کے لرزتے چراغ
کمرے کی بند کھڑکی کو دیکھتا رہوں گا۔" دیکھے تھے۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ اپنے
"تو کل آپ ایسا کیجئے کہ اپنے کمرے کی کھڑکی بھی بند رکھئے اور ہوسکے تو دو بجے جذبوں کی کونپلوں کو برداشت اور جبر کے بھاری پتھروں تلے کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔
کے قریب الحمرا آرٹس کونسل آجائیں۔ انیلا کی تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے' ہم سب آرزو کا کہنا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ ہم دونوں
ٹیچرز اسکول ٹائم کے بعد وہاں جارہی ہیں۔ بڑی زبردست نمائش ہے۔" ہمیشہ ایک دوسرے کے غمگسار دوست اور اچھے ساتھی رہیں۔
"لیکن........." مجھے توقع نہیں تھی کہ آرزو کا رویہ اتنا بے لچک اور اس کے ارادے ایسے اٹل
"لیکن کے بعد بہانے بازی شروع ہوتی ہے۔ یہ بات آپ ہی نے تو ایک دفعہ کہی ہوں گے۔ اس کی تکرار مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی......... میری سمجھ میں کچھ

نہیں آرہا تھا.......... وہ عجیب لڑکی تھی اور گزرنے والے وقت کے ساتھ زیادہ عجیب لگنے لگی تھی.......... میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ کے گھر 125 ہنڈا پر جو ہینڈسم سے صاحب آتے ہیں وہ کون ہیں؟"

وہ بولی۔ "ابو کے پارٹنر حاجی بشیر صاحب کے بھتیجے ہیں۔ ان کا نام نجیب ہے۔ بنک میں کام کرتے ہیں۔ دراصل ابو.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"رک کیوں گئی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ دوستوں سے بات کرتے ہوئے رکتے نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایک زرد رنگ سا لہرا گیا۔ اس نے شاید آہ کھینچی تھی کیونکہ اس کے ہونٹوں پر سے نقاب کے اندر گڑھا سا پڑ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "غالباً ابو نجیب سے میرے رشتے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

میرے اندر چھناکے سے کوئی شے ٹوٹ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا "ابو صرف سوچ رہے ہیں یا رشتے کی تیاری کر رہے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ لڑکیوں کو ایسی باتیں تفصیل سے کہاں بتائی جاتی ہیں۔"

"ہاں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی جاتی ہے۔ ورکنگ وومن بنایا جاتا ہے، لیکن ایسی باتیں نہیں بتائی جاتیں۔"

"طنز کر رہے ہیں؟"

"نہیں۔ ویسے ہی ذرا علامہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

بوجھل دل اور بوجھل ترین قدموں کے ساتھ میں آرزو کے ہمراہ ریستوران سے باہر نکل آیا۔ دنیا ایک دم ہی ویران ویران نظر آنے لگی تھی۔ ہم نے گاڑی ریستوران کے عقب میں ایک ذیلی سڑک پر پارک کی تھی۔ ہم ایک خوانچہ فروش کے قریب سے گزر کر گاڑی کی سمت جا رہے تھے، اچانک آرزو کی نگاہ کسی شے پر پڑی اور وہ بری طرح بدک گئی۔ اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہماری گاڑی سے کچھ فاصلے پر کالے رنگ کا ایک کتا بیٹھا تھا۔ یہ کوئی آوارہ کتا تھا۔ خاصا موٹا تازہ تھا لیکن ذرا سست دکھائی دے رہا تھا۔ آرزو نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ "پلیز جلال۔ گاڑی ادھر

آئیے۔"

"افوہ بھئی کیا ہوگیا ہے۔ کتا دور بیٹھا ہے، کچھ نہیں کہے گا آپ کو۔"

"آ.......... آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ پلیز گاڑی ادھر لے آئیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ سرتاپا کانپنے لگی تھی۔

مجھے لگا کہ اگر میں نے آرزو کی بات نہیں مانی تو یہیں سڑک پر ہمارا تماشا بن جائے گا۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور اسے ریورس کرکے آرزو کے پاس لے آیا۔ وہ خوانچہ فروش کے چبوترے پر چڑھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ آس پاس کے لوگ حیرت سے اس دہشت زدہ برقعہ پوش کو دیکھ رہے تھے۔ میں اور آرزو گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں نے گھوم کر ایک بار پھر سیاہ کتے کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کی گردن کے پاس دو چھوٹے چھوٹے سفید دھبے تھے۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور سنسنی کی لہر بدن میں دور تک پھیل گئی۔ اس کتے کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا اور ایک دفعہ نہیں کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو یاد آگیا یہ کتا ہمارے گھر سے تھوڑی دور آگے چوک میں بیٹھا نظر آتا تھا۔ کبھی قصائی کی دکان کے سامنے، کبھی دودھ فروش کے پھٹے کے نیچے، کبھی یونہی اِدھر اُدھر منڈلاتا پایا جاتا تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ کتا تو شاید ہمارے محلے میں بھی پھرتا نظر آتا ہے۔"

"پپ.......... پتہ نہیں.......... مجھے نہیں پتہ۔" آرزو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

وہ اتنی پریشان تھی کہ کچھ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آرزو عام لڑکی ہونے کے باوجود عام نہیں ہے۔ اس کی ذات کے پیچھے کوئی گہرا چکر ہے کوئی پُراسراریت ہے جس نے آرزو کو اس کے اہل خانہ سمیت گھیرے میں لے رکھا ہے۔ وہ چکر کیا ہو سکتا ہے..........؟" کیا آرزو میرے ساتھ سرد مہری کا جو برتاؤ کر رہی ہے اس کا تعلق بھی اس چکر سے ہے؟ نجیب نامی وہ نوجوان جو آرزو کے گھر آرہا ہے کیا وہ بھی اسی معمے کا ایک ٹکڑا ہے؟ یہ سوال اور اس قسم کے اور بہت سے سوال آندھی کی رفتار سے میرے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ میں نے آرزو کو اس کے گھر سے کافی فاصلے پر اتار دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے گاڑی یونہی سڑکوں پر اِدھر

اُدھر گھمانی شروع کردی۔

اگلے روز اتوار تھا۔ کوئی کام بھی نہیں تھا۔ میں نے ورزش بھی نہیں کی۔ ایک دو دوستوں کے فون آئے، میں نے انہیں بھی ٹال دیا۔ آرزو کے غیر متوقع رویے نے مجھے سخت مایوس کیا تھا۔ وہ کچھ بھی کھل کر نہیں بتا رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے ذہن میں ایک دم ایک خیال آیا اور میں قمیض پتلون پہن کر باہر نکل آیا۔ شام ہونے والی تھی میں ٹہلتا ہوا چوک کی طرف آگیا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، جسم میں کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ وہی کالا کتا چوک میں موجود تھا اور منظور کول کارنر کے قریب کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا رخ......... آرزو کے گھر کی طرف ہی تھا۔ میں نے بڑے دھیان سے دیکھا، یہ وہی کتا تھا جسے کل دیکھ کر آرزو بے طرح خوفزدہ ہوئی تھی۔ گردن پر وہی دو سفید دھبے موجود تھے میں کتے کو پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کر رہا تھا۔ یہ جانور چار پانچ میل کا سفر کرکے شاہراہ قائداعظم پر اس ریستوران کے عقب میں کیسے پہنچا؟ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا یا اس کے پیچھے کوئی نامعلوم وجہ تھی.........؟ میں گھر آکر بھی اس بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔

اگلے روز بھی اسکول سے چھٹی تھی لہٰذا میری بوریت میں کچھ اور اضافہ ہوگا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے کہیں نکل جاؤں۔

منگل کے روز دوپہر کو رومی کو اسکول سے لینے پہنچا۔ ابھی چھٹی میں کچھ دیر تھی۔ میں سیٹ پر نیم دراز ہو کر میوزک سننے لگا۔ خالی خالی نظروں سے اردگرد بھی دیکھ رہا تھا اچانک مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔ سیاہ رنگ کا بھدا سا کتا یہاں بھی موجود تھا۔ وہ پاپولر کے ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں پر کوئی زخم تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی سے باہر آگیا۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نامعلوم وجہ سے یہ کتا آرزو کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے شک گزرا کہ اس کتے کو میں اس سے پہلے بھی اسکول کے آس پاس دیکھ چکا ہوں۔ یہ معاملہ پُراسرار ہوتا چلا جارہا تھا......... آرزو کی والدہ آنٹی تابندہ کی گردن پر ایک زخم کا نشان تھا اور یہ نشان کسی جانور کے پنجے سے مشابہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے آنٹی تابندہ اور آرزو ہمارے گھر آئی تھیں اور آرزو رومی کی پالتو بلی سے بے تحاشا خوفزدہ ہوگئی تھی۔

رومی یہ بھی بتاتی تھی کہ اس کی خوبصورت ٹیچر چھپکلی یا مینڈک وغیرہ کو دیکھ لیں تو بہت ڈر جاتی ہیں۔ اب یہ کتے کا چکر سامنے آگیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا کتے کے قریب پہنچا۔ مجھے بالکل پاس دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ فاصلے پر جاکر رک گیا۔ میں نے نیچے جھک کر پتھر اٹھایا تو اس نے اپنی گرد آلود دم اندر کی طرف دبائی اور مزید دور چلا گیا۔ اس کا رویہ بالکل عام آوارہ کتوں جیسا تھا۔ انداز میں سستی اور کاہلی نظر آتی تھی، تاہم اس کی گہری نسواری آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب سا خوف ذہن میں ابھرتا تھا۔ پتہ نہیں یہ کوئی نفسیاتی کیفیت تھی یا واقعی کتے کی آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی میں نے کتے کو بھگایا تو وہ بھاگ گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے اس خیال سے اسے ہٹایا تھا کہ کہیں چھٹی کے وقت آرزو اسے دیکھ کر خوفزدہ نہ ہو جائے۔ لیکن چھٹی کے وقت مجھے رومی کی زبانی پتہ چلا کہ خوبصورت ٹیچر تو آج اسکول آئی ہی نہیں تھیں۔

آرزو اگلے دن بھی اسکول نہیں آئی۔ اس سے اگلے دن بھی نہیں آئی۔ میں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہر مرتبہ آنٹی تابندہ نے فون اٹھایا یا خیرو وغیرہ نے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے بھابی کو ان کے گھر بھیجا۔ بھابی کچھ چپ چپ سی واپس آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ آرزو نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"پتہ نہیں، گھر والوں کی مرضی ہوگی۔ ویسے بھی........." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

"آپ کچھ چھپا رہی ہیں بھابی۔"

"نہیں چھپا تو نہیں رہی۔ بس مجھے شک سا پڑ رہا ہے کہ آنٹی تابندہ اس کی شادی کا سوچ رہی ہیں۔"

"شک......... کوئی بات کہی تھی انہوں نے؟"

"نہیں، کہا تو کچھ نہیں لیکن تمہیں پتہ ہی ہے کہ ہم عورتوں کو بغیر کچھ کہے سنے بھی تھوڑا بہت پتہ چل جاتا ہے۔"

میرے دل پر جیسے کوئی کند چھری سے چرکے لگا رہا تھا، آنکھوں کے سامنے ہر شے

گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرے بدترین اندیشے حقیقت کے قالب میں ڈھلنے لگے تھے۔ میں خود کو سنبھالتا ہوا بمشکل اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر گر گیا۔

☆==========☆==========☆

ایک دو ہفتوں کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ واقعی آرزو کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایک روز میں نے انوار صاحب اور آنٹی تابندہ کو ایک قریبی جیولر کی دکان پر دیکھا' پھر ایک روز لوڈر میں کچھ فرنیچر ٹائپ کا سامان بھی گھر میں پہنچا۔ میرا دل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سینے میں بکھر رہا تھا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میرا اور آرزو کا یہ خوش رنگ تعلق اتنی جلدی اپنے انجام کی طرف بڑھنے لگے گا۔ بقول شاعر۔ محبتوں کی راہ میں کہاں پہ شام ہو گئی......... ابھی تو شوق تیز تھا قدم بھی تھے اٹھے اٹھے۔

میری زندگی مجھ سے جدا ہو رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا' اور یہ کوئی عارضی جدائی نہیں تھی جس کے بعد وصال کے نشاط انگیز لمحوں کی آس ہوتی ہے۔ یہ دائمی جدائی تھی۔

میرا ذہن ہزار ہا سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ وہ پُراسرا حالات بھی بار بار ذہن کو کچوکے لگاتے تھے جو پچھلے کچھ عرصے میں میرے نوٹس میں آئے تھے۔ میں نے کبھی غیر حقیقی اور مافوق الفطرت باتوں پر یقین نہیں کیا۔ میں زندگی کے ٹھوس اور سائنسی پہلوؤں پر ہی زیادہ یقین رکھتا تھا۔ میں نے نفسیات پڑھی تھی اور اس حوالے سے دیگر علوم کو بھی جانچا تھا' لیکن ان سارے علوم میں بھی میرے دلچسپی صرف انہی پہلوؤں میں تھی جن کو سائنسی بنیاد پر پرکھا جاسکتا ہے......... اس کتے کا معاملہ یقیناً پُراسرار تھا جو ہمہ وقت آرزو کے آس پاس منڈلاتا تھا لیکن میں اس معاملے کو بھی عقل اور ادراک کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کتا کسی وجہ سے آرزو سے مانوس ہو گیا ہو کوئی رنگ کوئی خوشبو یا کوئی لمس اس کی جبلت کو تحریک دے گیا ہو۔ جہاں تک آرزو کی اس کیفیت کا تعلق تھا کہ وہ جانوروں سے ڈرتی تھی تو یہ کیفیت تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ نفسیات میں اسے فوبیا کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔ اسے زو فوبیا کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے......... پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ آرزو کیوں کسی نامعلوم خوف کا شکار تھی......... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ نامعلوم خوف ہی میری اور اس کی جدائی کا سبب بن رہا ہو۔

ایک دن جب میں لاحاصل انتظار اور مسلسل غم کے چابک سہہ سہہ کر ہلکان ہو چکا

تھا میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ بند کمرے میں اپنے ہی شعلوں کے اندر رقص بسمل کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں آنٹی تابندہ سے ملوں گا۔ مجھے ان کی صورت میں ایک مہربان اور نرم دل ہستی کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایسی آنکھیں تھیں جو خود غمزدہ تھیں اور دوسروں کے غم کو محسوس بھی کر سکتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بیٹا کہہ کر پکارا تھا' میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ایک بیٹے کے دل کی سچائی اور اس کے درد کو محسوس کریں گے۔

سہ پہر کا وقت تھا' میں نے آنٹی تابندہ کو فون کیا اور ان سے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ خوش دلی سے بولیں۔ "بیٹا! آپ کا اپنا گھر ہے۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب جب چاہے چلے آؤ......... بلکہ سمن اور رومی کو بھی لے آؤ۔"

"نہیں' میں اکیلا ہی آنا چاہتا ہوں۔"

"تو آجاؤ نا بیٹا۔"

آدھ پون گھنٹے بعد میں آرزو کے گھر ڈرائنگ روم میں آنٹی تابندہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ خیرو ہمارے سامنے چائے وغیرہ رکھ رہا تھا' ابھی آنٹی نے مجھے بتایا کہ آرزو کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا' گولی کھا کر ابھی سوئی ہے۔

خیرو چائے رکھ کر چلا گیا تو آنٹی نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور بولیں۔ "جلال بیٹا! تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں تم ٹھیک تو ہو۔"

"ٹھیک ہوں آنٹی' شاید زیادہ سونے سے سوج گئی ہیں۔"

"نہیں بھئی! یہ تو کم سونے والی سوجن لگتی ہے۔" پھر خود ہی ہنس کر بولیں۔ "کہو خیریت تو ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "آنٹی! میں آپ کے گھریلو معاملے میں مداخلت کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گی۔"

"کہو کہو بیٹا۔"

"آنٹی' مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نجیب صاحب سے آرزو کا رشتہ کر رہی ہیں؟"

وہ ذرا توقف سے بولیں۔ "اس قسم کی بات چل تو رہی ہے۔"

"کیا رشتہ........ آرزو کی مرضی سے ہو رہا ہے؟"

ان کی مسکراتی پیشانی پر شکن سی نمودار ہو گئی۔ "ہمارے گھرانوں میں رشتے بڑوں کی مرضی سے ہوتے ہیں' ویسے مجھے پتہ ہے کہ آرزو کو ایسے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

میرا دل بھر آیا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں آنٹی تابندہ کے سامنے سر جھکا کر بے تکان بولتا چلا گیا۔ میں نے شروع سے آخر تک اپنے اور آرزو کے بارے میں آنٹی کو سب کچھ بتا دیا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے میں کس جان لیوا کرب میں مبتلا ہوں۔ اپنے دل کے سارے پھپھولے پھوڑ ڈالے میں نے اس مہربان چہرے والی خاتون کے سامنے۔

وہ قدرے حیرت اور پریشانی سے سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "لیکن آرزو نے تو کبھی مجھ سے اس قسم کی بات نہیں کی........ حالانکہ میں اس کے دوستوں کی طرح ہوں اور وہ مجھ سے کچھ بھی چھپاتی نہیں۔ ہاں ایک دوبار اس نے اتنا ضرور بتایا تھا کہ اس نے فون پر تم سے رسمی بات کی ہے' بالکل جس طرح وہ رومی اور سمن وغیرہ سے بات کر لیتی ہے۔"

"بات اتنی نہیں ہے آنٹی' اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

"تو پھر وہ تمہاری طرف سے ہو گی۔ میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں جلال۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"آپ........ آنٹی........ آپ غلطی پر ہیں۔"

"غلط فہمی تمہیں بھی تو ہو سکتی ہے بیٹا........ یہ شادی آرزو کی مکمل رضامندی سے ہو رہی ہے۔ میں تمہیں پورے بھروسے سے یہ بات بتا رہی ہوں........ اگر........ تم چاہتے ہو تو' آرزو سے بھی بات کر سکتے ہو۔ میں اسے بلوا لیتی ہوں۔"

دروازہ کھلا اور آرزو اندر آ گئی۔ اس کا نصف چہرہ نقاب میں تھا اور آنکھوں میں سنجیدگی ایک صحرا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ "میں نے آپ کی باتیں سنی ہیں........ مجھے امید نہیں تھی جلال صاحب' کہ آپ یہاں آ کر اس طرح کا موضوع چھیڑیں گے۔ امی جو کچھ کہہ رہی ہیں' درست ہے۔ یہ شادی میری رضامندی سے ہو رہی ہے۔ اور........"

"تو پھر........ وہ کیا تھا جو اب تک میرے اور تمہارے درمیان رہا ہے۔"

"پتہ نہیں' آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ تو وہی عامیانہ سا رویہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات کر لے تو وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے........ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے' پلیز آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔"

مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا........ آرزو نے اب کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا تھا........ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن میری زندگی کے یہ بدصورت ترین لمحے........ جیتے جاگتے میرے سامنے موجود تھے۔

اسی دوران میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ انوار صاحب کی گاڑی تھی۔ آنٹی تابندہ کے ساتھ ساتھ آرزو کا رنگ بھی اڑ گیا۔ آنٹی گھبراہٹ سے بولیں۔ "آرزو کے ابو آ گئے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا بیٹا۔ وہ طبیعت کے بڑے سخت ہیں۔"

میں نے ایک آخری نظر آرزو پر ڈالی۔ آنکھوں میں لرزتے ہوئے پانی کی دوسری جانب وہ مجھے کہیں دور........ بہت دور کھڑی دکھائی دی۔ دھندلی دھندلی' مدھم مدھم۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو آپ دونوں مجھے معاف کر دیں۔"

قدم ڈگمگا رہے تھے' خود کو سنبھال کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں آنٹی آگے جا کر دروازہ کھول چکی تھیں۔ انوار صاحب گاڑی سمیت اندر آ گئے۔ وہ غالباً ڈھیر ساری شاپنگ کر کے آئے تھے۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بہت سے لفافے اور ڈبے وغیرہ رکھے تھے۔ نجیب بھی ساتھ ہی تھا۔ وہ خاصا چوڑا چکلا اور صحت مند نوجوان تھا۔ وہ خوب گوڑا چٹا تھا۔ جبڑے تھوڑے سے کشادہ تھے۔ اس سے اس کی شخصیت کی مضبوطی اور ارادے کی پختگی ظاہر ہوتی تھی۔

انوار صاحب نے خوشدلی سے سلام دعا کی۔ آنٹی تابندہ نے انہیں بتایا کہ میں یونہی ملنے کے لئے چلا آیا تھا۔ انوار صاحب جو شاپنگ کر کے لائے تھے اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ آرزو کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہونے جا رہا ہے۔ شاید ایک دو ہفتے میں اس کی شادی ہو جانا تھی۔ میں نے کہا۔ "انکل! اگر میرے لائق کسی بھی قسم کی

کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیں۔"

وہ بولے۔ "بیٹا! تمہارا کہنا ہی بہت ہے۔ اصل چیز تو بندے کا جذبہ ہوتا ہے......
باقی دنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔"

نجیب بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے بھی ایک دو باتیں مجھ سے کیں۔ پھر میں آرزو کے گھر کی دہلیز پار کر آیا۔ ہر شے اجنبی اجنبی لگ رہی تھی۔ گردوپیش دھندلائے ہوئے تھے۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد آرزو کی منگنی ہوگئی اور اس کے دو ہفتے بعد شادی ہونا طے پائی۔ یہ پندرہ بیس دن جس طرح میں نے گزارے وہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ میرے دکھ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا' آرزو میرے ساتھ جھوٹ بول رہی ہے۔ جو کچھ اس کی زبان پر تھا وہ اس کے دل میں نہیں تھا۔ وہ مجھے دھوکا دے رہی تھی اور خود سے بھی دھوکا کر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ آنکھیں انسان کے اندرونی جذبات کا آئینہ ہوتی ہیں' اور ان آنکھوں میں بہت کچھ دیکھا تھا میں نے......... آرزو کی بے خبری میں ہی اس کی حسین آنکھوں نے مجھے بہت کچھ دکھا دیا تھا......... میں نے ان آنکھوں میں ڈرے ڈرے خواب دیکھے تھے' سہمی سہمی آرزوئیں' ان کہی باتیں' سمٹی سمٹی چاہتیں......... اور یہ سب کچھ میرے لئے تھا۔ میرے اندر کی وجدانی آواز کہہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ میرے لئے تھا۔ اور اس کے علاوہ سنہری حروف سے لکھا ہوا وہ ایک ان کہا جملہ بھی میرے لئے تھا جو ایک دوشیزہ زندگی میں صرف ایک بار کہتی ہے۔ صرف ایک بار' دل کی گہرائیوں سے اور روح کی تمام تر توانائیوں سے۔ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" یہ جملہ آرزو نے مجھ سے کہا نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں جلی حروف میں لکھا دیکھا تھا۔

پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کیوں وہ جملہ اتنی جلدی حرف غلط کی طرح مٹ گیا؟ میں سوچتا رہا اور دن رات انگاروں پر لوٹتا رہا۔ میرے کانوں میں اس منحوس ڈھولک کی آواز پڑتی رہی جو آرزو کے گھر بجائی جا رہی تھی اور میری آنکھیں اس بند کھڑکی پر لگی رہیں جہاں میں نے پہلی بار آرزو کو دیکھا تھا۔ اس کھڑکی نے میری آنکھوں کو بہت ترسایا تھا' تڑپا دینے والی پیاس کے بدلے بس کبھی کبھار چند قطرے ہی مجھے یہاں سے ملے تھے' اب

یہ قطرے بھی ناپید ہونے والے تھے۔ پیاس ابدی پیاس میں بدلنے والی تھی۔ کبھی کبھی جب مایوسی انتہا کو پہنچ جاتی تو دل کے اندر سے آواز آتی' کہ حبس انتہا کو پہنچ کر خوشگوار موسم میں ڈھل جاتا ہے۔ شاید اس اتھاہ غم کے بعد بھی کسی خوشی کا ظہور ہونا ہو۔ مستقبل قریب کے پردے میں کوئی معجزہ میرے لئے چھپا ہوا ہو۔ شادی سے تین چار دن پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ میں ایک دو ماہ کے لئے مری چلا جاؤں۔ وہاں ہمارے کچھ دور کے رشتے دار مقیم تھے لیکن پھر یہ ارادہ بھی عمل کا روپ نہ دھار سکا۔ شاید اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ میرے لاشعور میں کسی انہونی کا انتظار تھا۔

شادی سے صرف دو روز پہلے اس خون رنگ شام کو میں کمرے کی کھڑکی میں چوکھٹ پر بیٹھا تھا کہ مجھے ہمیشہ ترسانے والی کھڑکی کھل گئی۔ میرا سانس سینے میں رکنے لگا ایک زرد لباس میں آرزو کھڑکی میں کھڑی تھی اور ہمارے گھر ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا آنچل شانوں پر تھا اور لمبے بال ایک سیاہ آبشار کی صورت کندھے پر گر رہے تھے اس کا حسین چہرہ سپاٹ تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ آنکھیں سپاٹ نہیں ہوں گی۔ مگر میں اتنی دور سے ان بولتی آنکھوں میں جھانک نہیں سکتا تھا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ساری بندشوں رکاوٹوں اور مصلحتوں کو توڑ پھوڑ دوں۔ ہر دیوار کے پرخچے اڑا دوں اور آرزو کو اپنے ساتھ اڑا کر کہیں بہت دور لے جاؤں۔ مگر اس دیوانے خیال کی عمر چند سیکنڈ سے زائد نہیں تھی۔ میں اپنے آپ میں لوٹ آیا۔ آرزو چند سیکنڈ کھڑکی میں رہی پھر اس نے الوداعی انداز میں کھڑکی بند کر دی۔

ٹھیک دو دن بعد آرزو کی شادی ہوگئی۔ بارات لاہور کے شمالی گوشے یعنی شاہدرہ سے آئی تھی۔ رات دس بجے کے قریب رخصتی ہونا تھی۔ سب گھر والے شادی پر گئے ہوئے تھے۔ میں چھت پر اپنے ورزش کے کمرے میں تھا۔ ہینڈ بیگ میرے سامنے تھا۔ میں پوری وحشت سے اس پر مکے برسا رہا تھا۔ "ریت اور برادے کے جسم" پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا۔ میرا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ شاید یہ ہینڈ بیگ میرے لئے اس وقت اس معاشرے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جہاں محبت کرنے والوں کو دیواروں میں چنوایا جاتا ہے' آرزوئیں سسک سسک کر مرتی ہیں اور ارمان آنکھوں کے راستے خون ہو کر بہتے ہیں۔ میں اس معاشرے کی دھجیاں اڑانے کی لاحاصل کوشش کر رہا تھا۔ جب بالکل بے

دم ہوگیا تو کمرے میں آیا اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آنسو خاموش دھاروں کی صورت گرتے رہے اور کہیں پاس ہی سے شہنائیوں کی آواز آتی رہی۔ بہت آنسو بہانے کے بعد دل کچھ ہلکا سا ہوگیا۔ جذباتیت........ جیسے حقیقت پسندی میں ڈھلنے لگی۔ جو کچھ ہوا یہ تو ہونا ہی تھا۔ اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ مشرقی عورت ایک معمہ ہی تو ہے۔ اس کا خمیر ہی شاید غم سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ خوش بھی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ بعد میں غمگین ہوا جاسکے۔ مسکراتی بھی اس لئے ہے کہ بعد میں ساری عمر رویا جاسکے اور کسی کو اپنی یاد میں رلایا جاسکے۔ پھر میرے ذہن سے وہ دھند بھی صاف ہونے لگی جو چند ناقابل فہم واقعات کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ مجھے لگا جیسے ذہن خواہ مخواہ کچھ واقعات کو الجھا کر اور پُراسرار رنگ میں پیش کر رہا تھا۔ جانوروں سے آرزو کا ڈرنا کوئی ایسی انوکھی کیفیت نہیں تھی جو کبھی دیکھنے میں نہ آئی ہو۔ ایک آوارہ کتے کا مختلف جگہوں پر موجود پایا جانا بھی بہت حیرت ناک نہیں تھا۔ اس قسم کے واقعات بھی عام زندگی میں پیش آجاتے ہیں۔ کتے بلیوں وغیرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جانے پہچانے لوگوں کے پیچھے........ اور جانی پہچانی جگہوں تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کرگزرتے ہیں۔ وہ سب کچھ جو میں ان حوالوں سے سوچتا رہا تھا مجھے بے معنی محسوس ہونے لگا........ گیارہ بجے کے قریب آرزو کی رخصتی ہوئی۔ آتش بازی کے شور میں کاروں کا مختصر سا قافلہ اسے لے کر اس کی نئی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ تاریک کمرے میں دروازے کھڑکیاں بند کرکے اور تکئے کے نیچے سر کو گھسیڑ کر میں لیٹ گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے نئے سیلاب امڈنے کی تیاری کرنے لگے اور میں انہیں روکنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ پتہ نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ شاید ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے ہوں گے اچانک گھر کے نچلے حصے میں کچھ شور سا سنائی دیا۔ پھر میرے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ میں نے ننگے پاؤں بھاگ کر دروازہ کھولا۔ سامنے بھابی سمن کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولیں "جلال........ کچھ........ سنا ہے تم نے۔"

"نن........ نہیں تو۔"

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئی بولیں۔ "آرزو کے دلہے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے........ وہ ختم ہوگیا ہے۔"

نجیب کی موت المناک تھی۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور گھر کی کفالت بھی کرتا تھا۔ اس کی سہاگ رات اس کے ماتم کی رات بن گئی تھی۔ دلہا کے گھر پہنچنے کے بعد وہ ایک دوست کی موٹر سائیکل پر شاہدرہ سے موہنی روڈ آیا تھا۔ یادگار چوک کے قریب ان کی موٹر سائیکل ایک تانگے سے ٹکرا گئی تھی۔ نجیب کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ اسپتال کے راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ اس کے دوست کو بھی شدید ضربات کے سبب اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہونا پڑا۔

اگلے ہی روز آرزو روتی پیٹتی اپنے گھر واپس پہنچ گئی۔ وہ سہاگن بننے کے صرف دو گھنٹے بعد ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ آنٹی تابندہ' انکل انوار اور دیگر اہل خانہ کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا........ کئی روز اسی شدید سوگواری میں گزر گئے۔ آہستہ آہستہ حالات معمول پر آنا شروع ہوگئے........ نئے نویلے دلہا کی موت کا غم پس منظر میں چلا گیا' زندگی کے نئے ہنگاموں اور نئی خبروں نے پیش منظر میں جگہ بنانا شروع کردی........ کبھی کبھی انوار صاحب اپنی کار میں آفس جاتے دکھائی دینے لگے۔ کسی وقت آنٹی تابندہ بھی مشتاق بھائی کے جنرل اسٹور پر کھڑی نظر آتیں۔ ان کی آنکھیں ہر وقت سوجی رہتی تھیں اور چہرہ پہلے سے زیادہ ملول دکھائی دیتا تھا۔ بھابی سمن کبھی کبھار والدہ کو لے کر آرزو کے گھر چلی جاتی تھیں۔ وہ

واپس آتیں تو میں ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلتا کہ ا پھر یوں ہوا کہ وہ کسی کسی وقت کھڑکی میں یا چھت پر دکھائی دینے لگی۔ اس کے
بالکل گم صم رہتی ہے۔ گھنٹوں بستر پر پڑی خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی ہے۔ ساتھ اکثر گڈو بھی ہوتا تھا۔ غالباً آنٹی وغیرہ کی ہدایت پر گڈو غمزدہ باجی کا دل بہلانے میں لگا
دن پہلے انوار انکل کے سینے میں بھی شدید درد ہوا تھا۔ انہیں کئی گھنٹے اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ ایک بار وہ زبردستی باجی کے ہاتھ میں بیڈ منٹن کا ریکٹ تھماتا نظر آیا۔ ایک مرتبہ
تھا۔ اب ڈاکٹر ان کے لئے انجیوگرافی تجویز کر رہے تھے۔ وہ اسے تنگ کرنے کے لئے اس کی کوئی چیز لے کر آگے آگے بھاگ رہا تھا اور وہ اس کے

کسی وقت میں گھر کی چھت پر اکیلا بیٹھا اور آرزو کے گھر کی بند کھڑکی کو دیکھتا۔ پیچھے لپک رہی تھی۔ دونوں اسی طرح آگے پیچھے بھاگتے کمرے سے چھت پر چلے آئے'
نجیب کی ناگہانی موت کی رات میری نگاہوں میں گھومنے لگتی۔ نہ جانے کیوں مجھے اچانک آرزو کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں کھڑکی میں موجود تھا' مجھے دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک
تاریک اور منحوس رات کے اردگرد کسی آسیب کا سایہ رینگتا ہوا نظر آتا۔ نہ چاہتے ہوئے گئی۔ اس نے سر پر آنچل درست کیا اور گڈو کو اس کے حال پر چھوڑ کر نیچے چلی گئی۔
بھی پتہ نہیں کیوں......... میرے پردہ تصور پر ایک کالے کتے کی شبیہہ ابھرنے لگتی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال پختہ ہونے لگا تھا کہ چند ماہ کے اندر آرزو
حیران تھا کہ یہ شبیہہ کیوں ابھر آتی ہے......... کیوں نجیب کی موت کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی زندگی کے اس شدید ترین جھٹکے سے سنبھل جائے گی۔ وہ دھیرے دھیرے پھر سے وہی
ہوئے میرا ذہن پُراسراریت کی طرف چلا جاتا ہے۔ نجیب کی موت کے المناک واقعہ سے پہلے والی آرزو بن جائے گی۔ اور اگر وہ پہلے والی آرزو بن جاتی تو شاید......... ایک بار پھر
اب پانچ چھ ہفتے گزر چکے تھے۔ اس دوران میں' میں نے بازار میں آتے جاتے غیر ارادی پہلے والے دن بھی پلٹ آتے بالکل اسی صورت میں نہ پلٹتے لیکن ان کی جھلک تو نظر آنے
طور پر کئی بار اس کتے کو تلاش کیا تھا' مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ جب وہ کتا کہیں نظر لگتی......... کہتے ہیں کہ آس امید پر دنیا قائم ہے۔ شاید میں بھی اپنی دنیا کو اس آس کے
نہیں آیا اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی اور بات سامنے آئی تو میں نے ان لایعنی خیالات سہارے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گڈو کبھی کبھی ہمارے گھر آنے لگا تھا۔ اسے معلوم
اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور دھیرے دھیرے اس میں کامیاب ہوا۔ ہوا تھا کہ چند سال پہلے میں کراٹے کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا اور میں نے بہت سے مقابلے جیتے

وہ فروری مارچ کے دن تھے' بہار کی آمد آمد تھی وہی موسم جس میں گل کھلتے ہیں تھے۔ اس نے ضد کر کے میری تصویروں کے سارے البم دیکھے' ٹرافیاں' کپ' اخباروں
اور دلوں میں خوشبو کو راستہ دینے کے لئے نئے دروازے وا ہوتے ہیں۔ ایک اداسی کے تراشے سبھی کچھ دیکھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اسے کراٹے سکھاؤں۔ مگر اس کے
میرے دل میں بھری ہوئی تھی۔ میں ابھی ابھی جاگنگ کے بعد واپس آیا تھا اور گھر امتحانات ہونے والے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا دھیان پڑھائی کی طرف سے کم
چھت پر ٹہل رہا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور افق پر رنگ بکھرے ہوئے تھے ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ امتحانات کے بعد اس بارے میں سوچیں گے......... مگر پھر
دفعتاً میری نگاہ میں روشنی سی بھر گئی۔ میں نے آرزو کو دیکھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چھ یوں ہوا کہ ایک دم ہی سب کچھ بدل گیا۔ آس امید کے سارے دیے ایک دم پھڑپھڑا کر
پر آئی۔ اس نے ایک آرام کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھنے لگی۔ اس۔ بجھ گئے۔ میں نے خود کو اور اپنے آبلہ پا جذبوں کو ایک بار پھر زیرو پوائنٹ پر کھڑے ہوئے
میری طرف پشت کر لی تھی' تاہم مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھے چھت پر دیکھا ہے۔ پایا۔

ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دیر تک کچھ پڑھتی رہی اور میں وارفتگی کے عالم میں اسے دا ایک دن شام کو گڈو بڑا اداس سا ہمارے گھر آیا۔ کہنے لگا۔ "بھائی جان! آپ سے
رہا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے اسے بس ہماری چھت پر سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ آخر کہا تھا ناں کہ مجھے تھوڑا سا کراٹے سکھا دیں۔"
اٹھ کر چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے بس ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ نہ جا۔ "کیوں اب کیا ہوا ہے؟"
کیوں یہ سرسری سی لاتعلق نظر بھی مجھے اچھی لگی۔ "ہم لاہور سے جا رہے ہیں۔"

میرے دل میں گھونسہ لگا۔ "کہاں جارہے ہیں؟"

"ایبٹ آباد۔ امی ابو باجی سب جارہے ہیں۔ ہم یہ گھر بھی چھوڑ رہے ہیں۔ کہتے ہیں شاید ہم کچھ مہینے بعد پاکستان ہی چھوڑ جائیں۔"

اس دوران میں بھابی' والدہ اور والد بھی آگئے۔ وہ گڈو سے پوچھ تاچھ کر لگے۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ ابو کے آفس کی ایک برانچ ایبٹ آباد میں بھی تھی' انہوں نے اس مہینے کی پہلی تاریخ سے وہاں شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ سامان تو آج رات ہی جارہا تھا' باقی ایک دو روز میں جانے والا تھا۔

یہ اطلاع ہم سب کے لئے دھچکہ ثابت ہوئی۔ دونوں گھرانوں کے تعلقات کم اتنے تو ضرور تھے کہ اس قسم کے پروگرام کا ہمیں پہلے سے علم ہوتا۔ اب بالکل عین پر ہمیں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ لاہور سے بلکہ شاید پاکستان سے ہی جانے والے قریباً ایک سال کے میل ملاپ کے باوجود انوار صاحب کا گھرانہ کم آمیز اور "باتکلف" رہا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی اس گھرانے میں جو انہیں دوسروں سے جدا رہنے پر مجبور تھی۔

♥

میرا دل ایک بار پھر درد کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ اداسی اور مایوسی نے طرف سے یلغار کی تھی اور مجھے گھیر لیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آرزو کے جانے سے ایک بار صرف ایک بار اس سے بات کرلوں۔ اس کے جانے سے صرف ایک دن دوپہر کے وقت مجھے یہ موقع مل گیا۔ آنٹی تابندہ غالباً محلے کے ایک دو گھرانوں سے الو ملاقات کے لئے نکلی تھی۔ گڈو بھی ان کے ساتھ تھا' ملازم خیرو کو میں نے انکل انوار ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آرزو گھر میں اکیلی ہے۔ میں فون ملایا' دوسری طرف سے آرزو کی خوبصورت لیکن ملول آواز کانوں میں پڑی۔ "کون؟"

میں نے کہا۔ "میں جلال بول رہا ہوں۔ آپ کو خدا حافظ کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

لائن پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ تاہم یہی بات حوصلہ افزا تھی کہ فون بند نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "آرزو........ جو کچھ ہوا' مجھے اس کا دلی رنج ہے کاش ایسا نہ ہوا ہو مگر قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ اب یہ دعا میرے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے

خدا آپ کو اس صدمے سے سنبھلنے کی ہمت عطا فرمائے۔"

"شکریہ۔" رنج میں ڈوبی ہوئی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے کہا۔ "آرزو' میں ان باتوں پر بھی تہہ دل سے شرمسار ہوں جو آپ کی شادی سے چند روز قبل میرے منہ سے نکل گئی تھیں۔ اگر آپ ان باتوں کے لئے مجھے معاف نہیں کریں گی تو میں عمر بھر ایک عذاب میں گرفتار رہوں گا۔"

"میں وہ سب کچھ بھول چکی ہوں۔ پلیز آپ بھی وہ سب کچھ بھول جائیں۔"

"لیکن......... کچھ باتیں تو ایسی تھیں جو آپ یاد رکھنا چاہتی تھیں اور میں بھی یاد رکھنا چاہتا تھا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"ہماری دوستی......... پُرخلوص اور بے لوث دوستی۔ جو ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی نبھائی جاسکتی ہے۔"

"جی!" وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی۔

"مجھے اس تعلق سے محروم نہ کرنا آرزو۔ یہ میری درخواست ہے۔"

"جی!" اس نے پھر اتنا ہی کہا۔

میں نے کہا۔ "آرزو' آپ جارہی ہیں؟"

"جی ہاں۔ کل نکلنا ہے؟"

"کبھی فون کریں گی؟"

"اب یہ ممکن نہیں۔" وہ الجھن سے بولی۔

"میری خاطر اس ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کیجئے گا۔ کیونکہ میں انتظار کروں گا۔ ہر روز' ہر گھڑی۔"

وہ خاموش رہی۔ "اچھا خدا حافظ۔" چند لمحے بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز سماعت سے ٹکرائی اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

.........انوار صاحب کا گھرانہ چلا گیا۔ وہ مکان سنسان اور تاریک ہوگیا جہاں سے کب حسین شام کو مجھے زندگی کی روشنی ملی تھی۔ میں ہجر کی آگ میں جلتا رہا اور شب و ز کسی انہونی کا انتظار کرتا رہا۔ اس فون کا انتظار کرتا رہا جس کا وعدہ کسی نے مجھ سے

نہیں کیا تھا۔ اس نامے کا منتظر رہا جس کا شاید سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا........

طرح پانچ ماہ گزر گئے۔ انکل انوار کا صرف ایک خط والد صاحب کے نام آیا تھا۔ اس
سے بس اتنا معلوم ہوا کہ انوار صاحب ایبٹ آباد میں سیٹ ہوگئے تھے۔ کرائے پر
اچھی کوٹھی انہیں مل گئی تھی۔ موسم بہت اچھا تھا جس کے سبب انوار صاحب کی طبیعت
قدرے بحال ہوگئی تھی۔ انوار صاحب نے اپنا فون نمبر وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ ایڈریس
بس ادھورا سا تھا۔ اس واحد خط کے بعد انہوں نے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

انہی دنوں میرا جگری دوست کاشف انگلینڈ سے واپس آگیا۔ وہ وہاں کمپیوٹر کا
کورس کرنے گیا ہوا تھا۔ کاشف بڑا ہنس مکھ اور تیز طرار بندہ تھا۔ میرے ساتھ ہرو
اس کا ہنسی مذاق اور دھول دھپا جاری رہتا تھا۔ کاشف نے کالج کے دنوں میں ٹی وی
تھوڑی سی ماڈلنگ بھی کی تھی۔ کرکٹ بہت اچھی کھیلتا تھا۔ ہماری طرح کاشف کی فیملی
بزنس بھی اسپورٹس کے سامان کا تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ صرف مینوفیکچرر تھے۔ سیالکوٹ
ان کا ہیڈ آفس تھا۔ کاشف کے والد زیادہ تر سیالکوٹ ہی رہتے تھے۔

کاشف آیا تو زندگی میں تھوڑی سی تیزی اور ہنگامہ خیزی آگئی۔ کاشف نے میر
اداسی اور بیزاری کو اپنے رنگین قہقہوں اور چٹکلوں میں اڑانا شروع کردیا۔ پچھلے ڈیڑ
برس میں مجھ پر جو بیتی تھی اس کی بھنک بھی میں نے کاشف کو نہیں پڑنے دی تھی۔
وجہ تھی کہ وہ میرے بدلے ہوئے مزاج اور رویے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

ایک رات جب ہم الحمرا آرٹس کونسل سے اسٹیج ڈرامہ دیکھ کر باہر نکلے تو اس
میری کمر پر زور سے دھپ لگائی اور گرج کر بولا۔ "دیکھ جلال' تو چاہے کچھ بھی کہے' مجھ
اس بات کا پکا پکا یقین ہے کہ میری غیر موجودگی میں تیرے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ کسی
ساتھ جھگڑا ہوا ہے تیرا' کسی سے عشق ہوگیا ہے تجھے' کوئی پوشیدہ مرض لاحق ہوگیا ہے
تجھے یا کوئی شے کھو گئی ہے تیری........ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ مجھے بتا دے ورنہ قسم خدا کی
میں تیرا حشر خراب کردوں گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری آخری بات کسی حد تک درست ہے کوئی شے کھو گئی تھی
میری۔"

"کیا کھو گیا تھا' کیا کھو گیا تھا۔ جلدی بتا' قسم پیدا کرنے والے کی تجھے ڈھونڈ کر دوں

......"

میں نے سانس لی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب وہ شے مل گئی ہے۔ تم واپس
آگئے ہو۔"

"میں جھانپڑ دے دوں گا تیرے بُوتھے پر........ تو پھر مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہا
ہے۔ اس نے اچھل کر میری گردن اپنے بازو میں جکڑی اور اتنے زور سے بھینچی کہ ہم
دونوں سائیکل اسٹینڈ کی موٹر سائیکلوں پر گرے۔ موٹر سائیکلوں کی ایک قطار زمین بوس
ہوگئی۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ زور آزمائی میں مجھ سے نہیں
جیت سکتا لیکن زور آمازئی سے باز کبھی نہیں آیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی صورت
مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تو میں نے اس کے دائیں بازو کو کہنی پر سے اس طرح موڑا کہ
میری گردن پر سے اس کی گرفت خودبخود کمزور ہوگئی۔ کئی لوگوں نے سمجھا کہ شاید ہم سچ
مچ جھگڑ پڑے ہیں' وہ ہمیں چھڑانے میں لگ گئے۔ ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تو
پتہ چلا کہ کئی موٹر سائیکلوں کا نقصان ہوا ہے۔ سڑک پر شیشے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔
بہت سے افراد بک بک جھک جھک کرنے لگے۔ کاشف نے بڑے اطمینان سے جیب میں
ہاتھ ڈالا اور حسب عادت حاتم کی قبر پر لات ماری۔ سو سو کے کئی نوٹ' اس نے سائیکل
اسٹینڈ والے کے حوالے کر دیئے۔

میں جانتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک کاشف سے صورت حال کو چھپا نہیں سکوں
گا........ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک اتوار ہم دونوں دریائے راوی کی سیر کے لئے گئے۔
راوی ان دنوں خوب چڑھا ہوا تھا۔ حدِ نگاہ تک پانی نظر آرہا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ کامران
کی بارہ دری واقع ہے۔ ہم کشتی پر سوار ہو کر بارہ دری میں پہنچے۔ کشتی نے ہمیں واپس
لے کر جانا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ کاشف کشتی والے کو واپس بھیج رہا ہے۔
میرے روکنے کے باوجود کشتی والا مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ کاشف زیرلب مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی۔" میں نے کاشف سے پوچھا۔

"یہ ساری دنیا ہی چکر ہے بلکہ گھن چکر ہے۔ میں بھی چکر ہوں' تم بھی چکر
ہو........ بلکہ تم تو چکرائے ہوئے بھی ہو۔"

"بک بک مت کرو۔ مجھے بتاؤ' کشتی والا واپس کب آئے گا۔"

"کیوں......... کیا تمہیں خطرہ ہے کہ یہاں کوئی لڑکی تمہاری عزت لوٹ لے گی؟"

"یار' پریشان مت کرو۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ بہاؤ کتنا زیادہ ہے' کوئی کشتی طرف نہیں آ رہی۔ جو کشتی سواری لاتی ہے وہی لے کر جاتی ہے۔"

"ہماری کشتی بھی ہمیں لے جائے گی......... لیکن وہ ٹھیک چار گھنٹے بعد آئے گی۔" اس نے اپنی شاندار رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اس دوران ہم کیا کریں گے؟"

"اس دوران ہم بڑے آرام سے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھیں گے اور تم ا بچوں کی طرح' بلکہ اچھے بڑوں کی طرح بڑی تفصیل سے مجھے اپنے پوشیدہ امراض بارے میں بتاؤ گے اور اگر نہیں بتاؤ گے تو......... قسم پیدا کرنے والے کی کہ آج لاش مچھلیاں ہی کھا جائیں گی۔"

"کس کی لاش کو؟"

"میری لاش کو' کیونکہ تجھے قتل کرنے کے بعد میں بھی خودکشی پر مجبور ہو جاؤں گا چونکہ میرا گلا دبانے والا کوئی نہیں ہوگا لہٰذا میں پانی میں ڈوب کر مروں گا۔" وہ ایک آن تھا۔ اس سہ پہر بارہ دری کے ایک گوشے میں' ایک ہوا دار سائبان کے نیچے بیٹھ کر اپنے اور آرزو کے بارے میں کاشف کو سب کچھ بتانا پڑا......... اس سے کچھ بھی چھ ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے الف سے یے تک سبھی کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ بغور سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ ایک دوبار میری آنکھوں میں آن بھی چمک گئے۔ سچ کہتے ہیں کہ کسی ہمدرد ساتھی سے اپنا دکھ بیان کر کے دل کا بوجھ ہو جاتا ہے۔ میرے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا۔ لیکن یہ بوجھ شاید اب کاشف کے دل منتقل ہو گیا تھا۔ اس کی ہمیشہ چمکتی ہوئی روشن آنکھوں میں گہری سنجیدگی اور فکرمندی سائے رینگنے لگے۔

پہلے تو اس نے مجھے سخت لعن لعن کی کہ میں نے اس سے اب تک اتنی اہم باتیں چھپائے رکھیں۔ پھر جب مجھے ڈھیروں گالیاں دے کر اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے گولڈ لیف کا سگریٹ سلگایا اور اس کے گہرے کش لیتا ہوا سوچوں میں گم ہو گیا کچھ د بعد کہنے لگا۔ "اگر تمہارے پاس کاغذ قلم ہے تو میری یہ بات ابھی لکھ لو کہ تم ایک بالکل

بے کار انتظار میں مصروف ہو۔ تمہیں آرزو کے فون کا انتظار کرتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے ہیں' تم چھ سال بھی مزید انتظار کرو گے تو وہ تم سے رابطہ نہیں کرے گی۔ تم نے نفسیات پڑھی ہے لیکن میں نے لوگوں کو پڑھا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے اوپر تلے دو اور گہرے کش لئے اور بولا۔ "ہمیں اس سلسلے میں خود ہی کوئی پیش رفت کرنا ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ وہ لڑکی ہے اور پھر کچھ نامعلوم مسائل میں بھی گھری ہوئی ہے۔ وہ اپنی جگہ سلگتی تو رہے گی مگر تمہاری طرف آنے کی ہمت نہیں کر پائے گی۔"

"یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں لیکن........."

"اب تمہاری انا تمہیں روک رہی ہے۔" اس نے میرا فقرہ اپنی طرف سے مکمل کر دیا۔ "دیکھو بیٹا جلال!" اس نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ "تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو اور شاید سمجھ دار بھی زیادہ ہو' لیکن یہ بات تمہیں ماننا پڑے گی کہ آرزو جیسی سہمی سہمی اور کم گو لڑکی اپنے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے گی۔ تم نے جو کچھ بتایا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے' اس نے تمہارے ساتھ اپنی آخری گفتگو میں بے شک کوئی وعدہ نہیں کیا لیکن آس کا ایک کچا پکا دھاگا اس نے سلامت رکھا ہے۔ اب یہ ہماری کارکردگی پر منحصر ہے کہ یہ دھاگا ٹوٹ جاتا ہے یا ایک مضبوط ڈوری میں بدل جاتا ہے۔"

"ہماری کارکردگی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کارکردگی سے کیا مراد ہو سکتی ہے؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

میں نے بہت عرصے بعد سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "کاشی! مجھے اس سارے معاملے سے ایک عجیب الجھن سی محسوس ہونے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آرزو اور اس کے گھر والوں کے حوالے سے کچھ باتیں ایسی ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آ رہیں اور شاید کبھی نہ آ سکیں۔"

اس نے مجھے ایک گالی نکالی اور ٹانگیں پسار کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تیرا بدبخت دماغ کس طرف جا رہا ہے۔ یار تم......... کس زمانے میں رہ رہے ہو۔ یہ کمپیوٹر اور

سیٹلائٹ کا دور ہے۔ پوری دنیا گلوبل ولیج بنی ہوئی ہے اور تم ابھی تک بھوت پریت اور آسیب کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس حوالے سے جو بھی بکواس کی ہے وہ کسی تھرڈ کلاس ڈائجسٹ رسالے میں تو چھپ سکتی ہے مگر حقیقت نہیں کہلا سکتی۔ میں تمہارے اندر کی ساری جہالت کو سمجھتا ہوں۔ تم اشاروں کنائیوں میں آرزو کے شوہر کی موت کا ٹانکا' ایک آوارہ کتے سے جوڑنے کی بچگانہ کوشش کر رہے ہو۔ یار کوئی ہوش کی بات کرو۔ یہ باتیں اب پرانی ہو چکی ہیں۔ پرانے اخبار اٹھا کر دیکھ لو۔ پچھلے پانچ سال میں درجنوں شوہر حضرات کسی وجہ سے اپنی سہاگ رات میں رحلت فرما چکے ہوں گے۔ کیا ان سب کی موت کی وجہ ان کے آس پاس منڈلانے والا کوئی کالا کتا ہے؟ کوئی سفید بلی ہے؟ ایسا کچھ نہیں یہ سب ہمارے توہمات ہیں جو حالات کی شکلیں بگاڑ بگاڑ کر ہمیں دکھاتے رہتے ہیں........ ٹھیک ہے کہ ایک پہلو سے آرزو تھوڑی سی ایب نارمل ہے' وہ جانوروں سے ڈرتی ہے' لیکن یہ کوئی انہونی تو نہیں۔ ایسے بے شمار فوبیاز پائے جاتے ہیں۔ اور اگر........"

"اچھا یار! بس کرو اب۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی۔ "تم بتاؤ........ تم چاہتے کیا ہو۔ کس کارکردگی کی بات کر رہے ہو تم؟"

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "ہم ایبٹ آباد چل رہے ہیں........ اور تم آرزو سے مل رہے ہو اس کے گھر جا کر۔"

☆==========☆==========☆

ایبٹ آباد ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہ مری کی طرح ٹھنڈا ہے اور نہ پنڈی کی طرح گرم۔ دونوں کے بین بین ہے۔ ایسے ہی یہاں کے لوگ ہیں' دھیمے دھیمے' خوش مزاج اور ملنسار........ ہم بذریعہ فلائنگ کوچ ایبٹ آباد پہنچے اور شاہراہ ریشم پر واقع ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ انکل انوار کا کچا پکا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے کاشف کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اس ایڈریس کے ذریعے انکل انوار کا ٹھکانہ تلاش کرے۔ کاشف ایک تیز رفتار شخص کا نام تھا' وہ یہ کام چند گھنٹے میں کر گزرا۔ شہر کے شمالی حصے میں گل مہر کالونی نام کی ایک خوبصورت بستی تھی۔ اس بستی کی ایک کوٹھی میں وہ ہستی قیام پذیر تھی' جو آنکھوں کے راستے میری روح میں گہرائی تک اتر چکی تھی اور جس کے بغیر

مجھے مرنا آسان اور جینا مشکل لگتا تھا۔

اگلے روز میں اور کاشف طے شدہ پروگرام کے مطابق انکل انوار کے گھر جا پہنچے ہم سہ پہر کے وقت پہنچے۔ کال بیل پر اتفاقاً گڈو ہی گیٹ پر آیا۔ "کون ہے؟" اس نے محتاط آواز میں پوچھا۔

میری آواز سن کر اس نے نہ صرف گیٹ کھول دیا بلکہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ان چھ سات مہینوں میں ہی وہ کافی بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ "امی ابو کدھر ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ بھی ادھر ہی ہیں۔" وہ بلا تردد مجھے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

میں اس کے ساتھ صحن میں پہنچ گیا۔ کاشف میرے عقب میں تھا۔ "کون ہے گڈو؟" اندر سے ایک باریک آواز ابھری اور پھر جیسے ایک دم سورج ایک دروازے میں سے اچھل کر میرے سامنے آگیا۔ آرزو مجھ سے پندرہ بیس فٹ کی دوری پر کھڑی تھی۔ وہ ہلکے رنگ کے نیلے لباس میں تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ سادگی میں بھی اس کا حسن بلا کی دلکشی رکھتا تھا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک خوبصورت چمک ابھری۔ شناسائی گہری وابستگی اور خوشی کی چمک۔ بس وہ ایک لمحہ تھا' اس لمحے میں مجھے یوں لگا کہ وہ لپک کر آئے گی اور میرے گلے سے لگ جائے گی........ مگر اگلے ہی لمحے' چہرے کی خوبصورت دھوپ پر گہرے سائے پھیل گئے۔ آنکھوں کی چمک غیریت آمیز' جھجک میں ڈھل گئی۔ روشن پیشانی پر ایک شکن ابھری۔ اس نے جلدی سے آنچل درست کیا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ اس دوران میں آنٹی تابندہ بھی باہر نکل آئیں۔ گڈو کے ساتھ مجھے اور کاشف کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اسلام علیکم کہا۔ انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ رسمی سے انداز میں میرے سر پر ہاتھ بھی پھیرا۔ پھر گڈو سے بولی۔ "بھائی جان کو ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔"

گڈو ہمیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی........ پہلے تو وہ پوچھتا رہا کہ میں اتنی دیر بعد کیوں آیا ہوں۔ پھر وہ کراٹے اور کراٹے کی فلموں کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد خیرو کولڈ ڈرنک لے کر آ گیا۔ چند منٹ بعد آنٹی تابندہ وارد

ہوئیں۔ سب کا حال احوال پوچھا۔ پھر دریافت کرنے لگیں ہم نے کیسے تکلیف کرلی۔

اس کا جواب میں نے کئی دن پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں اپنے دوست کی حیثیت سے کاشف کا تعارف کراچکا تھا۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے میں نے کہا "کاشف اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر پاکستان کے شمالی علاقوں پر ڈاکومینٹری فلم تیار کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں لوکیشنز وغیرہ دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہے۔ آتے آتے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا ہے۔ ہم یہاں ذیشان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

"اچھا کیا بیٹا' ہم سے ملنے آگئے۔" آنٹی بولیں۔ "ہم تو یہاں آکر مسئلوں میں اتنے الجھے کہ اپنا ہوش ہی نہیں رہا۔ پہلے آرزو بیمار ہوئی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ وہ کچھ ٹھیک ہوئی تو گڈو کے ابو کو پھر سے سینے میں درد ہونے لگا۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ دل کی ستر فیصد نالیاں بند ہیں۔ بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں مگر کسی بھی وقت حالت خراب ہوسکتی ہے' بہتر ہے کہ انجوگرافی کرالی جائے۔ ایک دو ملنے والوں نے مشورہ دیا ہے کہ انجوگرافی اور آپریشن وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ دواؤں کے ذریعے بھی شریانیں وغیرہ کھل جاتی ہیں۔ بیماری کے باوجود آرام بالکل نہیں کرتے۔ سو طرح کے بکھیڑے پال رکھے ہیں انہوں نے۔"

وہ کافی دیر تک اپنے مسائل اور پریشانیوں کا ذکر کرتی رہیں۔ ان کے رویئے میں مجھے کسی طرح کی گرمجوشی نظر نہیں آئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیں جلد یہاں سے رخصت کر دینا چاہتی ہیں۔ ان کا رویہ ناقابل فہم نہیں تھا۔ آرزو کی شادی سے ایک دو روز پہلے میرے اور آنٹی کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا' وہ یقیناً ابھی تک ان کے ذہن میں تازہ تھا......... ہماری باتوں کے دوران میں ہی انکل انوار بھی آگئے۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھے اور آنکھیں ملتے ہوئے آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پر ہی تھے۔ بالائی منزل کے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ انکل انوار سے سلام دعا ہوئی۔ آنٹی نے انہیں جلدی جلدی بتایا کہ ہم یہاں کیسے اور کیونکر آئے ہیں۔ انکل کا رویہ آنٹی سے بھی زیادہ روکھا پھیکا تھا......... آنٹی ان سے ڈری ڈری نظر آرہی تھیں' جیسے ہمارے یہاں ہونے میں ان کا قصور ہو......... ویسے بھی وہ انکل کے سامنے دبی ہوئی رہتی تھیں اور بات صرف آنٹی ہی کی نہیں تھی......... گھر کے سارے افراد ویسے بھی وہ انکل کے سامنے بے حد محتاط اور

سنبھلے ہوئے رہتے تھے۔ وہ طبیعت کے ذرا تیز تھے' شاید ان کے دل کے عارضے کی وجہ بھی یہی تھی۔

آنٹی سے باتیں کرتے کرتے میری نگاہ ایک بار پھر آنٹی کی گردن پر نظر آنے والے پُراسرار نشان پر پڑ گئی۔ اس نشان کو دیکھتے ہی فوراً کسی جانور کے پنجے کا تصور ذہن میں آجاتا تھا۔ ایسا پنجہ جس کے ناخن گہرائی تک گوشت میں اترے تھے اور جسم کو لہولہان کر گئے تھے......... عین ممکن تھا کہ آنٹی کے جسم پر اس قسم کے اور نشانات بھی ہوں۔ ہماری باتوں کے درمیان میں ہی گاڑی کا ہارن بجا۔ خیرو نے دروازہ کھولا اور انکل کی گاڑی اندر آئی۔ کھڑکی میں سے میں نے دیکھا' گاڑی کی ڈرائیونگ نشست پر قریباً چالیس بیالیس برس کی عمر کا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بالوں میں ہلکی سی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ بال کم ہوجانے کے سبب پیشانی کافی چوڑی لگ رہی تھی۔

وہ شخص ہاتھوں میں دو کین پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا' اس نے کین فرش پر رکھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ انکل اور آنٹی اس شخص کو رفیق کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ یہ مقامی شخص لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ شاید کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ کہیں سے دیمک مارنے والی دوا لے کر آیا تھا۔ انکل یہ اسپیشل دوا ڈھونڈ کرلانے کے لئے رفیق کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے رفیق سے قیمت پوچھی تو اس نے بڑی انکساری سے انکار کردیا۔

"نہیں بیٹا۔ آپ کی یہی مہربانی ہے کہ آپ نے اپنا اتنا وقت ضائع کیا ہے۔"

انکل اور رفیق نامی یہ شخص باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ابھی انکل نے رفیق نامی اس بندے کو روانی میں بیٹا کہا تھا۔ رفیق کے لئے ان کے منہ سے یہ لفظ کچھ سجا نہیں تھا۔ دیکھنے میں انکل انوار اس شخص سے کوئی آٹھ دس سال ہی بڑے نظر آتے تھے۔ جتنے بال اس شخص کے سفید تھے اس سے تھوڑے سے زیادہ انکل کے تھے۔

وہ شخص گاڑی کی چابی انکل انوار کو دے کر واپس چلا گیا۔ انکل نے واپس آکر خیرو کو ہدایت دینا شروع کردیں کہ وہ ذرا ڈرائنگ روم کو ٹھیک کردے۔ چار بجے کے قریب کچھ مہمان آنے والے ہیں۔

انکل کی طرف سے خیرو کو دی جانے والی یہ ہدایت ایک طرح سے ہمارے لئے بھی

اشارہ تھی کہ ہم یہاں سے ذرا جلدی تشریف لے جائیں۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں نے آنٹی اور انکل سے اجازت لی اور کاشف کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔ ہمیں خدا حافظ کہنے کا انداز بھی نہایت روکھا پھیکا تھا۔ صرف آنٹی ہمارے ساتھ صحن تک آئیں۔ غالباً گڈو کو بھی آنے سے روک دیا گیا تھا۔

"یار، مجھے تو یہ سب گڑبڑ گھوٹالا لگ رہا ہے۔" راستے میں کاشف نے اپنی پیشانی کھجاتے ہوئے کہا۔

"کس حوالے سے کہہ رہے ہو؟"

"اس گھر میں سب ڈرے ڈرے اور گم صم ہیں۔ جیسے کسی شکنجے میں جکڑے ہوئے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ کچھ توہم پرست بھی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ گھر کی دو تین چوکھٹوں پر تعویذ جیسی کوئی شے لٹک رہی تھی۔"

"میں نے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔"

"ساتھ والے کمرے میں بھی تھی اور لابی کی طرف جو دروازہ جاتا تھا وہاں بھی کچھ لٹک رہا تھا۔"

"کہیں یہ دیمک کا سدباب تو نہیں تھا۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ گھر کے علاوہ گھر والوں کو بھی دیمک لگی ہوئی ہے۔ بہرحال ساری باتوں پر لعنت بھیجو یار......... کام کی بات بس ایک ہی ہے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "بھابی بالکل سچل ہے، ایک دم فرسٹ کلاس۔"

بھائی......... کیا مطلب؟"

"ادئے چغد ابن چغد......... تیری جان......... تیرا جگر اور گردہ......... تیری محبوبہ یعنی آرزو۔ اس کے حسن کی چمک سے میری تو ابھی تک آنکھیں نہیں کھل رہیں۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی۔" اس نے باقاعدہ اپنی آنکھیں ملنا شروع کر دیں۔

"یار، کبھی تو اپنی چونچ بند رکھا کرو۔ ہر وقت بے تکی ہانکتے ہو۔ مجھے تو پتہ نہیں ہے کہ اب کبھی اس کی شکل بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں......... تم اسے بھابی کہہ رہے ہو۔"

"تاج محل ضرور بنانے چاہئیں۔ کیونکہ کبھی کبھی سچ مچ تاج محل بھی بن جاتا ہے......... اور اس تاج محل کی تعمیر تو کچھ بہت زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ بس ہمت

مرداں کی ضرورت ہے۔"

"مرداں نہیں مُرداں کی بات کرو۔ میں تو اندر سے مر سا گیا ہوں یار! تم نے دیکھا ہے کہ آرزو کے گھر والوں کا رویہ کیسا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم چند منٹ مزید ٹھہرتے تو وہ باقاعدہ ہم سے جانے کی درخواست کر دیتے۔"

"تم زیادہ بک بک مت کرو اور نہ زیادہ دیوداس بننے کی کوشش کرو۔ یہ دیو آنند اور بمبئی کے بابو کا دور نہیں۔ آج کل تو شان اور سنجے دت عین نکاح سے کچھ دیر پہلے محبوبہ کو ہیلی کاپٹر پر بٹھا کر لے جاتے ہیں اور محبوبہ بھی چھلانگیں مارتی ہوئی بیٹھتی ہے۔ ہیلی کاپٹر میں۔"

کاشف ذرا چہک کر میری اداسی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا، ورنہ میں جانتا تھا کہ اندر سے وہ بھی فکر مند ہے۔ اس چاردیواری کے اندر ہمیں عجیب سی گھٹن اور وحشت کا احساس ہوا تھا اور یہی گھٹن اور وحشت اہل خانہ کے اندر بھی پائی جاتی تھی۔

ہوٹل واپس پہنچ کر بھی ہم دیر تک مشورے میں مصروف رہے۔ طے یہ ہوا کہ انکل انوار اور ان کے گھرانے کے موجودہ حالات کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی کوشش کی جائے۔ اس کام کی ذمے داری کاشف نے اپنے سر لی۔ اگلے روز دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد وہ اپنے مشن پر نکل گیا اور میں بند کمرے میں بستر پر چت لیٹ کر واقعات کا تانا بانا بننے میں مصروف ہو گیا۔

ورزش میرا روزانہ کا معمول تھا۔ اگر کسی وجہ سے ایک دو دن ورزش نہ کر سکتا تو طبیعت میں عجیب طرح کی بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔ کل اور پرسوں ورزش نہیں ہو سکی تھی لہٰذا بدن اینٹھ رہا تھا۔ میں نے ہوٹل کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کئے اور ورزش میں مصروف ہو گیا۔ اس ورزش میں اسٹریچنگ، مشقیں، شیڈو فائٹ، فارمنگ، سبھی کچھ شامل ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا اور کمی صرف اتنی تھی کہ میرے سامنے کوئی حریف نہیں ہوتا تھا۔ ہوٹل کا کمرہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ دس پندرہ منٹ کی ورزش کے بعد میں کچھ ہانپنے لگا تو تازہ ہوا کے لئے میں نے کمرے کی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ یونہی میں نے ایک نگاہ نیچے سڑک پر ڈالی اور اچانک تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ چند لمحوں کے لئے شاید میرا دل دھڑکنا ہی بھول گیا

تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو سکوڑا اور اپنا ویژن صاف کرنے کی کوشش کی۔ میری نگاہ کیا دیکھ رہی تھی؟ سڑک سے پار، بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے وہی منحوس کالا کتا موجود تھا جسے چند ماہ پہلے میں لاہور میں دیکھ چکا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس کھڑکی کی طرف اور میری ہی جانب دیکھ رہا ہے۔ کیا یہ وہی کتا تھا؟ یا میری نگاہ دھوکا کھا رہی تھی؟ گلیوں میں سینکڑوں ایک جیسے کتے گھومتے پھرتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ کتے کی گردن کے قریب سفید دھبوں کا سرا بھی مل رہا تھا۔ وہ کتا یہاں کیسے پہنچ گیا؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح مسلسل میرے ذہن پر برسنے لگا۔ میں نے قمیص پہنی اور بٹن بند کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ قریباً نصف منٹ بعد میں سڑک پر تھا۔ کھمبے کے سامنے سے ایک بس گزر رہی تھی، بس گزر گئی تو کھمبا خالی نظر آیا۔ کتا وہاں نہیں تھا۔ میں بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ بمشکل پچیس تیس سیکنڈ کے اندر وہ یوں غائب ہوچکا تھا جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ دور دور دکھائی نہیں دیا۔ میں عجیب سنسنی خیز کشمکش کا شکار ہو کر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔

میرا دل گواہی دینے لگا کہ میری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا۔ یہ وہی سیاہ کتا تھا۔ وہی جسامت، وہی شکل، وہی آنکھیں...... کھڑکی کی طرف اس کے دیکھنے کا انداز مجھے یاد ہے۔ اور بدن میں دوڑتی ہوئی سنسنی میں اضافہ ہوگیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ کتا ابھی کہیں کھڑکی یا دروازے کے راستے اندر کمرے میں داخل ہوجائے گا اور ناقابل فہم نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

کاشف خود تو واپس نہیں آیا تاہم رات کے نو بجے کے لگ بھگ ہوٹل کے کمرے میں اس کا فون آگیا۔ "ہاں بھئی، کہاں رہے اب تک۔"

"کوٹھے پر گانا سن رہا تھا۔" وہ بھنا کر بولا۔ "الو کے! تیرے ہی کام میں لگا ہوا تھا بلکہ اب بھی لگا ہوا ہوں۔"

"ہاں کیا رپورٹ ہے؟"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "یار، یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا اس لئے فون کیا ہے تجھ کو۔"

"کچھ بکے گا بھی یا پہیلیاں بوجھوائے گا؟"

"میں پچھلے دو گھنٹے سے تیرے محبوب کی گلی میں ہی چکرا رہا ہوں۔" وہ ذرا آواز دبا کر بولا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ شاید گھر میں کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ہونے والا ہے۔ صحن میں دو لائٹس لگائی گئی ہیں، کچھ کرسیاں وغیرہ بھی اندر گئی ہیں، تمہارے انکل انوار صاحب گاڑی میں تیزی سے آجا رہے ہیں۔"

کاشی سے مختصر گفتگو کرنے کے بعد میں بھی ٹیکسی پکڑ کر انکل انوار کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک انوار صاحب کے گھر کے سامنے پانچ چھ کاریں رک چکی تھیں۔ گھر کے اندر خوب روشنی بھی نظر آرہی تھی۔ خیرو اور ایک دو دیگر ملازم تیزی سے بھاگ دوڑ کر رہے تھے...... کاشی حسب وعدہ ایک قریبی سنوکر کلب میں موجود تھا۔ میں سنوکر کلب سے باہر آگیا۔

"ہاں کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بڑی گہری سانس لے کر بولا۔ "یار جلال لگتا ہے کہ یہ لڑکی تیری قسمت میں نہیں ہے۔"

وہ بہت کم سنجیدہ ہوتا تھا لہٰذا اس کی سنجیدگی نے مجھے سمجھا دیا کہ مسئلہ گمبھیر ہے۔ میں نے اس سے تفصیل پوچھی تو وہ بولا۔ "آرزو کے گھر میں جو گہما گہمی نظر آرہی ہے، پتہ ہے کس چیز کی ہے؟"

"کس چیز کی؟"

"اس آدمی نے بتایا ہے کہ انوار صاحب کی بیٹی کا نکاح ہے اور میرے خیال میں انوار صاحب کی ایک ہی بیٹی ہے۔"

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ میری چھٹی حس پچھلے چند گھنٹوں سے مجھے جن اندیشوں کی طرف دھکیل رہی تھی، وہ اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے کاشف کا چہرہ دیکھتا جارہا تھا۔ محبت کا مرجھایا ہوا پودا دوبارہ ہرا ہونے سے پہلے ہی ایک بار پھر سوکھ گیا تھا، بلکہ شاید جڑوں سے ہی اکھڑ گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج آرزو کو مجھ سے دوبارہ چھین لیا گیا ہے۔

کاشف نے میرا کندھا دبا دیا اور بولا۔ "مجھے نہیں لگتا جلال کہ آرزو کے دل میں

تیرے لئے اتنی ہی جگہ ہے جتنی تیری دل میں اس کے لئے ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے یار! کہ میں تجھے مزید دکھی کرنے کے لئے لے آیا۔ اچھا ہوتا یہ سب کچھ ہماری بے خبری میں ہوتا۔"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "کاٹھ کے بندر! تو اپنا بوتھا اس طرح کا بنا رہا ہے۔ میری خراب قسمت کی وجہ سے تو اپنی شکل تو خراب مت کر........"

کاشف مجھے تفصیل سے بتانے لگا کہ سنوکر کلب کے مالک سے اس کی کیا ہوئی ہے۔ انوار صاحب اور ان کا گھرانہ لاہور کی طرح یہاں اس محلے میں بھی کم آ کسی حد تک پُراسرار ہی سمجھا جاتا تھا۔ آنٹی تابندہ اور آرزو یہاں بھی پردے کی سخ پابندی کرتی تھیں۔ بیٹی کے نکاح کی تقریب میں انوار صاحب نے محلے کے بس ایک قریبی افراد کو ہی بلایا تھا۔

کاشف نے کہا۔ "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آرزو کی شادی اسی پکی ع بندے سے ہو رہی ہے جو ہمیں گھر میں ملا تھا۔ انوار صاحب نے اس بڈھے کھڑ کو بڑا کر مخاطب کیا تھا۔"

"میرا اندازہ بھی یہی ہے۔" میں نے تائید کی۔

"یار........یار جلال! ہم کچھ کر نہیں سکتے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" نے کہا نہ جانے کیوں میرے تصور میں ایک بار پھر کالا کتا گھومنے لگا تھا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم انوار صاحب کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزر معصوم صورت گڈو ایک مہمان لڑکے کے پیچھے بھاگتا گیٹ سے نکلا اور بڑی سڑک طرف نکل گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے اندر سے مہمانوں کے ہنسنے اور پلیٹوں کے کھن کھنانے کی آواز آئی۔ دل پر عجیب سا بوجھ پڑ گیا تھا۔ گزرنے والے لمحے کے ساتھ یہ بوجھ دل کو دبا رہا تھا اور بھینچ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اچانک میرا دل کہ ایک تنہا تاریک کمرا ہو' ایک بستر ہو' میں بستر پر گر جاؤں' اپنا سر تکیے میں گھسیڑ لوں دل کا سارا بوجھ آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہادوں۔ کتنی شدت سے چاہا تھا نے آرزو کو اور کتنی سنگ دلی سے اس نے ٹھکرایا تھا مجھے۔ بیگانگی سی بیگانگی تھی' غفلت سی غفلت تھی۔ پر اتنی جلدی دوسری بار اس کی شادی۔ یہ بات بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ہم بوجھل قدموں اور بوجھل دلوں کے ساتھ ہوٹل واپس آگئے۔ مجھے کمرے میں چھوڑ کر کاشف باہر نکل گیا۔ کہنے لگا کہ کھلی ہوا میں ذرا گھومنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ واپس وہیں جارہا ہے جہاں سے آیا ہے۔ انوار صاحب اور ان کی بیٹی کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ میں اسے روکتا رہ گیا مگر وہ چلا گیا۔ مجھے تنہائی میسر آگئی تھی' دل کا ناقابل برداشت بوجھ ہلکا کرنے کے لئے میں نے اس تنہائی کا خوب فائدہ اٹھایا۔

غم و غصے کی شدت ذرا کم ہوئی تو ذہن بار بار آرزو کی اس نامعلوم مجبوری کی طرف جانے لگا جس نے اسے سات آٹھ ماہ کے اندر ہی دوبارہ دلہن بننے پر مجبور کردیا تھا اور دلہن بھی ایک ایسے شخص کی جو شکل اور عمر کے لحاظ سے کسی طرح بھی اس کے جوڑ کا نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آرزو کی یہ دوسری شادی بھی اس کے والد محترم کے اصرار اور نادر شاہی احکامات کے زیر سایہ انجام پائی ہے۔ وہ ان دونوں شادیوں میں بے حد فعال اور متحرک نظر آئے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات میں ایک طرح کی افراتفری اور ہلچل تھی اور یہ افراتفری و ہلچل اتنی نمایاں تھی کہ دیکھنے والے کو پہلی نگاہ میں نظر آجاتی تھی۔ جیسے کسی نادیدہ شخص نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہو اور ہر کام جلدی جلدی نپٹانے کی ہدایت کررکھی ہو۔

کاشف کی واپسی رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک مقامی دوست یوسف راجہ کی طرف گیا تھا۔ یوسف راجہ ہونہار صحافی تھا اور ایک معروف اخبار میں سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"کیا کرنے گئے تھے۔ اس کی طرف؟"

"بس ملنے گیا تھا۔"

"اتنی رات گئے تم بھاگم بھاگ اس سے ملنے کیوں چلے گئے؟"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "سچی بات یہ ہے جلال کہ میں اس سارے معاملے میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔ آرزو کی آناً فاناً دوبارہ شادی ہونا تھی' وہ تو ہو چکی' اس سلسلے میں اب

ہم کیا کرسکتے ہیں لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آرزو کی وہ کیا مجبوریاں تھیں جنہوں نے آرزو کی مرضی کے خلاف اسے تم سے دور رکھا۔"

"یار تم خوامخواہ شرلاک ہومز نہ بنو۔ میں اس سارے معاملے کو ہمیشہ کے لیے ٹھپ کر دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مجبوریوں اور مصلحتوں کی بات ہے' یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ مشرقی عورت کے ساتھ یہ سب کچھ تو روز ازل سے لگا ہوا ہے۔ کچھ مشرق کی بیٹی خود بھی غم پسند ہے باقی کسر اس کے حالات نے پوری کر دی ہے........"

"لیکن........"

"دیکھ میرے باپ!" میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس سارے قصے کو یہیں اس ہوٹل میں دفن کر دو اب........ میں بہت بھگت چکا ہوں' اب ہمت نہیں ہے مجھ میں........ یہ سب کچھ میں اب بھول جانا چاہتا ہوں........ پلیز!" میں نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا۔

وہ ساری رات میں نے سوتے جاگتے میں گزاری۔ صبح سویرے میں نے کاشف کو اٹھایا اور اس سے کہا کہ چلو لاہور کی تیاری کریں۔

وہ بڑبڑایا۔ "یار اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ آخر کرایہ دیا ہے ہوٹل کا سہ پہر دو بجے تک ہمارا حق ہے یہاں رہنے کا۔"

"میں حق کی بتی بنا کر گھسیڑ دوں گا تیرے نتھنوں میں........ چل اٹھ نکلیں یہاں سے۔"

"اچھا یار۔ ایک فون تو کر لینے دے راجہ کو۔ وہ کہے گا ایک دم بتائے بغیر نکل گئے۔"

"نہیں۔ فون لاہور جا کر کر لینا یا راستے سے کر لیں گے۔"

میرا دل ایک دم بیزار ہو گیا تھا اس شہر سے........ اس کی ہواؤں میں ایک دلہن کے جسم کی خوشبو تھی۔ اس کے سانسوں کی مہک اور اس کے زیور کی کھنک تھی۔ اور یہ دلہن آرزو تھی۔ جس کا دکھ خون کے ساتھ میری رگوں میں گردش کرتا تھا........ میں اب جلد از جلد اس دکھ کو رگ جاں میں چھپا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"اخبار صاحب۔" ہوٹل کے کمرے سے باہر ہاکر نے آواز لگائی۔

کاشف نے اخبار لے لیا اور یونہی صوفے پر بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک میں نے اسے بری طرح چونکتے دیکھا۔ اس نے غور سے کسی خبر پر نگاہیں جمائیں۔ چند سیکنڈ تک پڑھتا رہا۔ پھر لرزاں آواز میں بولا۔ "جج........ جلال یہ کیا لکھا ہے؟"

میں نے اخبار اس سے جھپٹ کر خبر دیکھی۔ ہاتھ جیسے یکایک ہزاروں وولٹ کے ننگے برقی تار سے چھو گیا تھا۔ سرخی کچھ یوں تھی۔ "شادی کی پہلی رات دلہا پراسرار طور پر قتل۔" ذیلی سرخیاں تھیں۔ "مقامی بزنس مین انوار صاحب کی اکلوتی بیٹی دلہن بنتے بنتے بیوہ ہو گئی۔"

"دلہن چیختی ہوئی کمرے سے نکلی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔"

"دلہا کی گردن کٹی ہوئی اور خون سارے بستر پر پھیلا تھا۔"

نیچے خبر کی تفصیل تھی۔ اس تفصیل کے مطابق کل رات بارہ بجے دلہن لے کے گھر پہنچنے والا دلہا رفیق صدیقی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ پراسرار طور پر قتل ہو گیا۔ دلہا کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور دلہن کے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔ حجلہ عروسی میں پھل کاٹنے والی ایک چھری بھی پائی گئی ہے جو خون آلود تھی۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقتول نے مرنے سے پہلے مزاحمت کی ہے۔ اس کے جسم پر خراشیں پائی گئی ہیں اور لباس بھی پھٹا ہوا تھا دلہا کی بہنوں کا کہنا ہے کہ یہ قتل ہے اور انہوں نے دلہن پر شبے کا اظہار کیا ہے۔

اس طویل خبر کو پڑھنے کے بعد میں اور کاشف سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہے۔ ہمارے جسم بے شک ساکت تھے مگر ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں........ آرزو کا دلہا ایک بار پھر اسے چھونے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ ان تمام واقعات میں پراسراریت کی جو لہر تھی وہ ایک دم بلند ہوتی محسوس ہوئی........ میرے ذہن میں آپوں آپ ایک کالے کتے کی شبیہ ابھری اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے کل رات کاشف سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے کاشف کو بتایا کہ کئی ماہ پہلے لاہور میں نظر آنے والا کتا میں نے سہ پہر کے وقت اس ہوٹل کی کھڑکی کے سامنے دیکھا ہے تو وہ میرے سر پر دوہتڑ مارے گا اور مجھے توہم پرست قرار دے کر کوسنا شروع کر دے گا لیکن اب وہ سارے خیالات مجھے ٹھوس حقیقت کی شکل میں نظر آنے

لگے تھے۔

میرے کہنے پر کاشف نے اسی وقت اپنے صحافی دوست راجہ کو فون کیا۔ وہ
پندرہ منٹ میں ہمارے پاس ہوٹل پہنچ گیا۔ راجہ پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ بال شانوں تک
رہے تھے۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی مگر وہ اکثر صحافیوں کی طرح منحنی نہیں تھا۔
مضبوط ہاتھ پاؤں والا نوجوان تھا۔ کاشف نے مجھے بتایا تھا کہ ایک فلمی تقسیم کار کی بہو
راجہ کا معاشقہ بھی چل رہا ہے۔

راجہ اس خبر سے پہلے ہی آگاہ ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں آرزو
اس لڑکی کی محبت کا اسیر ہوں۔ دیگر بہت سی باتیں بھی کاشف، راجہ کو بتا چکا تھا۔ کاشف
راجہ سے کہا۔ "تم اپنی اپروچ اور اپنے وسائل کے بارے میں بڑے دعوے کیا کر
ہو۔ یہ تمہاری آزمائش کا وقت ہے۔ ہمیں اس خبر کی ساری تفصیل اور پس منظر د
ہے۔"

راجہ نے اسی وقت ہمیں خدا حافظ کہا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ ا
کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ اس دوران میں ہم ہوٹل کے اندر ہی رہے
اندوہناک خبر کے بارے میں تبصرے کرتے رہے۔ راجہ واپس آیا تو اس کے پاس
سنسنی خیز معلومات اور تازہ خبریں موجود تھیں۔ سنسنی خیز معلومات میں سب سے اہم
ایک تصویر تھی۔ یہ تازہ ترین تصویر آج کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی تھی حالانکہ
بڑی اہم تصویر تھی۔ یہ تصویر فوٹوگرافر نے موقعہ واردات پر ہی کھینچی تھی۔ زاویہ ایسا
کہ بستر پر پڑے مقتول کا سر تکیے پر تھا۔ قمیض کا گریبان ادھڑا ہوا تھا، مسہری کی
خوبصورت لڑیاں اس کے سینے پر ٹوٹی پڑی تھیں اس کا ایک بازو مسہری سے نیچے لٹک
تھا۔ مقتول کی گردن کا زخم دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی تیز دھار آلے سے نہ
آیا۔ گردن سے جیسے ایک لوتھڑا ہی غائب ہو گیا تھا۔

"یہ چاقو وغیرہ کا زخم نہیں ہے۔" راجہ نے یقین سے کہا۔

"پھر کس کا ہے؟"

"صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تو کند آلے سے ضربیں لگائی گئی ہیں، مثلاً کلہاڑی وغیرہ
پھر......."

"یا پھر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات سمجھ میں آنے والی تو نہیں، مگر یہ تصویر دیکھ کر ذہن خواہ مخواہ اس طرف
رہا ہے۔" راجہ نے کہا۔ "پھر ذرا توقف سے بولا۔ "یوں لگتا ہے جیسے کسی جانور نے اس
خص کا نرخرہ چبا ڈالا ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے۔ کوئی بھیڑیا چیتا وغیرہ۔" کاشف نے تنک کر کہا۔

"چیتا بھیڑیا تو نہیں مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ مقتول رفیق صاحب ویٹرنری ڈاکٹر
تھے۔ ان کے گھر میں تین مریض کتے بندھے تھے، اس کے علاوہ بندر بلیاں وغیرہ بھی
ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہی کوئی جانور خطرناک ہو۔ وہ رات کو کھلا رہ گیا ہو، کمرے
یں گھس کر اس نے ڈاکٹر صاحب کا کام تمام کر دیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس سلسلے میں اہم ترین بیان خود آرزو کا ہوگا۔ واقعہ کے وقت
صرف وہی متوفی کے پاس تھی۔"

"اس کے بیان کی کاپی بھی میں نے حاصل کر لی ہے۔" راجہ نے جوش سے کہا۔
اس نے ایک فوٹو اسٹیٹ کاغذ ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ یہ آرزو کا بیان تھا جو
تفتیشی افسر نے موقعے پر حاصل کیا تھا۔ اس پر آرزو کے دستخط بھی موجود تھے۔ یہ میرے
جانے پہچانے دستخط تھے۔ اپنی بھتیجی رومی کی کاپیوں پر سرخ روشنائی سے کئے گئے یہ
خوبصورت دستخط میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ آج یہ دستخط مجھے ایک منحوس دستاویز پر دیکھنے پڑ
رہے تھے۔ زندگی، حالات کے تھپیڑے کھاتی کہاں سے کہاں چلی آئی تھی۔

آرزو کا بیان کچھ اس طرح تھا۔ "میرے شوہر رفیق صدیقی میرے بستر تک آئے۔
انہوں نے مجھے مبارک باد دی۔ پھر میرا گھونگھٹ اٹھایا اور منہ دکھائی کے طور پر ہیرے کی
ایک انگوٹھی مجھے پہنائی۔ کچھ دیر بعد میں اپنے بھاری بھرکم کپڑے بدلنے کے لئے باتھ
روم میں چلی گئی قریباً دس منٹ بعد میں نائٹی پہن کر باہر نکلی۔ مجھے عجیب سی غراہٹ سنائی
دی۔ دوسری چیز جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ کمرے میں اندھیرا تھا، حالانکہ جب میں
کپڑے بدلنے کے لئے گئی تھی۔ ٹیبل لیمپ روشن تھا اور اس کی روشنی بستر پر نیم دراز
میرے شوہر پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باتھ روم کے اندر جلنے والی لائٹ کی
روشنی میں مجھے دروازے کا ایک حصہ اور سوئچ بورڈ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے فوراً

کمرے کی ٹیوب لائٹ آن کردی' میرے شوہر آخری سانس لے رہے تھے' آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ خون کے سبب ان کے سینے سے ساری قمیض بھیگ گئی تھی خون کے چھینٹے سائیڈ ٹیبل تک بھی پہنچ رہے تھے۔ میں نے دیوانہ وار ان کو جھنجھوڑا دروازے کی کنڈی کھولی اور چیختی ہوئی باہر نکل آئی' میری بڑی بھاوج نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پوچھا کیا ہوا ہے؟ میں جواب دینے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئی اس کے بعد مجھے ایک دوسرے کمرے میں ہوش آیا۔"

آرزو کے بیان کے بعد سب سے اہم بیان آرزو کی بڑی بھاوج سلمیٰ صدیقی کا تھا اس نے کہا کہ اس کا کمرا آرزو کے کمرے کے ساتھ ہی ہے۔ وہ بچے کا دودھ گرم کرنے کے لئے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اس نے آرزو اور رفیق کے کمرے سے اونچی آواز بولنے کی صدا سنی' پھر یوں لگا جیسے کوئی کشتی کر رہا ہو' ٹیبل لیمپ گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی ایک کرسی دیوار سے ٹکرائی' اس کے کچھ ہی دیر بعد آرزو چیختی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔ اس نے گھر سے باہر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر روک لیا اور یہ تیورا کر گر پڑی۔ ہم بھاگ کر کمرے میں داخل ہوئے پھل کاٹنے والی خون آلود چھری دہلیز کے پاس ہی پڑی تھی۔

ان دونوں بیانات میں کافی تضاد پایا جاتا تھا۔ آرزو نے کمرے میں ہونے والی جدوجہد اور دھاچوکڑی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید یہ شور باتھ روم میں اس تک پہنچا نہ ہو تھا۔ یا وہ اس پر غور نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے بیان میں آرزو نے چھری کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ یہ بتایا تھا کہ وہ کیسے خون آلود ہوئی۔ آرزو کی بھاوج سلمیٰ کا بیان آرزو کو اس کیس میں مشکوک بنانے کی ایک واضح کوشش تھی۔

آرزو کے دوسرے شوہر رفیق صدیقی کی کٹی پھٹی گردن والی تصویر میرے سامنے تھی اور میرے ذہن میں ایک بار پھر "کالا کتا" زور زور سے چیخ رہا تھا۔ اس منحوس کتے اس خونی واردات سے صرف دو گھنٹے پہلے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ساری دلیل مجھے جھٹلا دیتی لیکن میں اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ میرے اندر سے کوئی پکار پکار کر اعلان کر رہا تھا کہ ویٹرنری ڈاکٹر رفیق صدیقی کی المناک موت اور اس پُراسرار کتے میں کوئی تعلق ہے........ اور عین ممکن تھا........ جی ہاں عین ممکن تھا کہ اس سے پیشتر آرزو کے

پہلے دلہا نجیب احمد کی موت سے بھی اس کتے کا کوئی تعلق ہو۔ نجیب کی موت کا سبب ایک روڈ ایکسیڈنٹ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ تاریکی میں کسی چیز کو بچاتے ہوئے نجیب اور اس کے دوست کی موٹر سائیکل ایک تانگے سے جا ٹکرائی۔ وہ کیا چیز تھی جس کو بچانا نجیب کی موت کا بہانہ بن گیا........ کہیں وہ بھی تو ایک کالا کتا نہیں تھا؟ میرا دماغ بھٹی کی دہک رہا تھا۔

راجہ نے بتایا کہ آرزو کے گھر والے اسے واپس لے آئے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے گل مہر کالونی والے گھر میں ہے۔ صبح اسے دو تین بار غشی کا دورہ پڑا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر گھر میں اسے دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ اسی دوران میں پولیس کا تفتیشی افسر بھی آرزو کا مزید بیان لینے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے واپس بھیج دیا اور کہا کہ ابھی مریضہ کی حالت ٹھیک نہیں........ کاشف نے راجہ کو مزید معلومات کے حصول کے لئے واپس بھیج دیا۔ شام سات بجے کے لگ بھگ راجہ کی طرف سے ایک اور اہم اطلاع ملی۔ یہ بڑی سنگین اطلاع تھی۔ راجہ نے بتایا کہ آرزو کے والد صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور وہ بے ہوشی کی حالت میں ایک مقامی پرائیویٹ کلینک میں پہنچائے گئے ہیں۔ راجہ نے کلینک کا نام "واجد کلینک" بتایا۔

میں نے کاشف سے مشورہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ مجھے انکل انوار کی نازک حالت کے پیش نظر کلینک پہنچنا چاہئے۔ میں نے کاشف کو وہیں ہوٹل میں چھوڑا اور کلینک آ گیا........ پریشان صورت آرزو اور آنٹی تابندہ کے سوا مجھے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ آنٹی کلینک کے طویل برآمدے میں مصلیٰ بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ آرزو بےقراری سے ٹہل رہی تھی وہ حسب معمول پردے میں تھی بس اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس دوران میں ملازم خیرو دوڑتا ہوا پہنچا' اس کے ہاتھ میں کسی ٹسٹ کی رپورٹ وغیرہ تھی۔ آرزو نے یہ رپورٹ لی اور "انتہائی نگہداشت یونٹ" میں داخل ہونا چاہا۔ ڈیوٹی پر موجود ملازم نے آرزو کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اسے قائل کر کے اندر جانے میں کامیاب ہو گئی۔

اتنے میں آنٹی تابندہ نے بھی سلام پھیر لی تھی۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکیں پھر اٹھ کر میرے قریب آ گئیں۔ شدت غم سے ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ انکل انوار کی

بیماری کا مجھے کیسے پتا چلا اور میں کیونکر یہاں پہنچا۔ چھوٹتے ہی بولیں۔ "بیٹا جلال' تم نے اچھا کیا کہ آگئے۔ ہم سخت مصیبت میں ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی توقیر دوپہر کو ہمارے ساتھ ہی یہاں اسپتال آئے تھے۔ ان کی بیوی سیڑھیوں سے گر کر شدید زخمی ہوگئی ہے۔ انہیں موبائل فون پر اطلاع ملی ہے اور وہ فوراً واپس پنڈی چلے گئے ہیں۔ اب ادھر کوئی بھی نہیں ہے ہمارے ساتھ۔ ڈاکٹر بار بار دوائیں منگوا رہے ہیں۔ خون کے دو تین ٹسٹ باہر سے ہوئے ہیں۔" ان کی آواز رندھ گئی بولیں۔ "ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ...... آپریشن کے لئے انہیں راولپنڈی اسلام آباد منتقل کرنا پڑے۔"

میں نے کہا۔ "آنٹی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ آپ بے فکر ہوجائیں آپ...... انشاء اللہ سب اچھا ہوجائے گا۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اسی دوران میں آرزو دوڑی ہوئی باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں پرچی تھی۔ "امی! یہ آلہ منگوایا ہے ڈاکٹروں نے۔"

میں نے آرزو کے ہاتھ سے پرچی جھپٹ لی اور قریبی مارکیٹ کی طرف بھاگ گیا۔ یہ آلہ ایک تار اور بیٹری وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اس کی مدد سے دل کو غالباً دھڑکنے میں مدد دی جاتی تھی۔ آلے کی قیمت چار پانچ ہزار کے قریب تھی۔ میری جیب میں صرف ڈیڑھ ہزار روپیہ تھا۔ میں اپنی قیمتی راڈو گھڑی دکاندار کے پاس رکھنے کو تیار تھا' تاہم اس نے بھروسا کرتے ہوئے مجھے یہ آلہ دے دیا۔ میں نے دکان ہی سے کاشف کو فون کیا اور اسے فوری طور پر کلینک پہنچنے کو کہا۔

"کیش کی ضرورت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں سخت ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ڈاکٹروں نے گردن کے قریب سے انوار صاحب کی کچھ رگیں کھولیں اور ایک چھوٹے سے آپریشن کے بعد آلے کا تار ان کے دل تک پہنچا دیا۔ بعد ازاں اس کے ساتھ بیٹری منسلک کردی گئی۔ وہ بدستور سی سی یو میں تھے۔ صرف ایک فرد کو ان کے پاس بیٹھنے کی اجازت تھی۔ آرزو ان کے بیڈ سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ رنج و الم کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ میں آنٹی تابندہ اور خیرو بار بار شیشوں سے جھانکتے تھے اور انوار صاحب

کی دم بدم بدلتی حالت دیکھتے تھے۔ کسی وقت ان کی سانس اکھڑ جاتی اور سینہ دھونکنی کی طرح پھولتا پچکتا' کسی وقت وہ ہموار سانس لینے لگتے۔ ان انتہائی تشویش ناک لمحوں میں آرزو اپنا پردہ وغیرہ بھول گئی تھی۔ میں پہلی بار اسے گھر سے باہر یوں کھلے منہ دیکھ رہا تھا۔ جو اسے دیکھتا تھا دیکھتا رہ جاتا تھا۔ اتنے حسین "اٹنڈنٹ" کو دیکھ کر کئی نوجوان ڈاکٹر انوار صاحب کے اردگرد چکرانے لگے تھے۔ غالباً زندگی اور موت کی کشمکش کے ان سنگین لمحوں میں بھی ان کی جمالیاتی حس کند نہیں پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد کاشف بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے پاس کریڈٹ کارڈ کے علاوہ معقول کیش بھی موجود تھا۔ ہم چاروں نے وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹی...... کوئی واضح صورت حال بھی سامنے نہیں آرہی تھی۔ کبھی معلوم ہوتا کہ انوار صاحب کو اسلام آباد لے جانا پڑے گا' ہم ایمبولینس وغیرہ کا انتظام کرنے لگتے پھر معلوم ہوتا کہ وہ اسلام آباد نہیں جارہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد پھر اسلام آباد کی بازگشت سنائی دینے لگتی...... میرے ایک انکل فوج میں ڈاکٹر کرنل تھے اور ایبٹ آباد میں ہی مقیم تھے۔ میں نے راتوں رات ان سے رابطہ کیا اور انہیں کلینک میں وزٹ کرنے پر آمادہ کرلیا۔ ان کی آمد سے انکل انوار ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہر گئے۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی اسی طرح گزرے۔ انکل انوار کی طبیعت کبھی سنبھل جاتی تھی کبھی پھر وہ ڈانواں ڈول ہونے لگتے تھے۔ بہرحال وہ شدید ترین خطرے سے نکل آئے تھے۔ اس دوران میں دوچار بار آرزو سے بھی میری بات ہوئی۔ اس نے کوئی دوا وغیرہ لانے کے لئے کہا یا کوئی اور کام بتایا۔ شام کے وقت وہ سی سی یو سے باہر آئی اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ "جلال صاحب! گڈو کو ہم پڑوسوں کے ہاں چھوڑ آئے ہیں۔ وہ سخت پریشان ہوگا۔ اگر ہوسکے تو آپ کہہ سن کر امی کو گھر لے جایئے۔ گڈو کو تسلی ہوجائے گی اور امی کو بھی ذرا آرام مل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "آپ بھی تو تھکی ہوئی ہیں اور بیمار بھی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ دونوں کچھ دیر کے لئے گھر چلی جائیں۔ میں اور خیرو یہاں موجود ہیں۔ کاشف بھی ہے۔ ایسے بھی اب فکر کی بات نہیں۔ انکل بہتر ہو رہے ہیں۔"

"نہیں...... میں یہیں رہنا چاہتی ہوں' ابو کے پاس۔ پلیز آپ امی کو لے جائیں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

"کوشش نہیں کرنی' لے جانا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ آپ کی بات مان جائیں گی۔"

وہ سوگوار حسن کا شاہکار دکھائی دیتی تھی۔ اس کی غم میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر میرا دل کٹ سا گیا۔

میں آنٹی تابندہ کے پاس آگیا اور انہیں قائل کرنے لگا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے گڈو کے پاس گھر چلی جائیں۔ وہ پہلے تو انکار کرتی رہیں پھر مان گئیں' لیکن اس شرط پر کہ وہ رات دس گیارہ بجے تک واپس آجائیں گی۔

کاشف نے ایک مقامی دوست کے تعاون سے گاڑی بھی حاصل کرلی تھی' ا... ٹویوٹا گاڑی ہمارے استعمال میں تھی۔ میں نے آنٹی تابندہ کو گاڑی میں بٹھایا اور لے کر ... کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ آگے جاکر آنٹی نے کہا کہ میں گاڑی بائیں رخ پر موڑ لوں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم شملہ پہاڑی کی طرف جارہے تھے۔ یہ راستہ گل مرگ کی طرف ہرگز نہیں جاتا تھا۔ بہرحال میں خاموش رہا۔ جو بھی صورت حال تھی اسے جلد سامنے آجانا تھا۔ آنٹی نے درختوں کے درمیان ایک قبرستان کے قریب گاڑی رکوائی۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں دور تک قبریں نظر آتی تھیں اور ان پر رنگ برنگے پتھر... رہے تھے۔ ان علاقوں میں قبروں کو بڑی خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے' ان کے کتبے بڑے اہتمام سے لکھے جاتے ہیں۔

آنٹی کے کہنے پر میں نے گاڑی لاک کی اور قبرستان کے اندر سے گزرتا ہوا ایسی جگہ پہنچ گیا' جہاں درختوں کے جھنڈ آپس میں سرجوڑے کھڑے تھے۔ ہم پتھروں سے بنی ہوئی ایک طویل کوٹھری میں داخل ہوئے۔ ایک باریش شخص نے ہمیں کچے فرش پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ چند فٹ کی دوری پر ایک سبز دروازہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہمیں اس دروازے کے اندر جانا ہے' مگر ہم سے پہلے کوئی اور بھی دروازے کی دوسری طرف موجود تھا۔

ابھی تک میں نے تابندہ آنٹی سے نہیں پوچھا تھا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں' انہوں نے بھی بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ چار پانچ منٹ بعد ایک لڑکی ایک

عمر عورت کے ساتھ چادر میں لپٹی لپٹائی باہر نکلی اور پھر کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔ اب باریش شخص نے ہمیں سبز دروازے کے اندر گھسنے کی ہدایت کی۔ تابندہ آنٹی اٹھ کر اندر جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ سبز دروازہ کھلا اور ایک طویل سفید داڑھی والا نہایت نورانی چہرہ نظر آیا۔ اس عمر رسیدہ بزرگ گلے میں لکڑی کے موٹے دانوں کی تسبیح تھی اور انہوں نے سبز رنگ کا ایک کڑھائی دار چغہ پہن رکھا تھا۔ تابندہ آنٹی کو دیکھتے ہی بزرگ کا نورانی چہرہ غضب سے سرخ ہوگیا۔ آنکھوں میں آگ سی دہکنے لگی تھی۔ انہوں نے ایک دم آنٹی کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ گرج کر بولے۔ "اب کیا لینے آئی ہو یہاں؟"

آنٹی تابندہ نے گھگیائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا کوئی قصور نہیں شاہ جی!"

"تو پھر کس کا قصور ہے؟" بزرگ نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ آنٹی تابندہ تو کجا در و دیوار بھی دہل گئے۔

بزرگ پلٹ کر دوبارہ سبز دروازے میں داخل ہونے لگے تو آنٹی نے اٹھ کر ان کے قدم پکڑ لئے۔ "نہیں شاہ جی' خدا کے بعد ہمیں آپ ہی کا آسرا ہے۔ آپ نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا تو ہم کہیں کے نہیں رہ جائیں گے۔ خدا کے لئے کچھ کریں شاہ جی۔"

"اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ جاکر اپنے اس خصم سے کہو کہ کچھ کرے۔ اگر یہ بلا ٹال سکتا ہے تو ٹالے۔"

"وہ کیا کریں گے شاہ جی' وہ تو خود بستر سے لگے ہوئے ہیں۔ بے ہوشی کی حالت میں اسپتال کے اندر پڑے ہیں۔ میں تو........ ان کے لئے بھی آپ سے دعا منگوانے کے لئے آئی ہوں........"

"میں نے کہا ہے ناں کہ میں اب کچھ نہیں کرسکتا۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہنا ہے۔ بس اب تم جاؤ یہاں سے۔" سبز پوش بزرگ نے اپنے حجرے کی طرف قدم بڑھائے۔

تابندہ آنٹی ان کے پاؤں سے چمٹ گئیں۔ کہنے لگیں۔ "اتنی بڑی سزا مت دیں شاہ جی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے' میں نے ہر طرح انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ ہاتھ جوڑے تھے منتیں کیں تھیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں کمزور عورت ہوں۔ التجا تو کرسکتی ہوں' کسی کو زبردستی روک نہیں سکتی ہوں۔ بلکہ میں تو زیادہ التجا بھی نہیں کرسکتی

تھی۔ آپ کو پتہ ہے کہ انہیں دل کی تکلیف ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں زیادہ غصے
آگئے تو خود کو کچھ کر نہ بیٹھیں۔ ڈاکٹروں نے بھی یہی کہا تھا کہ انہیں پریشانی
بچائیں۔"

"تو پھر تم نے بچالیا اسے پریشانیوں سے۔" شاہ جی نے طنز سے پوچھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں شاہ جی۔ ہونی ہو کر رہتی ہے۔"

"اب تم اپنی نادانی اور غفلت کو ہونی کا نام دے رہی ہو۔ اگر ہونی ہو کر رہتی
تو پھر جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے اسے ہونے دو۔ میرے پاس بھاگی بھاگی
آئی ہو۔"

"آپ کرنی والے ہیں شاہ جی۔ آپ ہونی کو بھی ٹال سکتے ہیں۔ آپ کو خ
واسطہ ہمیں یوں بے آسرا نہ چھوڑیں۔"

آنٹی کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھ
نہیں جا رہی تھی۔ مگر میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ سفید ریش بزر
کچھ دیر تک تذبذب کے عالم میں آنٹی کو دیکھتے رہے جو ایک لرزتی کانپتی گٹھڑی کی
ان کے پاؤں میں پڑی تھیں۔ پھر انہوں نے گرج کر کہا۔ "چلو ابھی بیٹھو اپنی جگہ پر
تمہیں بعد میں بلاؤں گا۔"

آنٹی جلدی سے اٹھ کر میرے قریب آبیٹھیں۔ وہ اپنی ہچکیاں روکنے کی بھ
کوشش کر رہی تھیں۔ آنٹی جس بزرگ کو شاہ جی کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں وہ ایک
نوجوان کو لے کر اندر چلے گئے اور سبز دروازہ بند ہو گیا۔ میں صورت حال کو سمجھ
کوشش کر رہا تھا اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے کرب ناک انتظار
بعد تابندہ آنٹی کو اندر بلایا گیا' دروازہ ایک بار پھر سے بند ہو گیا۔

میں بڑا مضطرب بیٹھا تھا اور بے چینی سے آنٹی کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔
سفید چغوں والی دو عورتیں بھی آنٹی کے بعد حجرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ پھر ان
سے ایک کچھ دیر بعد باہر نکلی اور دو منٹ بعد کوئلوں کی دہکی ہوئی انگیٹھی لے کر اند
گئی۔ پتہ نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔ کبھی کسی کے بہت زور سے بولنے کی آواز
کبھی گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی پڑی۔ قریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ کوٹھڑی

باہر پہاڑی قبرستان گہری تاریکی میں لپٹ چکا تھا۔ سفید چغے والی عورت باہر نکلی تو میں نے
ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ حجرے کے اندر خوشبودار دھواں تھا۔
میں نے اندازہ لگایا کہ کسی چیز کی دھونی رچائی گئی ہے۔ میری نظر تابندہ آنٹی پر پڑی اور
میں بھونچکا رہ گیا۔ تابندہ آنٹی جو نہایت سنجیدہ اور باپردہ خاتون تھیں' ننگے سر' ننگے پاؤں
حجرے کی چٹائی پر کھڑی تھیں۔ ان کے پاؤں میں گھنگھرو تھے اور کلائیوں میں بھی۔ سر کے
بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بازو اٹھا کر ناچنے کی بھونڈی سی کوشش کر رہی تھیں۔ انداز
سے اناڑی پن اور جھجک صاف نمایاں تھی۔ غالباً وہ دھمال ڈالنے کی سعی کر رہی تھیں۔ ان
کے ساتھ سفید چغے والی دوسری عورت بھی تھی۔ اس نے بھی کلائیوں اور ٹخنوں پر
گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دھمال ڈالنے کے عمل میں آنٹی تابندہ کی مدد
کر رہی تھی۔ میں ان دونوں خواتین کی بس ایک مختصر جھلک ہی دیکھ پایا اس کے بعد
دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔

میرے دماغ میں ہوائیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ آنٹی کلینک
سے گھر جانے کے لئے نکلی تھیں اور اچانک غیر متوقع طور پر یہاں چلی آئی تھیں۔ اب وہ
اپنی ساری تمکنت کو ایک طرف رکھ کر اور سارے وقار کو پس پشت ڈال کر ناچنے کی بے
ڈھنگی کوشش کر رہی تھیں۔

آنٹی کی واپسی قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ حجرے سے باہر نکلنے سے پہلے انہوں
نے اپنا حلیہ مکمل طور پر درست کر لیا تھا۔ لباس درست تھا' چہرہ حسب معمول چادر کے پلو
میں چھپا ہوا تھا' وہ نارمل نظر آتی تھیں' مگر ان کی گردن پر بہتے ہوئے پسینے سے چپکے ہوئے
بال اور ان کی آنکھوں کی ہیجانی کیفیت گواہ تھی کہ وہ ایک ہیجانی عمل سے گزری ہیں۔

انہوں نے مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔ "آؤ جلال! چلیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آنٹی کے ہاتھ میں کچھ تعویذ دبے ہوئے تھے
اور ان کے ہونٹ مسلسل کچھ پڑھنے والے انداز میں جنبش کر رہے تھے۔ ایک عجیب سے
خوف کے سائے تھے ان کے خوبصورت چہرے پر......... ایک ایسا خوف جو ان کے دل کی
گہرائیوں میں اترا ہوا تھا اور ان کو ایک معمول کی طرح اپنے اشاروں پر چلا رہا تھا۔ ہم
قبرستان کی وحشت ناک تاریکی سے گزرتے ہوئے گاڑی تک واپس پہنچ گئے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم گھر میں تھے۔ پڑوسی گڈو کو لے آئے تھے۔ وہ ماں سے چمٹ کر بیٹھ گیا تھا اور سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آس پاس کی دو تین عورتیں آئیں اور آنٹی اور انکل انوار کا حال چال پوچھ کر چلی گئیں۔ گڈو مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ میں اچانک دوبارہ کہاں سے آگیا ہوں۔ میری موجودگی اسے سہارا دے رہی تھی۔ آنٹی تعویذ لے کر آئی تھیں ان میں سے ایک انہوں نے گڈو کے بازو پر باندھ دیا' اور ایک مجھے دے دیا تاکہ میں اپنے بازو پر باندھ لوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تعویذ لے لیا۔ دو چار تعویذ تابندہ آنٹی نے دروازوں کی چوکھٹوں سے لٹکا دیئے۔ یہاں پہلے بھی کچھ تعویذ وغیرہ جھول رہے تھے۔

آنٹی کھانا پکانا چاہ رہی تھیں مگر میں گاڑی پر گیا اور پکا پکایا کھانا لے آیا۔ ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ انکل کی بیماری مجھے اچانک ان لوگوں کے کتنا قریب لے آئی ہے۔ چند دن پہلے میں یہاں آیا تھا تو ایک عجیب طرح کی سرد مہری سے میرا استقبال ہوا تھا۔ مگر آج صورت حال مختلف تھی۔ آنٹی نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "جلال بیٹا! اس مشکل وقت میں تم نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے' ہم اسے بھول نہیں سکیں گے۔"

میں نے کہا۔ "آنٹی' آپ بیگانوں سی باتیں مت کریں۔ میں آپ کے دکھ میں پورے خلوص کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں...... میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے بتائیں...... پلیز۔"

وہ روہانسی ہو کر بولیں۔ "میں کیا بتاؤں بیٹا؟"

"وہ سب کچھ جو آپ پر بیت رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شاہ جی کے ڈیرے پر میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ میرے دماغ میں کھلبلی مچا رہا ہے۔ وہ سب کیا تھا آنٹی؟"

وہ صوفے کی پشت سے ٹک گئیں۔ آنسو ایک دم ان کے رخساروں پر دھاروں کی صورت بہنے لگے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پھر انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ان دیکھی چیزوں پر یقین رکھتے ہو۔ میرا مطلب ہے وہ چیزیں جو نظر تو نہیں آتیں مگر ہوتی ہیں۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پایا؟"

"بھوت پریت...... آسیب...... ہوائی چیزیں......" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں نے جواب دیا۔

"میں نے پیرا سائیکالوجی پڑھی ہے' روحانیت میں بھی گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں سارے معاملات کو کسی اور نظر سے دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے آس پاس ضرور کچھ ایسا ہے جس پر ابھی ہماری نگاہ نہیں پڑی...... آپ یوں کہہ سکتی ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے علم کے دائرے سے ابھی باہر ہے۔"

انہوں نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ انہوں نے آنسو پونچھے' اٹھ کر ایک ادھ کھلی کھڑکی کو بند کیا اور دوبارہ میرے پاس بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "جلال بیٹا' شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ...... یہ تیسری بار ہے۔"

"کک...... کیا مطلب؟"

"یہ تیسری بار ہے جب آرزو کا شوہر شادی کے فوراً بعد ہلاک ہو گیا ہے۔"

میرے سر پر جیسے بم پھٹ گیا تھا۔ میں حیران نظروں سے آنٹی تابندہ کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

"ہاں بیٹا! میں غلط نہیں کہہ رہی اور اس وقت اپنے پورے ہوش حواس میں بھی ہوں۔ یہ تیسری مرتبہ ہے کہ میری بیٹی دلہن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہوئی ہے۔"

وہ رونے لگیں۔ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ بولیں۔ "جلال! آرزو کی پہلی شادی آج سے کوئی ڈھائی سال پہلے ہوئی تھی۔ ہم اس وقت حیدر آباد میں ہی تھے...... لیکن ٹھہرو۔" انہوں نے خود ہی اپنی بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں بالکل شروع سے۔"

چند لمحے توقف کرکے انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب آرزو فرسٹ ایئر میں تھی۔ یہ گھر کی اوپر والی منزل کی ایک گیلری میں سوتی تھی۔ وہیں رات کو دیر تک پڑھتی رہتی تھی۔ اچانک اس نے ڈرنا شروع کر دیا۔ رات کو ایک دم اٹھتی اور چیخنے لگتی ایک دو بار یوں بھی ہوا کہ پڑھتے پڑھتے ایک دم اسے شدید خوف نے

گھیر لیا اور یہ بھاگ کر میرے پاس آگئی۔ ہم نے بہت پوچھا کہ بھئی کس بات سے
ہو؟ وہ یہی جواب دیتی کہ کسی بات سے نہیں' بس مجھے ڈر لگتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اب
ڈرنے لگتی ہوں' ہر شے سے خوف آنے لگتا ہے۔ میں نے اسے کچھ پڑھنے کے لئے
خود بھی پڑھ کر اس پر پھونکنے لگی........ بہت دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس نے گیارہ
دی اور رات کو میرے کمرے میں ہی سونے لگی۔ بس پڑھنے کے لئے کسی وقت
میں چلی جاتی تھی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میں اسے اپنے سامنے بٹھا کر سر میں
رہی تھیں۔ میں نے اس کے بالوں کو گردن پر سے اٹھایا تو گردن کے پچھلے حصے
نشان دیکھ کر چونک گئی۔ یہ چھوٹا سا سرخی مائل نشان انسان کے ہاتھ سے ملتا جلتا تھا
کسی شخص نے کوئی چیز پکڑنے کے لئے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پوری طرح کھول
ہوں۔ نشان واضح نہیں تھا۔ اس کا سائز آٹھ آنے کے سکے جتنا ہوگا میں غور سے
عجیب نشان کو دیکھتی رہی۔ میں اس کے بارے میں آرزو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی
بڑی ذہین ہے۔ میرے انداز سے ٹھٹک گئی' پوچھنے لگی' امی آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟ م
اپنی طرف سے بات گول کردی مگر وہ اس نشان کے بارے میں جان گئی۔ آئینے کے
کھڑے ہو کر ایک چھوٹے آئینے کی مدد سے اس نے اپنی گردن کا پچھلا حصہ دیکھ لیا
نشان کو انسانی ہاتھ کی شکل میں وہ بھی فوراً پہچان گئی۔ میں نے اسے تسلی و تشفی دی
کچھ نہیں ہے۔ ایسے داغ دھبے جلد پر آہی جاتے ہیں۔ بعض اوقات ہم ان دھبوں
خاص شکل میں دیکھنے لگ جاتے ہیں........ میں اکثر آرزو کے سر میں تیل لگاتی یا
کنگھی وغیرہ کرتی تھی۔ اس واقعے کے بعد میں اکثر اس کی گدی پر موجود یہ نشان
لگی۔ یہ نشان آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا۔ نشان کا سرخی مائل رنگ بھی اب باقی جلد
علیحدہ بالکل صاف پہچانا جاتا تھا۔ دوسری طرف آرزو کا گاہے گاہے ڈر جانا بھی جاری
وہ بے وجہ ڈرتی تھی۔ ڈر کا کوئی سبب نہیں تھا' کوئی شکل نہیں تھی۔ بس وہ کہتی تھی
ڈر لگتا ہے۔ بھئی کس چیز سے لگتا ہے؟ کیوں لگتا ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں تھا
پاس........ انہی دنوں میں نے اپنی بڑی بہن سے ان واقعات کا ذکر کیا۔ بڑی بہن
کہ ایک اللہ والے یہاں حیدر آباد میں آئے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں ان سے ملواتی
وہ تعویذ وغیرہ لکھ کر دیں گے انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا........ آرزو کے

اور ذہن کے ہیں۔ وہ ان باتوں کو بالکل نہیں مانتے۔ میں ان سے چوری چھپے آرزو کو لے
کر بہن کے گھر گئی اور پھر وہاں سے ہم ان بزرگ کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ بزرگ یہی شاہ
جی تھے جن کے پاس کچھ دیر پہلے ہم گئے تھے۔ وہ ان دنوں اپنے ایک خاص عقیدت مند
کی خاطر حیدر آباد آئے ہوئے تھے۔ اس عقیدت مند کا بیٹا موٹر سائیکل کے حادثے میں
زخمی ہوگیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی اور جسم کا ایک حصہ بالکل سوکھ کر
اور مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ شاہ جی کے علاج سے وہ لڑکا حیرت انگیز طور پر اپنے مردہ جسم کو
ہلانے جلانے لگ گیا تھا اور بھی کئی مایوس مریضوں کو شاہ جی کے ہاتھ سے شفا ہوئی تھی۔
میں اور آرزو شاہ جی سے ملیں اور انہیں ساری صورت حال بتائی۔ شاہ جی نے آرزو کی
گردن کے پیچھے کا سرخ نشان بھی دیکھا۔ وہ ایک دم بہت سنجیدہ اور خاموش نظر آنے لگے
تھے۔ انہوں نے مجھ سے اور آرزو سے چند سوال پوچھے پھر آرزو کے سر پر پیار دے کر
انہوں نے اسے واپس بھیج دیا۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ اس لڑکی کے لئے خاص طور سے
صدقہ اور خیرات کرو۔ یہ ایک بہت بڑے بوجھ کے نیچے ہے۔ اللہ رحم کرے........ اس
کے لئے بہت زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ وہ کافی دیر مجھ سے آرزو کے بارے میں باتیں
کرتے رہے۔ انہوں نے آرزو کے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں بہت سے سوالات
پوچھے۔ آخر میں انہوں نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "بی بی' اس بچی کی شادی نہیں
کرنی۔"

"میں نے ڈر کر پوچھا کہ اس بات سے شاہ جی کا کیا مطلب ہے؟"
انہوں نے کہا۔ "اس کی شادی اس کے لئے اور اس کے ہونے والے شوہر کے
لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے شوہر کی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے۔"
"مگر کب تک شادی نہیں کرنی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔
وہ بولے۔ "ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے یہ کبھی شادی نہ کرسکے' ہوسکتا
ہے کہ کچھ عرصے بعد حالات ٹھیک ہوجائیں اور اس کی شادی ہوسکے۔ اس کے علاوہ کچھ
بھی ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا ہوں بی بی' مگر تمہیں بے حد احتیاط کی
ضرورت ہے۔"

اس کے بعد شاہ جی نے کچھ تعویذ کاغذ پر لکھ کر دیئے۔ اس کے علاوہ دھات کی

ایک تختی پر بھی کچھ نقش وغیرہ کندہ کروانے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ کہا کہ ہم آرزو کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ان سے رابطہ رکھیں۔

میں نے آرزو کے ابو سے چوری چھپے ان تمام ہدایات پر عمل کیا۔ ان کو تھوڑی بہت بھنک پھر بھی پڑ گئی' بہرحال میں نے کہہ سن کر انہیں مطمئن کر دیا۔ شاہ جی دو ہفتے بعد ایبٹ آباد واپس آ گئے اور ان سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔ بہرحال ان کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں کبھی کبھی انہیں خط لکھ کر صورت حال سے آگاہ کر دیتی تھی۔ انہوں نے کبھی خط کا جواب نہیں دیا تاہم مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں شاہ جی کو آگاہ رکھ رہی ہوں........ خط ہی کے ذریعے سہی۔ لیکن ان سے رابطہ تو تھا۔ یہاں ایبٹ آباد میں ہمارے عزیز بھی رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں بہانے سے یہاں آئی اور شاہ جی سے ملاقات کی۔ آرزو بھی میرے ساتھ تھی۔ شاہ جی نے آرزو کے جسم پر نظر آنے والا نشان دیکھا۔ کچھ سوالات پوچھے پھر اسے باہر بھیج دیا' اور میرے سامنے وہی باتیں دہرائیں جو وہ اس سے پہلے کر چکے تھے۔ انہوں نے کچھ تازہ تعویذ وغیرہ بھی لکھ کر دیئے۔ اس حوالے سے انہوں نے کسی شکل میں کسی طرح کا معاوضہ نہیں لیا........"

چند لمحے توقف کر کے آنٹی تابندہ نے کھڑکی کھولی اور دوسرے کمرے میں جھانکا۔ گڈو ٹی وی پر کارٹون فلم دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔ وہ گئیں اور ٹی وی بند کر کے کمرے کی ٹیوب لائٹ بجھا آئیں۔ اب صرف زیرو کا بلب روشن تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ میرے پاس آ بیٹھیں۔ وال کلاک رات کے دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ گھر میں اور گھر سے باہر گلی میں خاموشی تھی۔ بس کہیں فاصلے پر آوارہ کتے گاہے گاہے شور مچانے لگتے تھے۔ ان کا شور سن کر میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی۔ ذہن آپوں آپ اس کالے کتے کی طرف چلا جاتا تھا جو کسی آسیب کی طرح ان در و دیوار میں منڈلا رہا تھا اور جس کا اس کہانی سے کوئی گہرا تعلق تھا۔

آنٹی تابندہ نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "تقریباً ڈیڑھ دو سال گزر گئے اس دوران میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ آرزو کی گردن پر انسانی ہاتھوں کا نشان جوں کا توں رہا۔ اب وہ بالکل واضح دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی مصور نے ہلکے سرخ رنگ سے اس کی جلد پر کسی ننھے سے برش سے یہ تصویر بنا دی ہے۔ گاہے گاہے آرزو کے ڈر جانے

کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ تاہم تعویذوں کی وجہ سے اسے کافی حوصلہ ملا تھا اور وہ اپنے اندر ایک طرح کی توانائی محسوس کرتی تھی۔ اسی دوران میں آرزو کے ابو نے اس کی شادی کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ آرزو کی منگنی لڑکپن میں ہی اس کے پھوپھی زاد سے ہو گئی تھی۔ لڑکا خوبصورت اور پڑھا لکھا تھا۔ اپنا کاروبار تھا۔ اس کی دادی سخت بیمار رہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ زندگی میں ہی اپنے سب سے بڑے پوتے کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ جن دنوں وہ زیادہ بیمار ہو کر اسپتال پہنچیں ان لوگوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ آرزو کا نکاح کر کے رخصتی کر دی جائے۔ آرزو کے ابو راضی ہو گئے اور انہوں نے تیزی سے آرزو کی شادی کی تیاری شروع کر دی........ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ شاہ جی کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ دل میں عجیب عجیب وسوسے سر اٹھاتے تھے۔ کئی ماہ سے شاہ جی کو کوئی خط نہیں لکھا تھا' نہ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جی چاہا کہ اس کٹھن مرحلے میں اڑ کر شاہ جی کے پاس پہنچ جاؤں اور ان سے سہارا طلب کروں۔ مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ اگر انہوں نے سختی سے منع کر دیا تو پھر کیا ہو گا؟

دوسری طرف شادی کے دن طے ہو گئے تھے اور آرزو کے ابو سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کام کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ مجھ میں ہمت تھی اور نہ آرزو میں کہ ان سے کچھ کہہ سکتے۔ ہمیں تو بس ان کے حکم پر چلنا تھا۔ ایک روز آرزو نے بڑی ہمت کر کے اپنی خالہ یعنی میری بڑی بہن سے بات کی اور انہوں نے مناسب لفظوں میں یہ ساری بات آرزو کے ابو تک پہنچا دی۔ آرزو کے ابو نے آپا کو خوب ڈانٹا اور انہیں وارننگ دی کہ وہ یہ خرافات صرف اپنے تک محدود رکھیں اور آئندہ اس قسم کی کوئی بات اپنے دماغ میں بھی نہ لائیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں بھی برا بھلا کہا۔ خاص طور سے میری خبر لی اور کہا کہ میں تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے چکر میں پڑ کر خود کو دقیانوسی عورت ثابت کر رہی ہوں۔ ہم میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان کے سامنے بول سکتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ ستمبر کی 8 تاریخ تھی۔ آرزو کے پھوپھی زاد جمشید سے اس کا نکاح ہو گیا۔ رخصتی چند روز بعد ہونا طے پائی تھی۔"

ایک بار پھر آنٹی تابندہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ نکاح کے

ر اہم نشان کو اہمیت دی جائے۔ غصے میں آکر انہوں نے آرزو سے کہا کہ میں اس
ییت کو ہمیشہ کے لئے ختم ہی کردیتا ہوں۔ مصیبت سے ان کی مراد آرزو کی گردن کا
ان تھا۔ وہ الماری سے جلد کو سن کرنے والی دوا اٹھا لائے۔ کاٹن کی مدد سے انہوں نے
ا آرزو کو لگائی اور بلیڈ سے اس کے نشان کو کاٹ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ ابھی وہ بلیڈ لے کر
رزو کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارے پالتو کتے کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے
یاںق سے عجیب سی آواز نکالی اور آرزو کے ابو پر حملہ کردیا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔"

اس منظر کو یاد کرکے آنٹی تابندہ کو جھرجھری سی آگئی۔

وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولیں۔ "کتے کی نظر ایک دم بالکل اجنبی ہوگئی تھی
ر اس کے حلق سے ایسی غراہٹ نکل رہی تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنی
اس نے ایک ہی جست میں آرزو کے ابو کو نیچے گرا لیا اور ان کے بازو سے ایک
پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میری اور آرزو کی چیخیں نکل
میں انہیں بچانے کے لئے آگے بڑھی۔ کتا انہیں چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس
پہلے میری ٹانگ پر کاٹنے کی کوشش کی پھر پنجہ مار کر میری گردن لہو لہان کردی۔ اس
ران میں نجیب ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ نجیب کو جانتے ہونا تم۔ وہی لڑکا جس سے
ہور میں آرزو کی شادی ہوئی تھی۔ بنک میں کام کرتا تھا وہ۔"

"جی ہاں۔ اسے کیسے بھول سکتے ہیں ہم۔"

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ نجیب کے آجانے سے ہماری جان بچ گئی ورنہ کتے نے
لے آدھ کا کام تو تمام کر ہی دیا تھا۔ نجیب نے آتے ساتھ ہی گڈو کے کرکٹ بیٹ سے کتے
کے سر پر دو تین شدید چوٹیں لگائیں۔ وہ تیورا کر گر پڑا۔ اسی دوران میں آرزو کے ابو
رر سے اپنا پستول نکال لائے تھے۔ انہوں نے اینٹھتے ہوئے کتے کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔
س واقعے نے ہمیں سخت دہشت زدہ کردیا۔ خاص طور سے مجھے اور آرزو کو۔ ہم حیران
ے کہ ایکا ایکی کتے کو کیا ہوگیا تھا۔ ہم اس سے کسی ایسی حرکت کی توقع کر ہی نہیں سکتے
ے اور کتے نے یہ حرکت عین اس وقت کی تھی جب آرزو کے ابو اس کی گردن کے
اسرار نشان کو کاٹنے کا ارادہ رکھتے تھے...... بہرحال آرزو کے ابو نے اس بات کو بھی
نا انا کا مسئلہ بنالیا۔ چھ سات روز بعد وہ آرزو کی گردن کے نشان کو مٹانے کے لئے ایک

سات آٹھ روز بعد کی بات ہے' جمشید اپنی دادی کو دیکھنے کے بعد اسپتال سے گھر واپ
جارہا تھا۔ رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ ایک جگہ دو افراد نے سڑک کے درمیا
کھڑے ہوکر اس کی گاڑی روک لی۔ جمشید سے گاڑی چھیننے کی کوشش کی گئی۔ جمشید دلیر
لڑکا تھا' اس نے مزاحمت کی جو اسے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ ڈاکوؤں نے پہلے اس کی ٹانگ
میں اور پھر سینے میں گولی مار دی۔ اسپتال میں تین دن زندگی موت کی کشمکش میں رہنے
بعد جمشید چل بسا۔ جمشید کی اس ناگہانی موت کے بعد ہم اس قدر غمزدہ ہوئے کہ بیا
نہیں کرسکتے۔ کئی ماہ جیسے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح گزرے۔ میرے دل پر بڑا بوجھ
تھا۔ رہ رہ کر شاہ جی کی بات یاد آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جمشید کی موت میں ہمارے
گھرانے کا ہاتھ ہے' دوسری طرف آرزو کے ابو اس قسم کی کوئی بات سننے کے لئے تیا
نہیں تھے۔ ان کے نزدیک یہ محض اور محض ایک اتفاق تھا...... اس شادی اور اچانک
موت کے بعد ہمارے خاندان میں کئی جھگڑے ہوئے۔ پتہ نہیں کہ یہ کیسی منحوس شادی
تھی' اس نے ہمیں خاندان سے کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ تو ایک طے شدہ بات کہ شادی کے
فوراً بعد لڑکی کے سسرال والوں پر کوئی مصیبت آجائے تو لڑکی کو سبز قدم اور منحوس قرار
دے دیا جاتا ہے اور یہ کوئی چھوٹی موٹی مصیبت نہیں تھی۔ گھر کا چراغ ہی گل ہوگیا
تھا...... اس شادی کے نو دس ماہ بعد ہی ہم حیدر آباد ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئے اور لاہور
شفٹ ہوگئے۔ آرزو کے ابو کو ضد سی ہوگئی تھی۔ وہ جلد از جلد آرزو کی شادی کرنا چاہتے
تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے دلوں میں پیدا ہونے والا وہم جڑ پکڑ گیا تو ایک تناور درخت
بن جائے گا اور اسے کاٹنا ناممکن ہوجائے گا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں
آناً فاناً ہی آرزو کے لئے رشتہ تلاش کرلیا اور مجھ سے کہا کہ ہم فوراً آرزو کی شادی کریں
گے۔ اس شادی میں ہمارا کوئی رشتہ دار شریک نہیں ہوگا اور نہ کسی کو خبر دی جائے گی
یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم لاہور میں تھے لیکن ابھی تمہارے پڑوس والے مکان میں
شفٹ نہیں ہوئے تھے۔ ہماری رہائش چھاؤنی کے علاقے میں تھی۔ ان دنوں ہمارے گھر
میں رکھوالی کا کتا بھی تھا۔ یہ السیشئن کتا حیدر آباد سے ہی ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ایک دن
آرزو آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر چھوٹے آئینے کی مدد سے اپنی گردن کا داغ دیکھ رہی
تھی کہ آرزو کے ابو نے اسے دیکھ لیا۔ انہیں اس بات سے بے انتہاء چڑ آتی تھی کہ ان

اسپیشل کریم لے آئے۔ اس امپورٹڈ کریم کے اشتہارات اکثر اخباروں میں آتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کریم جلد پر سے ہر قسم کے داغ دھبے اور دیگر نشانات مٹا قدرت رکھتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ آرزو کو کریم رہے....... ان کے ذہن میں یہ بات ٹھنی ہوئی تھی کہ آرزو کا یہ نشان آرزو کے نفسیاتی مرض بن گیا ہے۔ وہ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ نشان ختم ہو جائے گا کے توہمات بھی دور ہو جائیں گے۔ ان کی کوششوں سے نشان غائب تو نہیں ہوا لیکن مدھم ضرور ہو گیا۔ پھر ہم اس مکان میں شفٹ ہو گئے جو تمہارے پڑوس میں واقع تھا مکان میں کچھ عرصے بعد آرزو کی شادی ہوئی اور وہ دردناک واقعہ بھی ہوا جس سب گواہ ہو۔ عین شادی کی رات نجیب کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ......"

آنٹی کی آواز بھر آئی۔ وہ چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگیں۔ چادر ہٹنے کی گردن کا بالائی حصہ نظر آنے لگا۔ وہی زخم اپنی جھلک دکھانے لگا جس کا تذکرہ تھوڑی دیر پہلے کر رہی تھیں۔ وہ چادر درست کرتے ہوئے بولیں۔ "نجیب کی موت بعد اس بات میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ آرزو کے ساتھ کچھ ہے۔ شاہ جی کی آرزو کے متعلق کہی ہوئی بات غلط نہیں تھی لیکن قیامت یہ تھی کہ کے ابو اب بھی کچھ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس نئے واقعے کے بعد ان کی آنکھیں جانی چاہئیں تھیں لیکن وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ بس ان پر خبط سا سوار ہو گیا تھا یہ جو کچھ ہوا ہے اتفاق کے تحت ہوا ہے اور وہ اسے غلط ثابت کر کے رہیں گے۔ پہلی بار میرے اور ان کے درمیان جھگڑا ہوا۔ میں کبھی نہیں بولی تھی مگر اس بولی....... اور اسی شام کو ان کے سینے میں شدید تکلیف ہوئی جس کے بعد انہیں ا لے جانا پڑا۔"

ایک طویل سانس کھینچ کر آنٹی نے اپنے دکھ بھرے خیالات کو جمع کیا اور جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ "آرزو کے ابو کی ایک اور بس ایک ہی آرزو تھی۔ وہ سہاگن دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف میری بھی بس ایک خواہش تھی۔ میں اپنی سہاگن کرنے کی خاطر کسی اور گھر کا چراغ گل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بات میرے میں سو فیصد پختہ ہو چکی تھی کہ اگر ہم نے اپنی حماقت تیسری بار دہرائی تو وہی ہوگا

سے پہلے ہوا ہے۔ میں اور آرزو اب شادی کے تصور ہی سے کانپ جاتی تھیں۔ آرزو اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ مجھے کچھ نہیں بتاتی تھی مگر میں اس کا دکھ سمجھتی تھی۔ وہ خود کو نہایت نحس خیال کر رہی تھی۔ روتے ہوئے مجھ سے کتنی بار کہتی تھی، امی، میرا تو کسی پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہئے۔ ایک روز میں نے دیکھا تو اس کی گردن کا سرخ نشان پھر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آرزو نے بھی آئینے کے ذریعے اس نشان کو دیکھا۔ گاہے گاہے آرزو پر خوف کے حملے بھی اسی طرح ہو رہے تھے۔ وہ اکیلی ہوتی تو بلاوجہ ڈر جاتی۔ وہ کہتی تھی، مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے آس پاس کوئی موجود ہے۔ میں اس کے سانسوں کی آواز سنتی ہوں، اس کے بدن کی باس مجھ تک پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جانوروں سے بھی بے تحاشہ ڈرنے لگی تھی۔ جانوروں کا خوف تو بچپن سے اس کے ذہن میں موجود تھا، مگر اب اس کا خوف بہت بڑھ گیا تھا۔ انہی دنوں ایک روز سخت خوف کے عالم میں آرزو نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ایک بڑی عجیب بات نوٹ کی ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو ایک کالے رنگ کا کتا اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ میں نے شروع میں اس کی بات کو وہم سمجھا تھا مگر پھر ایک روز جب آرزو میرے ساتھ بازار گئی تو اس نے مجھے اس آوارہ کتے کی جھلک دکھائی۔ بعد میں اپنے گھر کی چھت سے میں نے اس کتے کو اکثر آس پاس منڈلاتا بھی دیکھا....... آرزو کے ابو کو بتائے بغیر میں نے شاہ جی کو ایک دو خط لکھے اور ساری صورت حال بتائی۔ میں نے ان سے جواب کی درخواست کی تھی لیکن حسب توقع جواب وغیرہ نہیں آیا۔ آخر کچھ روز بعد میں عزیزوں سے ملنے کا بہانہ کر کے حیدر آباد سے ایبٹ آباد جا پہنچی۔ تمہیں یاد ہے ناں نجیب کی موت کے کچھ دن بعد میں لاہور سے باہر گئی تھی اور تین چار دن رہی تھی۔"

"جی ہاں، مجھے ان دنوں کی ہر بات یاد ہے۔"

"ایبٹ آباد میں، میں شاہ جی سے ملی اور رو رو کر انہیں ساری بپتا سنائی، شاہ جی کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ سر پر چادر اوڑھ کر اور منہ سر چھپا کر بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور جھڑکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے شوہر کے سامنے بے بس ہوں۔ وہ وہی کرتے ہیں جو ان کی مرضی ہوتی ہے۔ شاہ جی نے کہا، وہ بہت برا کر رہا ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے اور وہ دوسروں کی جان کو بھی خطرے میں

ڈال رہا ہے۔ جو دو لڑکے مارے گئے ہیں ان کا خون بھی تمہارے شوہر کے سر پر ہے۔ ا
وہ باز نہ آیا تو اس کے اپنے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے گھر واپس آ کر آرزو کے
کے سامنے ہاتھ جوڑے ان کے پاؤں پکڑے' ان سے کہا کہ وہ مجھ سے ایک وعدہ کریں
وہ ابھی کچھ عرصے کے لئے آرزو کی شادی کے بارے میں سوچنا ختم کر دیں گے۔ انہ
نے اوپرے دل سے کہہ دیا کہ میں وعدہ کرتا ہوں۔ انہی دنوں ایک عجیب کرشمہ ہوا۔ گئے
لاہور سے ایبٹ آباد شفٹ ہو گئے۔ آرزو کے ابو نے وہاں دفتر جوائن کر لیا اور مکان
لے لیا۔ شاہ جی کرنی والے بزرگ ہیں۔ مجھے تو کسی وقت لگتا ہے کہ شاید انہوں نے
ہمیں لاہور سے ایبٹ آباد بلایا تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا بھی تھا کہ وہ مجھے اپنے
پاس لے آئیں گے...... ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"آپ بتا رہی تھیں کہ انکل انوار نے ایبٹ آباد میں دفتر جوائن کر لیا اور مکان لے لیا۔"

"ہاں...... لیکن یہاں پہنچ کر چار پانچ مہینے تو سکون سے گزرے' پھر ایک دن
پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ چپکے چپکے پھر آرزو کے لئے بر تلاش کر رہے ہیں۔ وہ
معاملے میں ایک دم خبطی سے ہو گئے تھے۔ یا شاید ضد تھی ان کے اندر کہ وہ پچھلے
ناک واقعات کو محض ایک عجیب اتفاق ثابت کر کے چھوڑیں گے۔ کچھ دیر بعد ایک بار
وہی کہانی دہرائی جانے لگی۔ اس مرتبہ پکی عمر کا ایک لڑکا بلکہ شخص ان کی نظر میں تھا۔
حیوانات کا ڈاکٹر تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہو گا۔"

"دیکھا تو تھا آنٹی لیکن...... بڑی عجیب حالت میں۔ منگل کو اخبار میں اس
تصویر چھپی تھی۔ بے چارا اپنے بستر پر پڑا تھا اور اس کی گردن لہولہان تھی۔" میں
دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

آنٹی نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "اس کا نام رفیق تھا۔ اس کے ساتھ
وہی کچھ ہوا جلال' جو اس سے پہلے دو کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ان کا خون ہمارے سر پر ہے
سب کے سر ہے۔ ہم نے انہیں قتل کیا ہے جلال! کاش...... کاش آرزو کے ابو اپنی
چھوڑ دیتے یا کاش ہم اس قابل ہوتے کہ انہیں ضد چھوڑنے پر مجبور کر سکتے۔ وہ دل
مریض بن چکے تھے' ہر وقت سینے میں درد کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ ڈر رہ

ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا گیا تو وہ شدید اثر لیں گے۔ ان کی بیماری ہی ان کی
اور ہماری کمزوری بن گئی تھی۔ کاش ہم اتنے کمزور نہ ہوتے۔"

"انکل کو اٹیک شادی سے اگلے دن ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اٹیک تو اگلے دن ہوا تھا مگر وہ رفیق کی موت کے فوراً بعد سے درد میں مبتلا
تھے۔ انہوں نے کسی کو بتایا نہیں بس خود ہی تھوڑی بہت دوا لیتے رہے۔" آنسو
تابندہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "آنٹی! آپ نے بھی رفیق کی لاش کی تصویر دیکھی تھی؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "آنٹی' ان کی گردن کا زخم کسی چھری یا خنجر وغیرہ کا نہیں تھا۔"

"پھر...... پھر کیا ہوا اس کے ساتھ؟ کون مار گیا اسے؟ کوئی ہوائی چیز تھی' کوئی
بھوت تھا؟ کیا تھا؟" آنٹی نے روہانسے لہجے میں پوچھا۔

میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "آنٹی! آپ کی طرح میں بھی
سارے معاملے کو ایک پُراسرار رنگ میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ شہادتیں ایسی ہیں جو
ت کرتی ہیں کہ یہ غیر معمولی معاملہ ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات دیکھی ہے تم نے؟"

"ایک بات نہیں ہے' بہت سی باتیں دیکھی اور محسوس کی ہیں۔ آرزو کے ساتھ
ی کرنے والے دو افراد کا شادی کی رات ہی ہلاک ہو جانا کچھ کم پُراسرار نہیں تھا۔ اب
نے انکشاف کیا ہے کہ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اب تو اس
ملے کی پُراسراریت میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی...... ابھی تھوڑی دیر
آپ نے ایک کتے کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں اس حوالے سے آپ کی بات کی پوری تائید
تا ہوں اور وہ اس لئے کہ اس کتے کے بارے میں' میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"فون پر گفتگو کے دوران ایک بار آرزو نے بتایا تھا۔" میں نے نگاہیں جھکائے
ئے کہا۔ آنٹی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہیں۔ میں نے کہا۔ "آرزو کی اطلاع
بعد میں نے خود بھی اس کتے کو کئی بار آپ کے گھر کے آس پاس دیکھا بلکہ ایک مرتبہ

تو میں نے اسے آرزو کے تعاقب میں بھی پایا۔ وہ کہتا کچھ نہیں تھا' نہ ہی خطرناک
تھا' بس خاموشی سے آس پاس موجود رہتا تھا۔ لیکن اب...... اب مجھے اندازہ
کہ وہ اتنا بھی بے ضرر نہیں تھا جتنا دکھائی دیتا تھا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو بیٹا؟"

"آپ ایک بار پھر اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کو آنکھوں کے سامنے لائیں
رفیق کی گردن کا زخم ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا اند
ہو' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ پُراسراریت کا شکار ہو رہا ہوں۔
دل کہتا ہے کہ ڈاکٹر رفیق کی گردن کا یہ زخم بھی کسی انسان کا نہیں جانور کا لگایا ہوا

آنٹی تابندہ کی آنکھیں خوف سے پھیلنے لگیں' تمہارا مطلب ہے کہ وہ کتا

"جی ہاں۔ یہ بات آپ کے لئے یقیناً حیرت کا باعث ہوگی کہ لاہور میں نظ
والا وہ منحوس کتا اس وقت ایبٹ آباد میں موجود ہے۔ میں نے صرف تین دن پہ
اپنی آنکھوں سے اپنے ہوٹل کے باہر دیکھا ہے۔"

میں آنٹی کو اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے لگا اور وہ حیرت زدہ سی سنتی
کمرے میں ایک عجیب طرح کی وحشت بھرتی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک خوف
تھا...... اسی دوران میں بیرونی دروازے کی بیل بجی۔ یہ آنٹی تابندہ کے بھائی توقیر
تھے۔ بیوی کے سیڑھیوں سے گرنے کی خبر سن کر وہ فوراً راولپنڈی چلے گئے
بیوی کی حالت کچھ سنبھلی تھی تو واپس یہاں آئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس شخص
آنٹی اور انکل کا کوئی عزیز رشتے دار موجود ہی ہیں۔ ایسے مشکل حالات میں تو
بانٹنے کے لئے دور دور سے آجاتے ہیں' وہ لوگ پاکستان میں ہوتے ہوئے ناپید تھے
دوسرے کمرے جا کر انکل توقیر کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے لگیں
صوفے پر نیم دراز ہو کر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ آج آنٹی کی انکشاف انگیز گفتگو
مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا تھا جو طویل عرصے سے میرے دل و دماغ میں
مچا رہا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ آرزو کا دل کس پتھر یا دھات سے بنا ہوا ہے جس
تڑپ جلن اور ہر دم خون روتی ہوئی محبت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا' مجھ سے محب
کے باوجود میری شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ مجھ سے دور ہے۔ مجھے خون رلا

شب و روز تڑپا رہی ہے؟ ہاں آج مجھے اپنے اس سوال کا جواب بڑی وضاحت سے مل
یا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ میرے اور آرزو کے درمیان کون سی دیوار حائل ہوئی تھی۔
انا کی دیوار نہیں تھی۔ نہ ہی ظالم سماج کی دیوار تھی' نہ ہی کسی اور سے کئے گئے دعوے
دیوار تھی...... یہ ایک پُراسرار خوف کی دیوار تھی۔ ایک ایسی آسیبی دیوار جس پر
ت کی باڑ لگی ہوئی تھی' اور یہ آسیب' یہ خوف' کوئی واہمہ نہیں تھا۔ یہ کالی بھیانک
ت کی طرح ایک اٹل حقیقت تھا۔ اس حقیقت کا ثبوت تین قبروں کی صورت حیدر
باد' لاہور اور ایبٹ آباد میں موجود تھا۔ تین مرد جنہوں نے آرزو کے حسین سراپے کو
ونے کی کوشش کی اور موت کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا'
اق اس طرح کے نہیں ہوا کرتے۔ اگر انکل انوار اسے اب بھی اتفاق کہتے تھے تو پھر ان
ذہنی صحت پر شک ہونا لازمی تھا۔

میرے دل کے اندر سے یہ آواز ایک گونج کی طرح ابھر رہی تھی کہ آرزو صرف
ر صرف اس لئے مجھ سے دور رہی ہے کہ وہ مجھے مصیبت اور موت کے تاریک سایوں
ے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل کو پتھر کر لیا تھا اور سارے احساسات کو کچل
کر ملیامیٹ کر لیا تھا...... ایک عجیب سا درد میرے بدن میں لہریں لینے لگا۔ اس درد
زبردست مٹھاس تھی اور شدید ترین کڑواہٹ بھی۔

پھر میرا دھیان ابھی کچھ دیر پہلے کے ان مناظر کی طرف چلا گیا جو میں نے تاریک
قبرستان میں دیکھے تھے۔ پیر شاہ جی کے قدموں میں گر کر آنٹی تابندہ کا گڑگڑانا' ان سے
رحم کی درخواست کرنا' اب سب کچھ میری سمجھ میں آرہا تھا۔ "شاہ جی اس بات پر بے حد
غضب ناک تھے کہ ان کی بار بار کی وارننگ کے باوجود آنٹی تابندہ اور اس کے گھر والوں
نے اپنی من مرضی کی۔ آنٹی تابندہ بڑی لجاجت سے صفائی پیش کر رہی تھیں۔ وہ شاہ جی کو
یقین دلا رہی تھیں کہ جو کچھ ہوا وہ آرزو کے والد کی مرضی اور حکم سے ہوا۔ اس حکم کے
سامنے وہ بے بس تھیں۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا جب آنٹی کمرے میں واپس آگئیں۔ انہوں نے منہ
ہاتھ دھولیا تھا اور قدرے فریش ہو گئی تھیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں۔ "جلال بیٹا! اب گڈو
مبتلا نہیں ہے' بھائی توقیر اس کے پاس آگئے ہیں۔ چلو تم مجھے اسپتال چھوڑ آؤ۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "آنٹی اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔ آپ آرام کر چلے جائیں گے۔"

"نہیں جلال۔" انہوں نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ "چلو گھبرا رہا ہے۔ میں یہاں رہی تو مجھے کچھ ہوجائے گا۔ مجھے اسپتال لے چلو۔"

راستے میں آنٹی نے پھر آنسو بہانا شروع کردیئے۔ کہنے لگیں۔ "میں آرزو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کے دل میں......... وہم بیٹھ گیا ہے کے ابو کو......... کچھ ہوجائے گا۔" آنٹی نے مشکل سے فقرہ مکمل کیا۔

"کچھ نہیں ہوگا آنٹی۔" میں نے تسلی دی۔ "اب تو وہ خطرناک حالت آئے ہیں۔ انشاء اللہ ایک دو دن تک عام وارڈ میں منتقل ہوجائیں گے۔"

"بس وہ بڑی پاگل ہے۔ خود بھی روتی ہے' مجھے بھی رلاتی ہے۔ کل رات اونگھتی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی' چیخنے لگی' امی میرے ابو کو بچالیں۔ امی کچھ کریں۔ بمشکل چپ کرایا۔ کہنے لگی' مجھے لگا ہے کہ کوئی ہمارے بالکل قریب موجود ہے' مجھ سے دور لے جائے گا۔"

"کیا اسے کچھ نظر آتا ہے؟"

"نہیں۔ بس احساس ہوتا ہے کہ کوئی اس کے پاس ہے۔ کہتی ہے میں سانسوں کی آواز سنتی ہوں۔ اس کی بو مجھے آتی ہے۔ میں نے یہ ساری باتیں شاہ بار بتائی ہیں۔ وہ سن کر چپ ہوجاتے ہیں' کچھ بتاتے نہیں۔ بس کہتے ہیں کہ صدقہ کرو یا تعویذ وغیرہ دیتے ہیں۔ نفسیاتی ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا میں نے۔ وہ کہتا تھا کہ ذہن پر بوجھ ہے۔ فوبیا کی علامتیں بھی ملتی ہیں۔ اس نے علاج کے طور پر شادی کی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ شادی کا لفظ آرزو کے لئے کتنا بھیانک ہے۔"

انہی باتوں کے دوران میں ہم کلینک پہنچ گئے۔ سی سی یو وارڈ میں انکل انوا چت لیٹے تھے اور نیم وا آنکھوں سے اس مانیٹر کو دیکھ رہے تھے جو فی منٹ دھڑکنیں بتاتا تھا۔ دراصل وہ سو رہے تھے بس کمزوری کے سبب ان کی آنکھیں تھیں جس سے لگتا تھا کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں ڈرپس بھی لگی ہوئی تھیں کبھی آکسیجن بھی لگانا پڑتی تھی۔ آرزو بدستور ان کے قریب موجود تھی۔ وہ مسلسل

رہی تھی اور چند لمحے کے لئے بھی اپنے والد کے پاس سے ہٹنا اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ صرف چند منٹ کے لئے باہر آئی تاکہ آنٹی تابندہ چند منٹ کے لئے انکل کے پاس جا بیٹھیں۔ وہ کچھ دیر انکل کے پاس رک کر باہر آگئیں تو آرزو پھر وہاں جا بیٹھی۔ ابھی اسے بیٹھے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس کی چیخ سنائی دی۔ وہ تڑپ کر کھڑی ہوئی اور اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی تیزی سے باہر نکل آئی۔ میں اور آنٹی لپک کر اس کے پاس پہنچے۔ خیرو بھی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ "کیا ہوا؟" آنٹی نے اسے ڈانٹ کر پوچھا۔ وہ شرمندہ آواز میں بولی۔ "چھپکلی کا......... چھوٹا بچہ تھا۔ پپ پتہ نہیں کہاں سے میری گود میں آگرا۔"

اس دوران میں دو مستعد قسم کے نوجوان ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بڑی ملائمت کے ساتھ ہم سے صورت احوال دریافت کرنے لگے۔ آرزو کے بے مثال حسن کو غم کے سائے نے گہنا رکھا تھا' پھر بھی جو اسے دیکھتا تھا' دیکھتا رہ جاتا تھا۔ نوجوان ڈاکٹرز اور مریضوں کے لواحقین ہروقت نگاہوں سے اسے ناپتے تولتے رہتے تھے۔ آنٹی تابندہ نے آرزو کو پیار آمیز ڈانٹ پلائی اور سمجھا بجھا کر انکل انوار کی طرف واپس بھیجنا چاہا۔ وہ روہانسی ہوکر بولی۔ "اچھا امی جی' ابھی چلی جاتی ہوں۔"

ایک ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مس کہیں آپ کو مغالطہ تو نہیں ہوا میرا مطلب ہے یہاں بہت صفائی رکھی جاتی ہے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ مجھے اپنی نظر ٹسٹ کرانی چاہیے۔" وہ تنک کر بولی۔

"نن نہیں مس! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

قریبی بستر سے ایک مریض بولا۔ "آپ کا جو بھی مطلب ہو ڈاکٹر صاحب' لیکن ایک لال بیگ تو میں نے بھی کل باتھ روم میں دیکھا تھا' بلکہ باقاعدہ اس سے ہاتھ ملایا تھا۔"

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ اندر ایک نرس کی چیخ سنائی دی۔ وہ انکل انوار کے سرہانے کھڑی تھی۔ پہلے وہ ڈر کر پیچھے ہٹی پھر انچارج ڈاکٹر کو چیخ چیخ کر کچھ بتانے لگی۔ میں اور آرزو لپک کر اندر گئے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ بوکھلاہٹ میں ٹارچ کی روشنی انکل کے نتھنوں میں ڈال رہا تھا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"سٹاف کہہ رہی ہے کہ........ چھپکلی کا چھوٹا سا بچہ مریض کی ناک کی طرف ... ہے۔"

"سس........ سروہ اندر چلا گیا ہے۔ مم........ میں نے خود دیکھا ہے۔"

سب مریض بستروں پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ شور سن کر ایک سینئر ڈاکٹر صاحب دو تین نرسیں بھی موقعہ پر پہنچ گئیں۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے سینئر ڈاکٹر کو وہی کچھ بتایا جو ابھی نے بتایا تھا۔ ایک بوڑھے مریض نے آرزو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی بچی نے بھی وہ چھوٹی چھپکلی دیکھی ہے۔"

سینئر ڈاکٹر کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا' اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں "اچھا آپ سب لوگ باہر چلے جائیں۔ یہ سی سی یو ہے۔"

وارڈ بوائے نے سب کو دھکیل کر باہر نکال دیا۔ بہرحال میں نے باہر جانے انکار کردیا اور انکل انوار کے نزدیک ہی موجود رہا۔ ہر شخص حیران نظر آرہا تھا اور ان ڈاکٹر صاحبان بھی شامل تھے۔ وہ ابھی تک سٹاف کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ چ کا بچہ ناک کے راستے مریض کے اندر گھس گیا ہے۔ سٹاف بار بار سائیڈ ٹیبل کی ط اشارہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ چھپکلی کا بچہ وہاں رکھے ہوئے گلدستے میں سے نکا مریض کے سینے پر چڑھ کر سیدھا اس کے نتھنوں کے اندر چلا گیا۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک انکل انوار کی ناک سے خون رسنے لگا وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگے۔ وہ جیسے ایک کسی شدید کرب میں گرفتار ہوگئے تھے۔ ڈاکٹروں کے رنگ فق ہوگئے۔ انہوں نے جلد جلدی انکل کے بستر کے گرد پردے کھینچ دیئے۔ میں نے جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھ انکل سخت بے چینی کے عالم میں اپنے سر کو جھٹکے دے رہے تھے اور ان کے حلق عجیب سی غراہٹ نکل رہی تھی۔ ان کی ناک سے رسنے والا خون اب ان کے رخسار پہنچ رہا تھا۔ وارڈ بوائے نے مجھے تقریباً دھکیل کر باہر نکال دیا۔

آنٹی' آرزو اور خیرو وغیرہ کے چہرے خوف سے تاریک ہو رہے تھے۔ وہ پھٹی نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ

...بان بڑی افراتفری کے عالم میں انکل انوار کو آپریشن تھیٹر کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ...ں کی آنکھیں بند تھیں اور ان کے سر کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے........ ٹھیک پندرہ ...ٹ بعد ہم نے انکل انوار کی موت کی خبر سن لی۔

☆----------☆----------☆

انکل انوار کی موت ایک معمہ تھی۔ یہ معمہ یوں اور بھی پیچیدہ ہوگیا کہ
اس بچے کا کوئی سراغ نہیں ملا جو آرزو نے اور پھر نرس فوزیہ نے انکل کے نتھنے میں گھستے دیکھا
تھا۔ پوسٹ مارٹم میں کھوپڑی کو کھول دیا جاتا ہے اور دماغ کے حصے بکھرے ہوتے ہیں۔
ایسے میں کوئی شے سرجن کی نظر سے اوجھل کیسے رہ سکتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں
انکل کی موت کی وجہ دماغ کے اندر سے اچانک خون کا رسنا بتائی گئی تھی' خون۔
وجہ زیادہ بلڈ پریشر کے سبب کچھ نسوں کا پھٹنا ہوسکتا تھا۔ بالکل آخری وقت میں
حرکت قلب بھی اچانک بند ہوگئی تھی۔

آنٹی تابندہ اور آرزو کی بری حالت تھی۔ آرزو تو کئی گھنٹے مسلسل بے ہوش رہی
آنٹی کو بھی غشی کے دورے پڑتے رہے۔ انکل کی آخری رسوم میں ان کے عزیزوں
حیدر آباد اور کچھ کراچی سے آئے اور تدفین کے فوراً بعد واپس چلے گئے۔ ان
سے اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ انکل انوار کی فیملی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے

ے موجود حالات سے خوفزدہ بھی ہیں۔ وہ بس رسم پوری کرنے کے لئے آئے تھے اور
راتفری میں واپس لوٹ گئے یہاں گل مہر کالونی میں انکل انوار کا گھرانہ پہلے ہی کچھ
اسرار سا سمجھا جاتا تھا اب آرزو کے دلہا کی ناگہانی موت اور انکل کی عجیب وغریب موت
ے بعد لوگوں میں قسم قسم کی چہ مگوئیاں گردش کرنے لگی تھیں۔ خاص طور سے انکل کی
بت نے بڑا پُراسرار رنگ اختیار کرلیا تھا۔ عام لوگ یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھے
ہ مریض کی موت ناک میں چھپکلی کا بچہ گھسنے سے واقع ہوئی ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ
راتفری میں چونکہ مریض کی آکسیجن وغیرہ ہٹ گئی تھی اور اسے ضروری تیاری کے بغیر
پریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جارہا تھا لہٰذا راستے میں ہی اسے تیسرا ہارٹ اٹیک ہوا اور
چل بسا لیکن جن لوگوں نے سی سی یو میں یہ ساری کارروائی دیکھی تھی' انہیں یقین تھا
ہ مریض کی موت ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور اس موت میں کسی نہ کسی حوالے سے
پکلی کے بچے کا کردار بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چھپکلی کا بچہ براہ راست مریض کی موت کا
ب نہ بنا ہو مگر اس کی وجہ سے مریض شدید اذیت میں گرفتار ہوا اور اسے دل کا دورہ
ا۔

آرزو کی ذہنی حالت کافی خراب تھی۔ انکل کی موت کے بعد دو چار دن میں ہی وہ
سوں کی بیمار نظر آنے لگی۔ میں نے آنٹی کو سمجھایا کہ وہ خود کو سنبھالیں' اگر وہ بھی بیمار
ہوگئیں تو آرزو کا پُرسان حال کون ہوگا۔ آرزو کے ماموں توقیر صاحب کا کہنا تھا کہ آرزو کو
ذہنی نفسیاتی اسپتال میں دکھایا جائے لیکن میں جانتا تھا اور آنٹی بھی جانتی تھیں کہ وہ نفسیاتی
مریض نہیں ہے۔ نفسیاتی مریض تو وہ تب ہوتی جب وہ کسی بے معنی خوف میں مبتلا ہوتی'
حقیقی خوف میں مبتلا تھی اور اس خوف کا ٹھوس ثبوت چار قبروں کی صورت میں موجود

میں اور کاشف بدستور ایبٹ آباد کے اسی ہوٹل میں موجود تھے' ایک روز میں آنٹی
کے پاس گھر گیا تو آرزو کے ماموں گھر میں موجود نہیں تھے۔ خیرو بھی بازار گیا ہوا تھا۔ آنٹی
اندرونی کمرے میں لے گئیں۔ وہاں آرزو ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور خالی خالی
نظروں سے ٹی وی کی اسکرین کو تک رہی تھی۔ اس کے خوبصورت بالوں کی کچھ لٹیں اس
کے چہرے پر بکھری تھیں۔ لگتا تھا کسی مصور نے دلکش رنگوں سے حزن و ملال کو تصویر کر

رکھا ہو۔ میرے دل کی گہرائیوں سے یہ خواہش ابھری کہ آرزو کے سارے غم او
میں اپنے سینے میں سمیٹ لوں۔ وہ ہوا کی طرح ہلکی، پھول کی طرح شگفتہ اور بہار
تبسم ریز ہوجائے۔ ہمیں دیکھ کر آرزو جلدی سے کھڑی ہوگئیں۔ ہمارے درمیا
کلمات کا تبادلہ ہوا۔ آنٹی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔ پھر وہ آرزو سے
"بیٹی! جلال کو وہ نشان دکھاؤ۔"

آرزو کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار ابھرے۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔" آنٹی نے اسے پچکارا۔ "یہ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اپ
بڑھ کر ہمارے اپنے ہیں۔"

آرزو دیوار کی طرف رخ کرکے صوفے پر بیٹھ گئی۔ آنٹی نے اس کا دوپٹہ
ایک طرف رکھا۔ اس کے لمبے ریشمی بال پشت سے اٹھا کر آگے کی طرف یوں
آرزو کی گردن عقب سے ننگی ہوگئی۔ شفاف جلد والی دودھیا گردن جس پر نظر
بھی جنم نہ سکیں۔ میں مبہوت رہ گیا۔ جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے تھے، وہا
کوئی دو انچ نیچے دودھیا جلد پر ایک اٹھنی جتنا نشان موجود تھا۔ یہ انسانی ہاتھ کا نقش
انگلیاں ہتھیلی انگوٹھا، سب کچھ صاف پہچانا جاتا تھا۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آ
اس نشان کا رنگ سرخ بتایا تھا لیکن یہ مجھے ہلکا عنابی نظر آرہا تھا۔

نشان دیکھنے کے بعد میں اور آنٹی کمرے سے باہر نکل آئے۔ آنٹی کے چہرے
اور تشویش کے سائے کچھ اور بھی گہرے نظر آرہے تھے۔ وہ بولیں۔ "تم نے
رنگ دیکھا ہے؟"

"جی ہاں، ہلکا عنابی ہے۔"

"یہ رنگ پچھلے تین چار دن میں ہی بدلا ہے۔ جب سے رنگ بدلا ہے تب
آرزو زیادہ چپ بھی رہنے لگی ہے۔ کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ اپنے ابو کے بارے
کچھ نہیں کہتی، حالانکہ پہلے دو چار دن ہر وقت ان کی باتیں یاد کرکر کے روتی تھی۔"

"آپ نے شاہ جی سے بات کی؟" میں نے پوچھا۔

وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔ "لگتا ہے کہ اب شاہ جی بھی ہمارا ساتھ چھ
جارہے ہیں۔ میں...... پرسوں بھی گئی تھی ان کی طرف، دو گھنٹے بیٹھ بیٹھ کر آئی ہ

ہی نہیں۔" پھر ایکدم ان کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، غور سے میرا چہرہ
تے ہوئے بولیں۔ "تم بھی کہیں ہمیں چھوڑ نہ جانا۔ ہم ماں بیٹی کو بڑا سہارا ہے تمہارا۔"

"آپ کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہئے آنٹی! میرے بس میں ہو تو آپ کے سارے دکھ
پنے اندر سمیٹ لوں۔ یقین کریں مجھ سے آپ کے اور آرزو کے آنسو دیکھے نہیں
تے۔" میں نے آخری لفظ ذرا جھجک کر کہے تھے۔

انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ معنی خیز لہجے میں بولیں۔ "میں سب
انتی ہوں بیٹا! بڑوں سے بچوں کا کچھ چھپا نہیں رہتا۔" آنسو ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے
ر رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا، انہوں نے بے اختیار مجھے گلے سے لگالیا۔

اسی دوران میں گڈو بھی آگیا۔ اس کے ابو کو اس دنیا سے رخصت ہوئے اب
ر رہ بیس دن ہونے کو آئے تھے پھر بھی جدائی کا غم اس معصوم کی آنکھوں میں چٹان کی
رح ٹھہرا ہوا تھا۔ جوڈو کراٹے، پتنگ بازی، لطیفے سبھی کچھ اسے بھولا ہوا تھا۔ میں نے کہا
چلو آؤ گڈو تمہیں ذرا شہر میں گھما پھرا کر لائیں۔ الیاس مسجد چلتے ہیں شام تک واپس
نا جائیں گے۔" اس کے چہرے سے غم کے بادل ذرا چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

وہ بولا۔ "آپی کو بھی ساتھ لے چلیں؟"

"نہیں بیٹا، وہ ابھی کہیں نہیں جاسکتیں۔" آنٹی نے کہا۔ انہوں نے غالباً عدت کے
الے سے بات کی تھی۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ میں اور کاشف ہوٹل کے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔
ات دو ڈھائی بجے کا عمل ہوگا اچانک دروازہ دھڑ دھڑ بجنا شروع ہوگیا۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ
بیٹھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے پولیس تھی۔ شلوار قمیض پہنے ہوئے ایک موٹی توند
الا کرخت چہرہ اہلکار سب سے آگے تھا۔ اس نے بلا تردد اپنا ریوالور میرے سر سے لگادیا۔
خبردار۔ کوئی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

میں اور کاشف ششدر رہ گئے تھے۔ دو کانسٹیبل آگے بڑھے اور انہوں نے
مارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے کی کوشش کی۔ ہم نے زبردست احتجاج کیا۔ کاشف
نے کہا کہ وہ فون کرنا چاہتا ہے موٹی توند والے نے گندی گالی دی اور ریوالور کا دستہ
کاشف کے سر پر مارا۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے کاشف کو مزید مزاحمت سے منع

کردیا۔ پولیس والوں نے ہمیں ہتھکڑیاں پہنائیں۔ اس دوران میں ہوٹل کا مالک بھ
پہنچ گیا۔ سادہ پوش پولیس والا ہوٹل کے مالک سے دوستانہ انداز میں سرگوشیاں کر
پولیس والے ہمیں ہوٹل کے ایک عقبی دروازے سے نکال کر ایک تنگ سی گ
لے آئے' یہاں پولیس کی گاڑی موجود تھی' ہمیں گاڑی میں دھکیلا گیا اور ہم اس
ہوئی رات کے سناٹے میں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ دو کانسٹیبل ہوٹل
رہ گئے تھے' انہیں غالباً ہمارے کمرے کی تلاشی وغیرہ لینی تھی۔

ایبٹ آباد کی خوابیدہ سڑکوں سے گزر کر ہم بس اڈے کی طرف آگئے۔ قریباً
منٹ بعد ہم ایک مضافاتی تھانے میں موجود تھے۔ یہ ایبٹ آباد اور حویلیاں کے درمیا
کوئی جگہ تھی۔ یہ تھانہ آبادی سے تھوڑا ہٹ کر پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ عمارت
طرز کی تھی اور پتھر و لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اس مختصر عمارت کو چاروں طرف سے
پہاڑی درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ عقب سے ایک پہاڑی نالے کا پانی شور مچاتا ہوا گ
تھا۔ غالباً اس عمارت میں کوئی بدنصیب ملزم چیخ چیخ کر مر بھی جاتا تو اس کی آواز ان
دیواروں سے آگے نہیں جاسکتی تھی۔

تھانے میں پہنچتے ہی روایتی انداز میں ہم سے تفتیش شروع ہوگئی۔ کاشف
مسلسل احتجاج کر رہا تھا' لہٰذا تھانے میں پہنچتے ہی اس سے مار پیٹ شروع کردی
ڈنڈوں' ٹھوکروں اور گھونسوں سے اس کی پٹائی کی گئی۔ پھر پاؤں میں کڑا لگا کر ایک
ٹھنڈے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ سوغات کے طور پر چند تھپڑ اور گھونسے میری خدمت میں
پیش کیے گئے۔ بعد ازاں میرے پاؤں میں بھی کڑا لگا دیا گیا۔

تھانے دار وہی موٹی توند والا تھا جس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس
بابر خاں تھا اور عہدہ انسپکٹر کا تھا۔ ایک سب انسپکٹر وصی جان بھی اس کے ساتھ تھا۔
جان کی آنکھیں بڑی چمکیلی اور شیطانیت سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے ٹھہرے ہ
لہجے میں انسپکٹر بابر سے پوچھا۔ "آپ نے ابھی تک ہمارا جرم نہیں بتایا۔"

انسپکٹر نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے میری ٹھوڑی ذرا اوپر اٹھائی اور
"ڈاکٹر رفیق سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"کون ڈاکٹر رفیق؟"

"انوار احمد کا داماد۔ جسے شادی کی رات پوسٹ مارٹم کرانا پڑ گیا تھا۔"

"مم...... میری اس سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟"

"دشمنی تو تھی کیونکہ دشمنی کے بغیر کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ہوش میں تو ہیں۔"

"ہوش میں ہی ہوں بچو! اور ابھی تھوڑی دیر میں جب چھتر پڑیں گے تو تمہارے
بھی ٹھکانے آجائیں گے۔"

"آپ...... آپ ہمیں فون کرنے دیں۔ آپ ہم پر الگ ایسا الزام لگا رہے ہیں
کا کوئی سر پیر نہیں۔"

"سر پیر گردن دم...... سب کچھ ہے چن جی۔" تھانیدار نے زہر خند سے کہا' کچھ
تک سگریٹ پھونک کر دھواں میرے چہرے پر پھینکتا رہا پھر بولا۔ "اس حسن پری سے
کیا ناتا ہے۔"

"کون۔ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"تمہاری جند جان کی۔ انوار احمد کی بیٹی کی۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ مس آرزو اور ان کی فیملی والے عزت دار لوگ
آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

"ان عزت داروں کی عزت کا جنازہ تو تم دونوں یاروں نے خود نکال دیا ہے۔ اب
کیا بچا ہے...... چھنکنا؟"

تھانیدار بابر نے میرے سینے پر ٹھوکر ماری۔ میرا سر پیچھے پتھریلی دیوار کو لگا اور
ھوں میں ستارے سے ناچنے لگے۔ وہ گالی دے کر بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر کے لئے
ی کے نیچے سانس لو' پھر تمہیں تمہاری کرتوتوں کا آئینہ دکھاتے ہیں چن جی۔"

اگلے دو تین گھنٹے ہم نے اس دورافتادہ تھانے میں ٹھٹھرتے اور اہلکاروں کی گالیاں
ہوئے گزار دیئے۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی تھانیدار توند مٹکاتا اندر داخل
اس کے ساتھ ایک سکڑی سہمی خوفزدہ لڑکی تھی۔ لڑکی کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔
ن پر زور دیا تو یاد آگیا۔ یہ لڑکی لاہور کے اسی اسکول میں ٹیچر تھی جہاں آرزو نے بھی
لپ کے فرائض انجام دیئے تھے۔ میں نے ننھی رومی کو اسکول سے لاتے اور لے جاتے

کئی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھا تھا بعد میں ایک مرتبہ بازار میں بھی اس سے ملا
تھی۔ اس کا نام انیلا تھا۔ لڑکی کے خوبصورت ہونٹ خوف کے سبب لرز رہے تھے
کئی لیڈیز پولیس اہلکار لڑکی کے ساتھ آ رہی تھیں۔

انسپکٹر بابر نے لڑکی کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا‘ خود وہ بڑے ٹھاٹ سے میز
اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں اور کاشف بدستور فرش نشین تھے۔ میں یک ٹک لڑ
رہا تھا۔ انسپکٹر بابر گالی دے کر بولا۔ ”کیوں حیران ہو رہا ہے اس کڑی کو دیکھ کر؟
آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تجھے۔“

”یہ کون ہے اور......... اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”یہ تیری جندجان کی سہیلی ہے‘ اور اسے یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ ا
ہمیں تیرا اور تیری جندجان کا سارا کچا چٹھا بتایا ہے۔“

”کیا کچا چٹھا؟“

”انوار کی بیٹی کے ساتھ تیری عشق معشوقی‘ ٹیلیفون‘ خط پتر‘ ملاقاتیں ا
انسپکٹر ایک آنکھ میچ کر بولا‘ پھر اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”چل کڑیئے
ہو جا۔“

لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری‘ اس کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ ایک
اہلکار نے دھمکی آمیز نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح فرفر بولنے لگی
نے میرے اور آرزو کے حوالے سے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

”آرزو میری سہیلی ہے اور میرے ساتھ ہی لاہور کے ایک بہترین انگلش
میں پڑھاتی رہی ہے۔ وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے اس جلال نام کے لڑکے کی
میں گرفتار تھی۔ وہ رات دن اس کا نام لے کر آہیں بھرتی تھی۔ اس کے لئے شم
تھی۔ اس کے نام خط لکھتی تھی اور خود ہی پڑھ کر پھاڑ دیتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ا
ماں باپ اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے اور وہ ماں باپ خاص طور سے باپ کی
کے خلاف نہیں جا سکتی تھی......... بہرحال جلال کے ساتھ اس کا افیئر چلتا رہا۔ یہ
فون پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ ایک دو بار ان دونوں نے گھر سے باہر بھی ملاقاتیں
آرزو اس تعلق کو دوستی تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ کم از کم اس نے مجھے تو یہی

کہ یہ تعلق دوستی تک محدود ہے بہرحال میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آرزو
جلال کی چاہت میں بری طرح گرفتار تھی بے شک وہ اس کا زیادہ اظہار نہیں ہونے دیتی
تھی۔ دوسری طرف جلال کا حال آرزو سے بھی برا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا
چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آرزو ایک بار اسے اشارہ بھی کر دیتی تو وہ اس کے لئے
سب کچھ چھوڑ دیتا۔“

انیلا نامی اس لڑکی کا بیان ختم ہوا تو انسپکٹر بابر نے لیڈیز اہلکار کو اشارہ کیا اس نے
ایک لفافہ انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ اس میں ایک عید کارڈ تھا۔ یہ کافی بڑا کارڈ تھا۔ سرخ
رنگ سے دل کی تصویر بنی ہوئی تھی اور کچھ انگلش ورسز بھی لکھے تھے۔ کارڈ کے اندر بھی
بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”چن جی! یہ کارڈ تمہاری
جندجان نے تمہارے لئے لکھا تھا لیکن کسی وجہ سے اسے پوسٹ نہیں کر سکی تھی۔ اب تو
دوسری عید بھی آنے والی ہے‘ بہرحال میں یہ محبت نامہ تمہیں پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔“

اس نے طنزیہ انداز میں پڑھنا شروع کیا۔ ”میرے دل میں بسنے والے‘ کاش میں
آپ کو بتا سکتی کہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ میرا دل‘ میری آنکھیں‘ میرے کان‘
میری روح‘ سب آپ ہی کے منتظر ہیں۔ کتنی پاگل ہوں‘ جسے خود سے دور رکھنا چاہتی
ہوں‘ اسی کا انتظار کرتی ہوں۔ عید کی آمد آمد ہے۔ ہر طرف خوشیاں ہیں‘ لوگ ہنس رہے
ہیں‘ اٹکھیلیاں کر رہے ہیں‘ مگر میرا دل رو رہا ہے۔ ہاں جلال‘ میرا دل رو رہا ہے۔ میں
آپ کو کیا بتاؤں میرے اور آپ کے درمیان کیسی دیوار حائل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ
اگر میں ایک بار بھی کہوں تو آپ اس دیوار کو توڑ دیں گے۔ مگر اس دیوار کا ٹوٹنا ہمارے
لئے بڑا خطرناک ہوگا......... آہ جلال‘ میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ تمہاری محبت مجھے توڑ کر
ریزہ ریزہ کر رہی ہے اور میں ریزہ ریزہ ہونے پر مجبور ہوں۔

میں جانتی ہوں جلال‘ آپ آج کل بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ
مجھے گھر سے باہر ملنا چاہتے ہیں۔ شاید مجھ سے ناراض بھی ہیں آپ۔ پرسوں میں انیلا کے
ساتھ مال روڈ پر شاپنگ کر رہی تھی۔ آپ ہمارے ساتھ سنیک بار میں بیٹھنا چاہتے تھے۔
میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہے آپ کا دل دکھا تھا۔ پلیز اس
کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ اپنی مجبور آرزو کو معاف کر دیں......... آئندہ کبھی موقع ملا تو

میں اپنی اس غلطی کی تلافی کردوں گی۔ آپ کے ساتھ ضرور کہیں بیٹھوں گی۔ اور ہاں ا
کو میری طرف سے بہت بہت عید مبارک........ بھابی سمن کو' خالہ جان کو اور پ
پیاری پیاری سب سے لاڈلی شاگرد رومی کو بھی بہت مبارک۔ کہئے حضور! اب تو آپ
ناراضگی کچھ کم ہوئی وش یو گڈ لک........ آخر میں پھر ایک پریشان کرنے والی بات
رہی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح یہ تحریر بھی آپ کو روانہ نہیں کرسکوں گی۔ ویری ساری۔

آپ کی مجبور آرزو

"واہ آپ کی مجبور آرزو۔" انسپکٹر نے خوب چبا چبا کر دہرایا۔ "بڑی آگ لگی ہ
تھی دونوں طرف۔ اس آگ میں بے چارا ڈنگر ڈاکٹر خوامخواہ جل کر کباب ہوگیا۔"

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ "یہ عید کارڈ یقیناً آرزو ہی کا لکھا ہوا
کہیں اس کی سہیلی کے پاس پڑا رہ گیا ہوگا۔ اب یہ سہیلی سمیت پولیس کی تحویل
تھا........ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ رفیق کی موت کے بعد پولیس نے لمبی چوڑی تفتیش
ہے۔ آرزو کے سسرال والوں کو آرزو پر شک تھا۔ اس شک کی بنیاد پر پولیس نے آ
کی نجی زندگی کو کھنگالا تھا اور دور تک پہنچ گئی تھی۔ انیلا کو یقیناً لاہور سے پکڑ کر یہاں لا
تھا۔

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ آرزو کے واشگاف اظہار محبت کا پتہ چلا
تھا تو کہاں اور کس حال میں چلا تھا۔ اس کا محبت بھرا عید کارڈ ایک پولیس انسپکٹر تھانے
پڑھ رہا تھا۔ اور میں مجرم کی طرح فرش پہ بیٹھ کر آرزو کے حسن و جمیل خیالات سے
ہو رہا تھا۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ بے پناہ پریشانی و فکر مندی کے باوجود ان لمحو
میں میرے اندر کہیں خوشی کا سوتا پھوٹ نکلا۔ کہیں رگ جان کے اندر سے انبساط
لہریں ابھریں اور پورے بدن میں پھیلتی چلی گئیں۔ سخت نامساعد حالات کے اندر
مسرت کی یہ آمد اتنی خوش کن تھی کہ بدن میں پھول ہی پھول کھلتے محسوس ہوئے۔ یہ
کارڈ میرے خلاف ایک ٹھوس ثبوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ جی چاہا اس ثبوت کو تمغے کی
طرح اپنے سینے پر سجالوں اور اٹھ کر ناچنا شروع کردوں۔

"ہاں چن جی! اب تمہارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہی جو اس سے پہلے تھا۔ آپ خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ

رفیق کا قاتل ڈھونڈنا چاہتے ہیں مگر اس کے لئے آپ نے بالکل غلط راستہ اختیار کیا ہے۔"

"تو صحیح راستہ تم بتادو۔"

"میں صحیح راستہ نہیں بتا سکتا مگر پورے بھروسے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو
راستہ آپ نے چنا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔"

"یہ صحیح راستہ ہے جب تمہیں ننگا کرکے چھت سے الٹا لٹکایا جائے گا تو تمہیں خود
نظر آئے گا۔"

"تم ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔" کاشف چیخ کر بولا۔ "چوبیس گھنٹے پورے
ہونے سے پہلے تمہیں ہم دونوں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ تمہیں ریمانڈ لینا
پڑے گا۔"

انسپکٹر نے قہقہہ لگایا۔ "جب ضرورت پڑے گی ریمانڈ شمانڈ بھی لے لیں گے۔ فی
الحال تو ہم ہی یہاں مجسٹریٹ ہیں اور ہم ہی مجسٹریٹ کے باپ ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں انسپکٹر۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ دن میں تارے نظر نہ آئے تو
میرا نام کاشف نہیں۔"

"ہم پچھتائیں گے تو تب جب تمہیں زندہ چھوڑنے کی غلطی کریں گے۔ اگر اپنی
زبان نہیں کھولو گے تو یہیں مار کر گاڑ دوں گا تمہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھنے کی جرأت
نہیں کرسکتا۔" انسپکٹر کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہوگیا اور اس نے ایک ہی سانس میں
کاشف کو درجن بھر گالیاں دے ڈالیں۔ ان گندی گالیوں کو سن کر انیلا کا زرد رنگ کچھ اور
زرد ہوگیا تھا۔

میں نے انسپکٹر کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔ "مگر جناب عالی! آپ ایک بے
سروپا الزام کیوں لگا رہے ہیں ہمارے اوپر؟"

اس نے اپنی چھڑی بے رحمی سے میری گردن میں چبھوئی۔ "یہ بے سروپا الزام
نہیں ہے چن جی۔ ہمارے پاس پورے ثبوت ہیں۔ لاہور میں حسن پری سے تمہارا عشق
ثابت ہو ہی گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ تم نے ایبٹ آباد میں
حسن پری کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ آج کل بھی تم اپنے اس لنگوٹیے دوست کے ساتھ
ہوٹل ذیشان میں موجود تھے۔ تم نے یہاں ملنے جلنے والوں کو بتا رکھا تھا کسی دستاویزی

فلم شلم کے چکر میں یہاں آئے ہوئے ہو۔ یہ سراسر جھوٹ تھا' تم اپنی جند جان سے ملاقاتیں کرنے کے لئے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلاول احمد کی غیر موجودگی میں تم کو اس کے گھر گئے ہو اور آرزو سے ملاقاتیں کی ہیں۔ آرزو کی ماں بھی اس چکر میں تم ملی ہوئی تھی۔ وہ خاوند کو دھوکا دے کر تم دونوں کا ٹانکا فٹ کرانا چاہتی تھی۔ مگر خاو ارادے کا پکا تھا۔ وہ اپنی مرضی کر کے رہا اور تمہاری جند جان کی شادی کر دی۔ رقابت اندھے ہو کر تم نے شادی کی رات ڈاکٹر رفیق کو قتل کر دیا اس نیک کام میں تمہاری جان نے بھی تمہاری پوری مدد کی اور بعد ازاں تمہیں کھڑکی کے راستے گھر سے کرا دیا۔"

میں بڑے سکون سے تھانیدار کے الزامات سنتا رہا۔ کاشف چپ نہیں رہ سکا کر بولا۔ "ہوش کے ناخن لو انسپکٹر۔ مہمانوں سے بھرے ہوئے گھر میں ایک اجنبی داخل ہوا اور کیسے جاکر حجلہ عروسی میں چھپ گیا؟"

"یہی سب کچھ تو پوچھنا ہے تم دونوں یاروں سے۔" انسپکٹر نے خوفناک انداز اوپر نیچے سرہلایا۔ "تم دونوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر رفیق کی موت معمہ بن جائے گی سے پہلے بھی تمہاری جند جان کا ایک شوہر شادی کی رات مارا گیا تھا اور اس سے پہلے شاید اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہو چکا ہے۔ تمہیں پوری توقع تھی کہ یہ معاملہ رنگ اختیار کر جائے گا۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"آپ نے اب تک جو بھی فرمایا ہے وہ الف سے یے تک غلط ہے۔" کہا۔

اتنے میں اس دور افتادہ تھانے (پولیس چوکی) سے باہر ایک گاڑی آکر رکی جیپ وغیرہ تھی۔ کچھ دیر بعد چند پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان میں دو مرد لیڈیز اہلکار تھیں۔ ان کے ساتھ آرزو تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ حسب معمول میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔ صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے رہے تھے۔

لیڈیز اہلکاروں نے آرزو کو لا کر موٹی توند والے انسپکٹر بابر کے سامنے بٹھا دیا۔ شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر کرخت لہجے میں بولا۔ "لڑکی! میں بہت

کرنے والا بند ہوں۔ اگر میرا ٹائم ضائع کرو گی تو میرا میٹر گھوم جائے گا اور میٹر گھوم گیا تو سمجھ تمہارا حشر خراب ہو گیا۔ بہتر ہے کہ جو سچ ہے وہ ابھی اگل دو' کیونکہ سچ تو تمہیں بہرحال بولنا ہی ہے۔"

"میں کیا بولوں انسپکٹر صاحب!" آرزو نے روہانسی آواز میں کہا۔ "مجھے جو کچھ معلوم تھا میں نے ان دونوں کو بتا دیا ہے۔" آرزو نے لیڈی اہلکاروں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک اے ایس آئی تھی اور خاصی خوفناک صورت کی تھی۔

"یہ ایسے نہیں مانے گی۔" انسپکٹر بولا۔ "اسے پچھلے کمرے میں لے جاؤ۔" اس نے لیڈیز اہلکاروں کو حکم دیا۔

آرزو کا زرد رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ انیلا نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ غالباً وہ بے چاری اس سے پہلے لیڈیز اہلکاروں کا حسن سلوک ملاحظہ کر چکی تھی۔

آرزو نے احتجاج کے طور پر کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آسکے۔ "کیا بک رہی ہو۔ یہ چادر تو منہ سے ہٹاؤ۔" لیڈیز اہلکار نے بھنا کر کہا اور چادر کا پلو آرزو کے چہرے سے کھینچ لیا۔

کھینچنے سے چادر اس کے سر پر سے بھی جزوی طور پر اتر گئی۔ اس کے ریشمی بال چہرے پر بکھر گئے۔ مرد اہلکاروں کی نگاہیں جیسے اس بے پردہ حسن کو دیکھ کر جل اٹھی تھیں۔ کئی سیکنڈ تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر انسپکٹر بابر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "دیکھ لڑکی' یہ پولیس چوکی نہیں......... سمجھ یہ دنیا کا دوسرا کنارہ ہے۔ یہاں سے تیری آواز باہر جا سکتی ہے اور نہ تیرے کسی مددگار کی آواز یہاں پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا مناسب بات تو یہی ہے کہ تو ہمارے ساتھ تعاون کرے اور تیری جان جلد سے جلد یہاں سے چھوٹ جائے۔"

لیڈیز اے ایس آئی پھنکار کر بولی۔ "سر! اس کی معصوم صورت پر نہ جائیں اندر سے بڑی خرانٹ اور ڈھیٹ ہڈی ہے۔ اس نے باتوں سے نہیں ماننا۔ آپ اسے میرے ساتھ بھیجیں' ابھی دس منٹ میں تیر کی طرح سیدھا کر کے لے آؤں گی۔" اس کے سیاہی مائل چہرے پر خشونت ہی خشونت تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کافی اذیت پسند قسم کی عورت ہے۔

دوسری اہلکار نے آرزو کو باقاعدہ بازو سے پکڑ لیا تھا۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر صاحب، میں آپ سے کچھ کہنا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر نے چند لمحے سوچا، پھر سنتری کو ہدایت کی کہ وہ میری ٹانگ کا کڑا کھول ٹانگ آزاد ہوگئی تو میں انسپکٹر کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ انسپکٹر کے نزدیک میں تھا مگر وہ میری نسبت کاشف سے زیادہ الرجک تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ک مسلسل بولتا رہا تھا اور پولیس والوں کو دھمکاتا رہا تھا۔ انسپکٹر کا خیال تھا کہ میں زیادہ فہم اور ٹھنڈے مزاج کا ہوں۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "آپ مجھے اکیلے میں صرف منٹ آرزو سے بات کرنے کا موقع دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے آرزو آپ سے کچھ چھپائے گی اور نہ میں......... جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ ہم حلفاً بتا دیں گے۔"

انسپکٹر عقابی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ کتنی ہی دیر اس گزر گئی پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے جن جی! لیکن ایک بات یاد رکھ صرف اور صرف ایک موقع دیا کرتا ہوں۔"

مجھے توقع نہیں تھی کہ انسپکٹر میری بات یوں آسانی سے مان جائے گا۔ شاید آ حسن بلاخیز دیکھ کر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا ہوا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ خوبصو جگہ اپنے لئے رعایتی نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ چند منٹ بعد میں اور آرزو ایک بند ک میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ہمیں کمرے میں داخل کرنے سے پہلے اچھی طرح جامہ تلاشی لی گئی تھی۔ کمرے میں صرف ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہیڈ کانسٹیبل مسلسل نگران نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ بہرطور آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ کمرا اس پولیس چوکی کا سٹور روم رہا ہو گا۔ کو پر اہلکاروں کی بدبودار وردیاں جھول رہی تھیں۔ ایک دو جستی ٹرنک تھے جن پر رجسٹروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ گرد آلود فرش پر چڑیوں کی بیٹیں تھیں۔ اس "لو اسپاٹ" دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور میں آرزو کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ آج میری نگاہ میں

ایسا بانکپن تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ ایک ایسا جوش میرے سینے میں بھرا ہوا تھا جس کے سامنے سات سمندروں کی طغیانی بھی ہیچ تھی۔ قریباً ایک برس پہلے لکھے گئے عید کارڈ کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور میرے اندر حوصلے اور ہمت کا ایک پہاڑ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "آرزو! آپ نے تو شاید سو سال تک بھی اظہار محبت نہیں کرنا تھا، اپنے اور میرے تعلق کو بس دوستی کا نام دیتے رہنا تھا، لیکن آپ کی تحریر نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے بھی انسپکٹر کی میز پر اپنا عید کارڈ دیکھ لیا ہے۔"

وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ خوف شرم اور پریشانی نے مل جل کر اس کے عرق آلود چہرے پر عجیب رنگ بکھیر دیئے تھے۔ میں نے اعتماد سے کہا۔ "آرزو! میں آپ کو کوئی دوش نہیں دیتا اور نہ ہی دے سکتا ہوں۔ اگر کوئی سبب نہ ہوتا تو بھی مجھ سے دور رہنا آپ کا حق تھا۔ مگر یہاں تو ایک ناگزیر اور اٹل سبب موجود تھا۔"

وہ سسک کر بولی۔ "میں......... میں آپ کو خود سے دور رکھنا چاہتی تھی......... اور اب بھی چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے جلال! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے منحوس سائے سے دور چلے جائیں۔ اتنی دور کہ آپ کا خیال بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ میں آپ کو......... میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں جلال! اگر آپ نے میری بات نہ مانی، تو میں قسم کھاتی ہوں، میں اپنی جان لے لوں گی......... میں قسم کھاتی ہوں۔" اس کے لہجے میں ایک ہیجان تھا۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آرزو! اگر میں بھی قسم کھاؤں کہ مجھے اپنے جذبے کی سچائی پر یقین ہے اور اس بات پر یقین ہے کہ کوئی خوف آسیب ہماری راہ میں حائل نہیں ہو سکتا اور قدرت ہمیں ملا کر رہے گی تو پھر؟"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جلال! آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ آپ نے تین بار دیکھا ہے۔ آپ نے ابو کی موت دیکھی ہے، پھر بھی آپ یقین نہیں کر رہے۔"

"مجھے یقین ہے اور اس سے زیادہ یقین مجھے اپنے آپ پر ہے۔ میں پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ تک پہنچنے کے لئے ہر خوف ہر اندیشے کو ٹھوکروں سے اڑا دوں گا۔ اگر آپ کو بھروسا نہیں آرزو تو ابھی اپنا ہاتھ بڑھایئے، میں آپ کا ہاتھ تھام کر

اور خدا کو گواہ بنا کر آپ کو اپنی زندگی میں شریک کرتا ہوں۔"

وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "خدا کے لئے جلال! ایسی باتیں منہ سے
نکالیں۔ آپ........ مجھے خودکشی پر مجبور کردیں گے۔ میں حرام موت مرنا نہیں چاہتی۔
اگر آپ........" اس کی آواز بھرا کر خاموش ہوگئی۔

"یہ میری زندگی ہے آرزو۔ تمہارے بغیر بھی تو اسے ختم ہونا ہے۔
ہو جائے گی تو کیا پرواہ۔ ایک بار تمہیں چھو تو لوں گا........ تمہیں سینے سے تو لگا لوں
میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ ایک عجیب سی دلیری میرے اندر بھری گئی تھی۔
زدہ لو اسپاٹ پر یہ انوکھی ملاقات تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ آرزو کی طرف بڑھایا تو وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ اچانک کم
طرف مدہم سی آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک کالی سفید بلی آہنی سلاخوں
موجود تھی۔ اس کا آدھا دھڑ سلاخوں سے اندر اور آدھا باہر تھا۔ بلی کی نہایت
آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ اس کے جسم کے بال کھڑے ہوگئے تھے اور حلق سے
عجیب غراہٹ نکل رہی تھی۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ اگر میں چند سیکنڈ اسی طرح کھڑا رہا
بلی جست کرے گی اور اپنے نوکیلے پنجوں سے میرا چہرہ ادھیڑ دے گی۔ آرزو کی نگاہ
پر پڑ گئی تھی۔ آرزو سے بلی کا فاصلہ بمشکل دو گز تھا' بلی کو اور اس کے خوفناک انداز
دیکھ کر آرزو کے ہونٹوں سے چیخ نکلی اور وہ کمرے کے دوسرے گوشے میں سمٹ گئی۔

آرزو کی چیخ بلند ہوتے ہی دروازے سے باہر دوڑتے قدموں کی آواز آئی
دروازہ دھماکے سے کھل گیا۔ سب انسپکٹر وصی جان دوڑ کر اندر آیا۔ ریوالور اس کے
میں تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

ہم نے ایک ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ خونخوار صورت والی بلی غائب
تھی۔ آرزو کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

"کیا شور مچا دیا تھا۔" وصی جان گرج کر بولا۔

"یہ جانوروں سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں' ابھی یہاں کھڑکی میں ایک بلی تھی۔"
نے وضاحت کی۔

"جانوروں سے ڈرتی ہے تو پھر سب کچھ صاف صاف اگل دے۔ یہاں بڑے بڑے
موجود ہیں۔"

وصی جان ہم دونوں کو دوبارہ انسپکٹر بابر کے کمرے میں لے گیا۔ انسپکٹر بابر نہانے گیا
تھا واپس آیا تو ایک بار پھر ہم سے سوال جواب شروع کردیئے۔ اس مرتبہ کمرے میں
اور اے اور آرزو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "انسپکٹر! میں اور آرزو اپنے
لوں لے پر قائم ہیں۔ ہم آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیں گے۔ بالکل جیسے شیشہ صاف
اس ہے۔ مگر ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ آرزو ابھی نارمل نہیں ہیں۔"
بلی والے واقعے کے بعد سے وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔ جیسے سخت سردی لگ رہی
اس کے سرخ رسیلے ہونٹ' نیلگوں ہو کر رہ گئے تھے۔ خود میں بھی ذہنی طور پر منتشر
بلی کا خوفناک انداز ابھی تک نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور تھانے میں پھرنے والی اس
تھ بلی نے یہ انداز عین اس وقت اختیار کیا تھا جب میرے اور آرزو میں نہایت اہم
ہو رہی تھی۔ یہ بلی جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر ہمارے درمیان آگئی تھی۔ مجھے
تھا کہ اگر میں آروز کی طرف ایک قدم اور بڑھایا تو وہ مجھ پر حملہ آور ہو جاتی۔ شاید
بھ درست ہی کہتی تھی' کوئی ہر وقت اس کے آس پاس موجود رہتا ہے۔ اتنا قریب کہ
ا کے سانسوں کی سرسراہٹ سنتی ہے۔

میں نے انسپکٹر سے کچھ دیر کی مہلت مانگی تھی مگر اس نے مہلت دینے سے انکار
وہ بولا۔ "میرے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے۔ مجھے اوپر
ٹ دینی ہے۔ تم دونوں نے اگر کچھ بکنا ہے تو فوراً بک دو' ورنہ میں اپنا طریقہ کار
کروں گا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی' اس کا رویہ ایک دم پھر سے سخت نظر آنے لگا تھا۔
میں نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب' جو کچھ ہمارے ساتھ بیت رہی ہے وہ بالکل نئی چیز
دسکتا ہے کہ اس سے پہلے آپ کے تجربے میں نہ آئی ہو۔ اس لئے مجھے شک ہے
پ ہماری باتوں پر یقین نہیں کریں گے اور آخر میں یہی کہیں گے کہ ہم نے آپ کا
مائع کیا ہے۔ لیکن........؟"

"لیکن یہ سب کچھ سچ ہے انسپکٹر صاحب۔" آرزو نے سسک کر میرا جملہ مکمل

میں نے شروع سے آخر تک ساری کتھا کہانی حرف بحرف تھانیدار بابر کو سنا دی۔ اس کتھا کو مکمل کرنے میں گاہے گاہے آرزو بھی میرا ساتھ دیتی رہی۔ بیچ بیچ میں بابر نے سوالات بھی کیئے۔ کبھی اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آتی رہی' کبھی وہ زیر لب میں مسکراتا رہا۔ کہتے ہیں کہ سچائی کیسی بھی ہو دل پر اثر کرتی ہے۔ ہماری کہانی نے مجموعی طور پر انسپکٹر' بابر پر اثر کیا۔ اس کے علاوہ وہ آرزو کے چکا چوند حسن سے بھی قدرے مرعوب نظر آرہا تھا۔ اس کتھا کے اختتام تک انسپکٹر بابر کے لہجے کی تھانیداری' کچھ کم نظر آنے لگی۔ مجھے یہ امید پیدا ہوگئی کہ ہم شاید پولیس کے تشدد سے بچ جائیں گے۔

مگر پھر یوں ہوا کہ ایک اور شخص آندھی طوفان کی طرح تھانیدار کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس شخص کو انسپکٹر بابر کا باپ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ بھی قوی ہیکل، کھڑی مونچھوں اور کرخت چہرے والا ایک موٹی کھال اور موٹے دماغ کا بندہ تھا۔ اس کا نام ڈی ایس پی ریاض ساہی تھا۔ بابر کی طرح اس کی زبان بھی خوب گندی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شاید بہرہ بھی تھا۔ اس نے ہم میں سے کسی کی ایک نہیں سنی۔ آتے ہی اس نے آرزو اور انیلا کو تو لاک اپ میں بھجوا دیا اور ہمیں عقوبت خانے میں لے جا کر زبردست تشدد شروع کرا دیا۔ ہمارے کپڑے اتار کر ہمیں چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا اور مار مار کر بے ہوش کردیا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں کاشف پر تین بار اور مجھ پر ایک بار بے ہوشی طاری ہوئی۔ وہ بڑا ظالم دن تھا۔ ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ ہوگا۔ ہم جانوروں کی طرح مار کھا رہے تھے اور بری طرح چیخ رہے تھے۔ جب دیکھا جاتا تھا کہ اذیت کی کند چھری ہم پر کم اثر کر رہی ہے تو ہماری حسیات کو بیدار کرنے کے لئے ہمارے چہروں پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے تھے اور تھوڑا سا وقفہ دے دیا جاتا تھا۔

نیا آنے والا ڈی ایس پی ریاض ساہی ہم دونوں سے یہ اعتراف کرانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رفیق کو شادی کی رات موت کے گھاٹ اتارنے میں ہم نے آرزو کا ساتھ دیا تھا۔ باالفاظ دیگر وہ ہمیں اعانت جرم میں ملوث کرنا چاہتا تھا۔

اس بات کا ہمیں بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ یہ لوگ ہمیں براہ راست قتل میں ملوث نہیں کرسکتے اور اگر کریں گے تو کیس بہت کمزور ہوجائے گا۔ وہ ہمیں قتل کی پلاننگ میں ملوث کر رہے تھے۔

سہ پہر دو ڈھائی بجے ہمیں چھت سے اتار کر ٹھنڈے فرش پر پاس پاس لٹا دیا گیا۔ ہمارے جسم پھوڑا ہو رہے تھے۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے اور میری ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہوگئی تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہمارے حوصلے ٹوٹے نہیں تھے' بلکہ شاید ہم دونوں کے اندر کی شوخی اور لطافت بھی برقرار تھی۔ کاشف نے کراہتے ہوئے مجھے گالی دی اور بولا۔ "تم سے کہا تھا ناں کہ ہر کام کا ایک ٹائم ہوتا ہے۔ سات آٹھ سال پہلے عشق کیا ہوتا تو یوں کھوتے کی طرح مار تو نہ پڑتی۔ لڑکپن میں ہر خطا معاف ہوتی ہے۔ آس پاس والے بھی کہہ دیتے ہیں' بچہ ہے جی بچہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "پکی عمر کا ہر کام پکا ہوتا ہے۔ مار بھی پکی پڑتی ہے اور عشق بھی بڑا پکا ہوتا ہے۔"

"اوئے پکا تیری ماں کا سر تھا؟ یہ تو میں نے پکا کیا ہے۔ تجھے ایبٹ آباد لے کر آیا ورنہ تو تو وہاں لاہور میں بیٹھا تھا کشتیاں ڈبو کے۔"

"بڑا شکریہ تیرا یار ایبٹ آباد لانے کا۔" میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور کراہ کر رہ گیا۔

"چن جی' ابھی تو شکریے کے اور بڑے موقعے ملیں گے۔ آگے آگے دیکھو۔" کاشف نے انسپکٹر بابر کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"یار مجھے تو لڑکیوں کی فکر ہے۔ اگر انہوں نے آرزو کے ساتھ کچھ کیا تو میں کچھ کر لوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کریں گے۔ ڈی ایس پی کی باتوں سے لگتا ہے کہ کل انہیں ریمانڈ کے لئے پیش کیا جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں پیش نہیں کیا جائے گا؟"

"الٹا لٹک کر تیرا دماغ بالکل ٹھس ہوگیا ہے۔ بھول جا اب ریمانڈ شانڈ کو۔ ریمانڈ ہوتا تو اس طرح ہماری توڑ پھوڑ نہ کرتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہوں نے اگلے دس بارہ دنوں تک ہماری گرفتاری ہی نہیں ڈالنی۔"

شام کے کھانے کے بعد پھر ہماری خاطر تواضع شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ
بھی ہماری میزبانی کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس نے بڑی محبت اور شفقت کے
نگرانی میں میری ٹانگوں پر چار پانچ منٹ رولر پھروایا اور گالیاں بکیں۔ اب ہمیں
اندازہ ہوا کہ میری اور آرزو کی تنہا ملاقات کے فوراً بعد انسپکٹر بابر کا رویہ دوبارہ
کیوں ہو گیا تھا۔ درحقیقت کاٹھ کباڑ سے اٹے ہوئے جس گرد آلود اسٹور میں
آرزو کی ملاقات ہوئی تھی وہاں ایک مخبر بھی موجود تھا۔ یہ پولیس اہلکار لکڑی کی
آدم الماری کے اندر چھپا ہوا تھا اور اس نے ہم دونوں کی باتیں بڑے قریب
تھیں۔ ملاقات میں چونکہ ہم دونوں نے رومانوی مکالمے کے علاوہ کوئی بات نہیں
لہٰذا ہماری ملاقات کے فوراً بعد انسپکٹر بابر بھنا گیا تھا۔

شام کے "سیشن" میں ہماری جان جلد ہی چھوٹ گئی کیونکہ انسپکٹر بابر اور
پی ریاض ساہی کو فوری طور پر کہیں جانا پڑ گیا تھا۔ ٹانگوں پر رولر کا پھیرا جانا ایک
ناک تجربہ ہوتا ہے، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ میری قوت برداشت عام افراد سے
ہی تھی۔ خاص طور سے جسمانی تکلیف سہنے کی گنجائش مجھ میں زیادہ تھی اور اس
وہ سخت ورزشیں اور جسمانی مشقتیں تھیں جو میں مارشل آرٹ کے سلسلے میں
سے کر رہا تھا۔ میری ٹانگیں پھوڑا بن گئی تھیں مگر جب میں کچھ دیر لاک اپ کے
گھوما پھرا تو درد کم ہو گیا۔

میں نے اور کاشف نے اہلکاروں سے کئی بار آرزو اور انیلا کے متعلق
انہوں نے کوئی ٹھوس جواب نہیں دیا۔ بس یہی بتایا کہ وہ اسی عمارت میں ہیں
خیریت سے ہیں۔ یہ زیادہ بڑی عمارت نہیں تھی۔ اگر خدانخواستہ ان پر تشدد ہوا
لاعلم نہ رہتے۔ گرجنے برسنے یا چیخنے چلانے کی آواز ہم تک پہنچ جاتی۔ وہ رات
نے درد سے کراہتے ہوئے آنکھوں میں کاٹ دی۔ سرد ہوا اس قدیم عمارت کے
فراٹے بھرتی رہی اور کچھ ان کہی سرگوشیاں کانوں میں گونجتی رہیں۔ صبح سویرے
پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔ پتہ نہیں کیسی کیسی اذیت ہماری منتظر تھی۔
باہر سے کوئی ہماری خبرگیری کو نہیں پہنچ سکا تھا اور تو اور کاشف کا صحافی دوست
ہمارا سراغ ابھی تک نہیں پا سکا تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے کیا چکر چلایا تھا۔ مجھے

جس ہوٹل سے ہمیں اٹھایا گیا تھا وہاں کا مالک انسپکٹر بابر کا یار بیلی تھا۔ اس نے کسی کو
کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی کہ ہم کہاں گئے ہیں۔

اگلا دن بھی اسی عمارت میں شدید خوف کے زیر سایہ گزر گیا۔ گاہے گاہے ہم سے
زبانی اور دستی تفتیش بھی ہوتی رہی۔ سہ پہر کے وقت میں نے آرزو کی آواز سنی۔ وہ کسی
پولیس اہلکار سے مخاطب تھی۔ "مجھے جانے دو۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں یہاں
نہیں رکوں گی۔ میں نہیں رک سکتی۔"

پولیس اہلکار بولا۔ "ہم آپ کو اجازت نہیں دے سکتے۔ بی بی بڑے اور چھوٹے
صاحب دونوں اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ آپ مہربانی کر کے اندر چلیں۔"

"مجھے جانا ہے۔ مجھے مت روکو۔ ورنہ تمہارا نقصان ہو جائے گا۔" آرزو کی آواز
پھر ابھری۔

اس کی آواز کے زیر و بم نے مجھے اور کاشف کو چونکا دیا۔ وہ عجیب خوابیدہ لہجے میں
بول رہی تھی۔ جیسے کوئی شدید نشے میں ہو۔ وہ اس انداز میں تو نہیں بولا کرتی تھی، لیکن
اسے کوئی نشہ آور چیز تو نہیں دی گئی تھی۔

پھر آہٹوں اور آوازوں سے اندازہ ہوا کہ لیڈیز اہلکار وہاں پہنچ گئی ہیں اور وہ آرزو
کو کھینچ گھسیٹ کر واپس لاک اپ میں لے گئی ہیں۔ آرزو آخر تک یہی پکارتی رہی تھی۔
"مجھے جانا ہے......... مجھے جانا ہے۔"

وہ کہاں جانے کی بات کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں ان گنت اندیشے سر اٹھانے
لگے۔ کل بھی مجھے آرزو کی ذہنی حالت ابتر نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر
جھرجھری سی آتی تھی۔ کوئی شے تھی جو اسے اپنی طرف کشش کر رہی تھی اور وہ اس
کشش سے بچنے کی کمزور سی کوشش میں مصروف تھی۔ ہماری اگلی رات بھی سردی سے
کانپتے اور اندیشوں سے الجھتے ہوئے گزر گئی۔ اگر کسی وقت نیند آئی بھی تو فوراً آنکھ کھل
گئی۔ عین سر پر بلب روشن تھا اور مچھروں کی یلغار بھی تھی۔ پتہ نہیں تھا کہ یہ لوگ ہم
سے کیا کرنا چاہ رہے تھے۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اس پولیس چوکی میں کچھ ہلچل سی نظر آئی۔ ڈی ایس پی
ریاض ساہی، انسپکٹر بابر خان اور ایک سب انسپکٹر تینوں یہاں موجود تھے اور سر جوڑے

بیٹھے تھے۔ پولیس اہلکار بھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بار بار چوکی کا پتھریلا فرڑ
سلیوٹ کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دو جیپیں بار بار اس پولیر
میں آجا رہی ہیں۔ یہ صورت حال شام تک جوں کی توں رہی۔ شام کے وقت ہ
انسپکٹر بابر کو وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی پیٹی بھائی سے بات کرتے سنا۔ انسپکٹر کی آوا
گہری تشویش تھی۔ اس تشویش کے اظہار کے لئے وہ بے تحاشا گالیاں بھی بک ر
انسپکٹر کی گفتگو سے یہ انکشاف ہوا کہ آرزو اس وقت پولیس چوکی میں موجود نہ
دراصل آرزو کو کل شام ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ عجیب جنونی انداز میں مسلسل ضد کر
تھی کہ وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے پولیس والوں نے اس کے خلاف اپنا روایتی حربہ از
کیا تھا۔ یعنی ملزم کو چھوڑ دو' پھر اس کا پیچھا کرو کہ وہ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا
سب انسپکٹر وصی جان ایک دوسرے اہلکار کے ساتھ آرزو کے تعاقب میں گیا تھا۔ اب
واقعے کو قریباً چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ دونوں اہلکاروں کا پتہ تھا اور نہ آرزو کا۔ اب
عملہ ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ڈی ایس پی ریاض بگولے کی طرح لاک اپ
طرف آیا۔ اس کے ساتھ مسلح کانسٹیبل بھی تھے۔ اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ ہم دو
کو لاک اپ سے نکالا جائے۔ آثار سے اندازہ ہو گیا کہ ایک بار پھر زبردست تشدد کا سلہ
شروع ہونے والا ہے۔ کاشف نے ٹھنڈی سانس لے کر سرگوشی کی۔ "لے تیرے!
مزید شکر گزاری کا موقع پیدا ہونے لگا ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی عیش کر
گے۔"

"یہ عیش میں کرا رہا ہوں۔ تم زبردستی کریڈٹ لے رہے ہو۔"

خونخوار کانسٹیبلوں نے ہمیں بازوؤں سے دبوچا اور گن پوائنٹ پر ایک بار پھر ٹار
سیل میں لے آئے ہم بمشکل چل پا رہے تھے۔ ٹارچر سیل کا منظر دیکھ کر ہم چونک گئے
ہماری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ آرزو کی دوست انیلا یہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ ب
پاؤں سے ننگی تھی۔ شانے پر سے قمیض بھی ادھڑی ہوئی تھی۔ خوفناک صورت والی لیڈ
اے ایس آئی نے دہشت زدہ انیلا کو چارپائی پر گرایا ہوا تھا اور دوسری اہلکار اسے چارپا
کے ساتھ رسی سے باندھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انیلا گھٹی گھٹی آواز میں چیخ رہی
اور ان کی منتیں سماجتیں کر رہی تھی۔

کل میرے اور کاشف کے ساتھ بھی ایک گھنٹے کے لئے اس قسم کا سلوک ہو چکا
میں چارپائیوں سے باندھا گیا تھا' پھر پیروں کے تلووں پر بے دردی سے بید رسید
ئے تھے۔ اس بید بازی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے تلوے سوج گئے تھے اور چلنا دشوار ہو گیا
اس انتہائی اذیت ناک تجربے کا تصور کر کے اور یہ سوچ کر مجھے کپکپی سی آ گئی کہ
اندام انیلا کے ساتھ یہ سلوک ہونے لگا ہے۔ میں نے ڈی ایس پی ریاض ساہی سے
"آپ ہمارے ساتھ جو چاہیں کر گزریں مگر خدا کے لئے اس پر رحم کریں۔"

وہ درندگی سے مسکرایا۔ "سب ہم سے رحم مانگتے ہیں' کوئی ہم پر رحم کیوں نہیں
پچھلے چوبیس گھنٹے سے تمہاری اس حرام زادی داشتہ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کھانا پینا
حرام ہو رہا ہے۔ تم ہم پر رحم کیوں نہیں کرتے۔ کیوں نہیں تعاون کرتے ہمارے
؟"

"کیسا تعاون؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ فی الحال تم یہ کر سکتے ہو کہ ہمیں ان ٹھکانوں کے بارے
بتا دو جہاں ہم اس وقت اس حرام زادی کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔ تم سب اس کتیا کے یار
تمہیں اس کے ٹھکانوں کا علم نہیں ہو گا تو اور کسے ہو گا۔"

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی ڈی ایس پی ایک دم آگ بگولا ہو گیا' نیم پاگل
بلائے ناگہانی کی طرح انیلا پر جا پڑا۔ بید سے اسے یوں مارنے لگا جیسے چارپائی سے کھٹمل
لنے کے لئے اسے ڈنڈے سے کوٹا جاتا ہے۔ انیلا کی چیخیں نکل گئیں۔ اپنا سر اور چہرہ
نے کے لئے اس نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے پھیلا رکھے تھے لیکن یہ ڈھال بھی اسے
یوں سے بچانے میں ناکام تھی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "بتا کہاں ہو گی وہ حرام زادی......... بتا
ماں ہو گی۔"

میں نے بے ارادہ آگے بڑھ کر ڈی ایس پی کو روکنا چاہا۔ مجھے اپنے راستے میں
ئل پا کر اس جنونی کا سارا غصہ میری طرف منتقل ہو گیا۔ وہ بے دردی سے مجھ پر بید
سانے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ جان لے کر چھوڑے گا۔ دوسری طرف لیڈیز پولیس اہلکاروں
نے انیلا کی ٹھکائی شروع کر دی تھی۔ وہ اسے بید سے مار رہی تھیں اور وہ زمین پر لوٹ
ٹ ہو رہی تھی۔

ایک دم میری نگاہوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ میں نے ڈی
دھکا دیا' وہ قطعی توقع نہیں رکھتا تھا کہ میں اسے دھکا دوں گا۔ وہ لڑکھڑا کر
جا ٹکرایا۔ میری یہ جسارت دیکھ کر ہٹے کٹے کانسٹیبل بھڑک گئے۔ وہ نہایت
تیوروں سے میری طرف بڑھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ پچھلے چند سیکنڈ میں
بدل گیا ہے......... اب ان کے سامنے ماضی کا وہ نوجوان تھا جس کی ضرب کی دو
ہوئی تھی......... اور ان دیمک زدہ کانسٹیبلوں جیسے چار چھ افراد کے ہاتھ پاؤں توڑ
لئے چنداں مشکل نہیں تھا۔ آج اس ٹھٹھرے ہوئے ٹارچر سیل میں انیلا کی چیخ
میرا وہ برسوں پرانا عہد بکھر گیا تھا جو میں نے لاہور کلب میں حافظ عبدالواحد کی
بعد کیا تھا۔ میں انیلا کی بے حرمتی کے عوض اس عہد کو بچائے رکھتا تو شاید عمر بھر
مول لیتا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی ضرب کانسٹیبل کی پسلیوں میں لگائی' پھر
پلپلی ناف پر گھٹنا رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ پولیس اہلکاروں کے چہرے
ہو گئے۔ شاید میرا یہ رد عمل ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دو سیکنڈ
سی کیفیت میں رہے پھر وحشت میں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ غضب سے بھرے ہو
اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ لڑائی میں غضب ناک ہونا نقصان دہ ہوتا ہے.........ا
مدمقابل کے سامنے تو اور بھی نقصان دہ ہوتا ہے جو لڑائی بھڑائی کے فن سے بخوبی آ
میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو جھکائی دے کر اس کی چوڑی پشت پر ٹانگ رسید کی اور
ہی جھونک میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی.........م
رائفل اٹھالی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنی ہوئی سرخ چادر پھیلتی چلی جا رہی تھی
اس چادر کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا......... اگلے چند سیکنڈ میں' میں
ایس پی محترم ریاض ساہی سمیت چار پولیس اہلکاروں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ
اس کام میں کاشف نے بھی حسب توفیق میرا ساتھ دیا۔

دھما چوکڑی کی خوفناک آواز سن کر سیاہ چہرہ لیڈی اے ایس آئی بھی دوڑ
تھی۔ اس نے باقاعدہ اپنا پستول نکال لیا گیا۔ اب وہ اس تاک میں تھی کہ مجھ پ
کر سکے۔ میں نے بے دریغ اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ رائفل کی گولی کھا کر وہ چیخ
باہر کو دوڑی اور چوکھٹ سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر گئی۔ اس دوران میں ڈی ایس

ریاض میری گرفت میں آگیا۔ میں نے اس کی گردن پورے زور سے اپنے بازو کے شکنجے
میں جکڑی تو اس کی زبان باہر نکل آئی اور حلق سے گھیں گھیں کی دلکش آواز نکلنے لگی۔
میرے اوپر وہی مثال صادق آ رہی تھی کہ جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا
ڈرنا۔

میں نے ڈی ایس پی کے ہولسٹر سے بھرا ہوا پستول کھینچا اور اس کی نال بے دریغ
اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ ڈی ایس پی کا بدن ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے اہلکار بھی دم
بخود کھڑے رہ گئے۔ کھڑے رہ جانے والوں میں صرف دو افراد شامل تھے کیونکہ تیسرے کی
ران کی ہڈی کڑک ہو گئی تھی اور وہ ٹھنڈے فرش پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ جو
کھڑے تھے ان میں سے بھی ایک کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ میں موٹے تازے ڈی ایس پی
کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔
درحقیقت چوکی میں اس وقت یہی چار پانچ اہلکار موجود تھے۔ باقی یقیناً آرزو اور سب انسپکٹر
وصی جان کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ برآمدے میں ایک میز اور چند کرسیاں رکھی
تھیں۔ یہاں ایک وائرلیس سیٹ بھی پڑا تھا۔ یہی وائرلیس سیٹ تھا جس پر میں نے کچھ دیر
پہلے انسپکٹر بابر کو اپنے کسی چیٹی بھائی سے بات کرتے سنا تھا۔ میں نے کاشف کو اشارہ کیا'
اس نے وائرلیس سیٹ میز سے اٹھا لیا۔ ایک خستہ سی موٹر سائیکل بھی پاس ہی کھڑی تھی۔
کاشف نے اس کے اگلے پہیے میں رائفل کا فائر مارا اور ٹائر بے کار کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد
ہم دونوں اس منحوس عقوبت خانے سے باہر تھے ڈی ایس پی کی ذاتی جیپ چوکی سے باہر
موجود تھی۔ ہم دونوں ڈی ایس پی سمیت جیپ میں آ گئے۔ آرزو کی سہیلی انیلا کو میں نے
ساتھ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرح وہ بھی سنگین پولیس مقابلے کی ملزم ٹھہرتی
اور گوناگوں مشکلات کا شکار ہو جاتی۔

میرے اشارے پر کاشف نے ڈی ایس پی کی جیب سے چابی نکالی اور ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ڈی ایس پی کراہ کر بولا۔ "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ابھی بھی وقت ہے۔ ورنہ
بہت پچھتانا پڑے گا۔"

"پچھتائیں گے۔" میں نے غرا کر کہا۔

"ایسا مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ رعایت کردوں گا۔"

"پیش کش کا شکریہ، اب چپکے بیٹھے رہو ورنہ بھیجا پھاڑ دوں گا۔" میں نے پستول کی نال اس کی چربی دار گردن میں گھسیڑی تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"کیوں تکلیف ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی اور سخت ناہموار راستے پر آگے بڑھنے لگی۔ ہمارے چاروں طرف گھنے درخت تھے اور تاریکی تھی۔ ایک بہت بڑا...... بہت بڑا قدم میں نے اٹھایا تھا۔ مگر مجھے اس قدم کے اٹھائے جانے کا ذرا بھی غم نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، ایک عجیب طرح کی بے خودی اور سرشاری دل و دماغ میں بھری گئی تھی۔ رہ رہ کر آرزو اور عید کارڈ کی تحریر آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ سنگین ترین حالات کے باوجود میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ مجھے آرزو کی محبت حاصل ہے۔ اس محبت کے سہارے میں دنیا کی ہر مصیبت جھیل سکتا تھا۔ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ پریشانی صرف ایک ہی تھی۔ میرا دوست...... جان سے پیارا دوست بھی اس سارے معاملے میں ملوث ہوگیا تھا۔ وہ میرے ساتھ چوکی سے فرار ہوا تھا اور پولیس والوں کی ٹھکائی میں بھی اس نے میرا ہاتھ تو بٹایا تھا۔

پولیس چوکی سے قریباً تین چار میل دور آنے کے بعد راستہ اتنا دشوار ہوگیا کہ ہمیں جیپ کو خداحافظ کہنا پڑا۔ جیپ سے وائرلیس سیٹ نکال کر میں نے ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ کاشف نے جیپ کے چاروں پہیوں کی ہوا نکال دی۔ ڈی ایس پی کی پہلے ہی نکل چکی تھی۔ اب وہ خاموشی سے ہماری ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ جیپ کے اندر سے ہی ہمیں دو ہتھکڑیاں بھی مل گئیں۔ ہم نے ان ہتھکڑیوں کی مدد سے ریاض ساہی کو جیپ کے ساتھ نتھی کردیا۔ اب وہ جیپ کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر ہی واپس چوکی پہنچ سکتا تھا اور اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اگلے دس پندرہ سال میں بھی یہ کام ممکن نہیں تھا۔

جیپ اور جیپ والے کو وہیں چھوڑ کر ہم گھنے جنگل میں داخل ہوگئے۔ "یار! ہمارا رخ کدھر ہے؟" کاشف نے پوچھا۔

"تمہاری طرح میں بھی اندھیرے میں ہوں، ویسے میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ

مصیبتوں اور حادثوں کی طرف ہے۔ اگر تم...... کسی اور رخ پر جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔"

اس نے میری گدی پر ایک زور دار جھانپڑ رسید کیا اور سخت برا بھلا کہنے لگا۔ بولا کہ اگر آئندہ ایسی بات منہ سے نکالی تو یہ رائفل تجھ پر خالی کردوں گا۔"

ہمارے پاؤں پولیس کی مہمان نوازی کے سبب بری طرح سوجے ہوئے تھے، چلنا دشوار ہو رہا تھا لیکن ہمیں ہر صورت چلتے رہنا تھا۔ ہمارے پاس خوراک یا پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی، بس دو ہتھیار تھے۔ ایک سرکاری پستول اور ایک سرکاری رائفل۔ پستول میں کل پانچ گولیاں تھیں، جبکہ رائفل کے ساتھ اٹھائیس گولی والا میگزین اٹیچ تھا۔

سخت سردی اور تاریکی میں ہم نصف شب تک سفر میں رہے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم ایبٹ آباد سے ان پہاڑوں کی طرف نکل آئے ہیں، جن کا سلسلہ آگے جاکر نتھیا گلی اور ہراجانی وغیرہ سے ملتا ہے۔ نصف شب کے وقت ایک انتہائی اہم سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس پہاڑی ویرانے میں گھومتے ہوئے ہم سب انسپکٹر نبی جان اور آرزو وغیرہ کا کھوج پالیں گے۔ اس کو ایک زبردست اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ میری نگاہ جھاڑی میں اٹکے ہوئے ایک کپڑے پر پڑی۔ یہ کسی لباس کا ٹکڑا لگتا تھا۔ سائز رومال سے دوگنا ہوگا۔ ہم نے ٹکڑے کو بغور دیکھا۔ یہ سوتی تھا۔ تاریکی میں ٹھیک پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کیا شے ہے۔ بہرحال ہمارے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے۔ ہم نے اردگرد نظر دوڑائی۔

"وہ دیکھو، کھوہ سی نظر آرہی ہے۔" کاشف نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم محتاط قدموں سے کھوہ کی طرف بڑھے۔ ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں تھے۔

"بو آرہی ہے۔" کاشف نے ناک سکوڑ کر کہا۔

یہ خطرے کی دوسری گھنٹی تھی۔ ہم مزید محتاط ہوگئے۔ بُو کھوہ کے اندر سے آرہی ہے۔ ہم کھوہ میں پہنچے تو بھونچکے رہ گئے۔ یہاں دو انسانی جسم بے سدھ پڑے تھے۔ یہ لاشیں تھیں۔ آرزو کا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں ہر احتیاط بھول کر دیوانہ وار ان لاشوں کو ٹٹولنے لگا۔ تاریکی کے باوجود مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ دونوں "مردانہ لاشیں" ہیں۔

اچانک روشنی ہوگئی۔ میں نے تڑپ کر پستول سیدھا کیا، مگر یہ روشنی اجنبی نہیں

تھی۔ یہ ایک ٹارچ تھی جو کاشف نے لاشوں کے پاس سے اٹھائی تھی اور اب روشن
تھی۔ اس ٹارچ کی روشنی میں ایک کریہہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا اور ہم
میں رہ گئے۔ ہمارے سامنے سب انسپکٹر وصی جان اور اس کے ساتھی کی لاشیں
ان کے جسم بُو چھوڑ گئے تھے اور سینکڑوں کیڑے مکوڑے ان کے زخموں سے چمٹے
تھے۔ وہ دونوں سادہ کپڑوں یعنی شلوار قمیض میں تھے۔ وصی جان کی چربی دار گر
گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا غائب تھا اور گھاؤ میں سے اس کی کٹی پھٹی شہہ رگ جھانک
تھی۔ اس زخم کو دیکھ کر میری نگاہ میں کچھ دن پہلے کی وہ اخباری تصویر گھوم گئی
تعلق ویٹرنری ڈاکٹر رفیق مرحوم سے تھا۔ وصی جان کی جان لینے والا زخم ہو بہو ڈا
کے زخم سے ملتا تھا۔ میری نگاہوں میں بے اختیار پھر ایک کالا کتا گھوم گیا.........
کے ساتھی حوالدار کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ اس کے چہرے اور گ
کھرونچوں کے گہرے نشان تھے۔ ناف کے اوپر سے اس کا پیٹ ادھڑا ہوا تھا اور
کی سفید قمیض کے نیچے سے اس کی آنتیں جھانک رہی تھیں۔ خوف کا ایک
ہمیں اپنے آس پاس گرتا سنائی دیا۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آرزو کہاں ہے؟ میں نے ٹارچ کی روشنی ک
دوڑائی اور ذہن میں ہلچل مچاتے ہوئے اندیشے کچھ اور بھی سنگین ہوگئے۔ ہمار
نے گواہی دی کہ آرزو بھی اس کھوہ میں موجود رہی ہے۔ اس کا ایک سینڈل ایک گ
کے پاس اوندھا پڑا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی ہوئی چوڑیاں اور لباس کی چند دھجیاں بھی نظ
تھیں۔

میں ٹارچ لے کر دیوانہ وار کھوہ میں گھس گیا۔ کھوہ دس بارہ گز طویل رہی
آرزو اس میں موجود نہیں تھی۔ اس دوران میں کاشف نے دوسری ٹارچ بھی
تھی۔ ہم کھوہ کے چاروں طرف چکرانے لگے اور آرزو کو تلاش کرنے لگے۔ ا
خطرناک تھا مگر جب وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آئی تو ہم یہ خطرہ مول لینے کو بھی تیار
ہم نے اسے مسلسل آوازیں دیں' مگر اپنی ہی بازگشت کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔
کاشف نے دلگیر لہجے میں کہا۔ "جلال! مجھے لگتا ہے کہ آرزو کے ساتھ ک
ہے۔"

"کیا مطلب؟"
کاشف نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کا وہ ٹکڑا میرے سامنے کردیا جو شروع میں ہمیں جھاڑی سے اٹکا نظر آیا تھا۔ رگوں میں میرا خون جمنے لگا' یہ گلابی ٹکڑا آرزو کی چادر کا حصہ تھا۔ وہی چادر جو ہمہ وقت اسے پردہ پوش رکھتی تھی۔ ہم دوڑتے ہوئے واپس کھوہ میں آئے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے ایک بار پھر ٹارچوں کی روشنی میں بڑے دھیان سے کھوہ کا جائزہ لیا۔ شواہد بتا رہے تھے کہ شیطانی آنکھوں والے وصی جان نے یہاں شیطانیت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وصی جان کی لاش کے پاس ہی وہسکی کی کوارٹر بوتل پڑی تھی۔ اس میں بہت تھوڑی شراب باقی رہ گئی تھی۔ آرزو کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں' لباس کی دھجیاں' سینڈل اور دیگر شہادتیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ اس "ویرانے میں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو اپنی دسترس میں دیکھ کر وصی جان اپنے اندر کے شیطان کو قابو میں نہیں رکھ سکا۔ اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر آرزو کو پامال کرنا چاہا ہے اور نتیجے میں پُراسرار طور پر اذیت ناک موت کا شکار ہوا ہے۔

کیڑے مکوڑے منتشر ہوگئے تھے' لاشوں کے زخم مزید نمایاں ہوگئے تھے۔ وصی جان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دہشت منجمد ہوچکی تھی۔ کاشف نے کہا۔ "یہ صاف طور پر کسی جانور کا کام ہے۔"

"جانور کا نہیں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "یہ اس کتے کا کام ہے کاشی' جس نے ڈاکٹر رفیق کی جان لی تھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں......... اور مجھے خطرہ ہے کہ وہ کتا اس وقت بھی ہمارے آس پاس کہیں موجود ہوگا۔"

"یار تم ان حالات کو ضرورت سے زیادہ پُراسرار بنا رہے ہو۔" کاشف نے بیزاری سے کہا تاہم میری بات سن کر کاشف کی گرفت رائفل پر اور مضبوط ہوگئی تھی۔ دونوں ہاتھ رائفل پر رکھنے کے لئے اس نے ٹارچ نیچے دھر دی تھی ٹارچ کی روشنی زمین پر مختلف زاویے سے پڑی تو ایک نشان دیکھ کر ہم دونوں بری طرح چونک گئے۔ یہ پاؤں کا نشان تھا۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ آرزو کے پاؤں کا ہے۔

کاشف نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تلوے کو خون لگا ہوا تھا' اس لئے نشان رہ گیا ہے۔ شاید زخمی تھی وہ۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں مرداروں میں سے کسی کا خون ہو؟"
کاشف نے سرہلا کر تائید کی اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ نشان آگے بڑ
گا۔"

ہم ٹارچوں کی روشنی میں احتیاط سے آگے بڑھے۔ آگے بھی یہ خون آلو
موجود تھا' لگتا تھا کہ آرزو کا ایک پاؤں بری طرح خون میں لتھڑا گیا ہے۔ یا یہ بھی
ہے کہ یہ خون اس کے اپنے پاؤں سے ہی نکل رہا ہو۔ آگے جا کر پاؤں کا نشان ق
مدہم ہو گیا لیکن صاف پہچانا جاتا رہا۔ ہم کھوہ سے نکل کر قریباً تیس چالیس میٹر ا
طرف آ گئے۔ ہم ڈھلوان پر چڑھتے تھے ایک دم ہمیں یہ احساس ہوا کہ آگے زمی
ہو گئی ہے۔ ہم سینکڑوں فٹ گہری ایک خوفناک کھائی کے کنارے کھڑے تھے۔ دل
میرے سینے میں برف کا گولا بن کر رہ گیا اور اس گولے سے ابھرنے والی یخ بستہ
پورے بدن میں پھیل گئیں۔ خوفناک کھائی کے عین کنارے تک خون آلود پاؤں کا
موجود تھا۔

ہماری ٹارچوں کے روشن دائرے ایک ساتھ کھائی کی گہرائی میں چکرائے۔
کہیں نیچے پانی کے آثار تھے اور پانی کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ "کیا آرزو مر
کاشی؟" میرے ہونٹوں سے درد و کرب میں ڈوبی آواز نکلی۔

کاشف نے میرے کندھے تھام لئے۔ "پاگل مت بنو۔ یہ کوئی فلم نہیں ہے۔
زندگی ہے اور آرزو بھی ایسی بے وقوف نہیں ہے کہ یوں حرام موت کو گلے
لے۔ مجھے یقین ہے وہ یہیں کہیں ہو گی۔"

"اگر ہے تو پھر ملی کیوں نہیں۔" میں بالکل بے دم سا ہو کر وہیں پتھر پر بیٹھ گیا۔
"ملے گی' ضرور ملے گی۔ یہاں اس کے پاؤں کے نشان ملنے کا مطلب یہ نہیں
اس نے کود کر جان دے دی ہے۔" وہ بول رہا تھا مگر اپنی آواز کا کھوکھلا پن یقیناً خود
بھی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ کھڑا ہو گیا اور بے قراری کے عالم میں اپنی ٹارچ کے دائرے کو ادھر ادھر گ
دینے لگا میں جانتا تھا کہ وہ میری ڈھارس بندھانے کے لئے پاؤں کے کچھ اور
ڈھونڈنا چاہ رہا ہے۔

زمین آسمان میری نگاہوں کے روبرو گھوم رہے تھے۔ آرزو کے وہ الفاظ میرے
کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے پولیس چوکی کے اسٹور روم میں مجھ سے کہے تھے۔
"جلال' اگر آپ نے میری نہ مانی......... تو میں قسم کھاتی ہوں' میں اپنی جان لے
لوں گی......... میں قسم کھاتی ہوں۔" کیا اس نے بڑے ہیجانی لہجے میں جو بات کہی تھی وہ سچ
کر دکھائی تھی؟ میرے دل سے آواز آئی' اگر وہ مر گئی ہے تو پھر تمہارے زندہ رہنے کا بھی
کوئی فائدہ نہیں۔ ایک روتی سسکتی بے کار زندگی جینے سے بہتر ہے کہ تم بھی خود کو ابھی
ختم کر ڈالو۔ اسی کھائی میں کود کر 'اپنے ہونے' کے دردناک احساس سے چھٹکارہ پالو۔

کاشف کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں جیسے چونک کر رہ گیا۔ "چلو آؤ نیچے
گہرائی میں چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

ہم تاریکی میں گرتے پڑتے نیچے کھائی میں پہنچے۔ قریباً دو گھنٹے میں دیوانوں کی طرح
اس گرد و پیش میں گھومتا رہا۔ یہ ایک آبی گزرگاہ تھی۔ پانی اچھلتا کودتا شور مچاتا گزرتا تھا۔
گہرائی کہیں کم تھی کہیں تین چار فٹ تک تھی......... دو گھنٹے بعد کاشف مجھے واپس
بلندی پر لے آیا۔ اب رات دس گیارہ بجے عمل تھا۔ بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ سخت
سردی میں ہم مسلسل اس تاریک جنگل میں چکراتے رہے۔ میرے پاؤں زمین کی بجائے
جیسے کسی خلا میں پڑ رہے تھے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا جیسے میں رو رہا ہوں۔ دل کے
اندر ایک آری سی مسلسل چل رہی تھی۔ گاہے بگاہے ہم آرزو کو آوازیں بھی دیتے تھے'
لیکن وہ وہاں ہوتی تو ملتی۔ میرے دل کے اندر سے یہ آواز آنا شروع ہو گئی تھی کہ اس
خوفناک کھائی کے کنارے پر پہنچ کر آرزو کی زندگی کا سفر ختم ہو چکا ہے۔

اب رات کی تاریکی دن کے اجالے میں بدلنے والی تھی۔ میری حالت غیر ہو رہی
تھی۔ صرف دو دن پہلے جو ایک عجیب جوش و خروش سا دل و دماغ میں بھر گیا تھا اب اس
کا کہیں نشان تک باقی نہیں تھا۔ ایک ناقابل بیان غم کا دھواں تھا جو بتدریج میرے سینے
میں بھرتا اور پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ کاشف کا خیال تھا کہ اب اس مقام پر ہمارا زیادہ دیر رکنا
مناسب نہیں۔ اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے واپس چلنے پر مجبور کر دیا۔ کھوہ پر ایک آخری
نظر ڈالنے کے بعد ہم نے آگے نکلنے کی تیاری کر لی۔ بارش میں بھیگ کر وصی جان اور اس
کے ساتھی کی لاشیں اور بھی بدبودار ہو گئی تھیں۔ میں نے موقعہ واردات سے آرزو کی

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں' اور لباس کی دھجیاں اٹھائیں۔ مجھے لگا کہ اس موقع پر کاشف نے کوئی شے اٹھائی ہے اور اپنے لباس میں رکھی ہے لیکن اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔ شاید بتانا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا میں نے بھی پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔

ہم وہاں سے نکل آئے اور انتہائی دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے اس دوپہر کے وقت ایک دور افتادہ پہاڑی بستی میں جانکلے۔ پورے راستے میں ایک عجیب احساس میرے ذہن سے چپکا رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا رہا تھا کہ کوئی ذی نفس ہمارے ساتھ رہا ہے۔ کوئی انسان......... یا جانور......... یا شاید ایک بلیک ڈاگ......... ظاہر ہے راستے میں آرزو کی تلاش بھی ہم نے جاری رکھی تھی۔ پولیس کی مار سے اور مسلسل سے ہم دونوں کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ لباس بھی خستہ حال ہوگئے تھے۔ کاشف پولیس کی رائفل راستے ہی میں پھینک دی تھی' اب ہمارے پاس صرف ڈی ایس ریاض ساہی کا پستول تھا۔

اس دور افتادہ پہاڑی بستی میں ہم نے اپنا تعارف بھٹکے ہوئے ہائیکرز کے طور پر کرایا۔ اس بستی میں اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد ہم ایک قصبے تک کیسے پہنچے اور وہاں سے کاشف نے اپنے صحافی دوست یوسف راجا سے رابطہ کرکے اسے کیسے قصبے میں بلایا' یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بہرحال اس لمبی کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ راجا نے واپس ایبٹ آباد جاکر (جو وہاں سے قریباً تیس میل دور تھا) لاہور میں کاشف کے والد کو فون کیا اور انہیں تمام صورت حال بتائی۔ کاشف کے والد کے برادر نسبتی عبداللہ صاحب محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تعلق وفاقی پولیس سے تھا۔ کاشف کو پختہ یقین تھا کہ اگر مقامی پولیس کا سر پھرا ڈی ایس پی ریاض ساہی انہیں اس منحوس پولیس چوکی میں صرف ایک فون کرنے کی اجازت دے دیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو اب ہوا تھا۔ بہرحال اب بھی کاشف کے والد صاحب کچھ نہ کچھ کرسکتے تھے۔ کم از کم آرزو کے اہل خانہ اور اس کی سہیلی انیلا وغیرہ کی جان تو ریاض ساہی سے چھڑا ہی سکتے تھے۔ راجا نے ایک کال کے ذریعے مقامی پولیس کو یہ "خوشگوار" اطلاع بھی دے دی کہ ان کا ڈی ایس پی اندازاً فلاں مقام پر جیپ سے بندھا ہوا تھا' اور فلاں مقام پر سب انسپکٹر وصی جان اور ا کا ساتھی حوالدار کٹی پھٹی حالت میں پائے جاتے ہیں۔

راجا نے ان حالات میں ہماری توقع اور اپنی ہمت سے بڑھ کر ہماری مدد کی۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس پاگلوں کی طرح ہمیں اس علاقے میں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ اپنے ایک آڑھتی دوست کے ٹرک میں چھپا کر ہمیں قریبی قصبے حویلیاں میں لے آیا۔ عمارتی لکڑی کے اس آڑھتی نے ہمیں اپنے محفوظ ڈیرے پر پناہ دے دی۔ اکبر نامی شخص نے میزبانی اور حفاظت کا حق ادا کردیا۔ اس کے ڈیرے پر دو تین رائفل بردار وقت موجود رہتے تھے۔ اکبر نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔ "کسی پولیس والے کی اتنی اوقات نہیں کہ میرے ڈیرے کے پاس سے بھی گزرے۔"

ہمیں اکبر کے سپرد کرکے راجا نے ہم سے قطع تعلق کرلیا تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا۔ ہم اپنی پناہ گاہ میں زیادہ محفوظ ہوگئے تھے۔ راجا رات دن آرزو کی تلاش میں ہوا تھا۔ اس کا وعدہ تھا کہ جونہی اسے کوئی کھوج یا اشارہ ملا وہ ہمیں فوراً اطلاع پہنچائے ۔ ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی' اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی چھوٹی سے چھوٹی کرن بھی نہیں چمک سکی۔

اکبر بھائی کے ڈیرے پر رہتے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہفتہ میں نے جس طرح گزارا تھا یہ مجھے ہی معلوم تھا۔ غم کا ایک کوہ گراں تھا جو رات دن میرے جسم و جان کو کچل رہا تھا۔ کئی بار جی میں آئی کہ اپنی جان لے لوں۔ یہ ایک ہفتہ سالوں پر بھاری تھا اور اگر سال گزارنا پڑتے تو خبر نہیں کیسے گزرتے۔ میری شیو بڑھ چکی تھی' نہ ہوش تھا نہ کھانے پینے کا۔ میرا دل ہر وقت اندر سے روتا رہتا تھا اور پکارتا رہتا تھا آئندہ میں آرزو کی صورت نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ خود یہاں سے نکلنا چاہتا تھا اور اس روئے زمین کے چپے چپے پر اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر کاشف' اکبر اور راجا میرے راستے کی دیوار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس چار دیواری سے باہر قدم رکھتے ہی میں ریاض ساہی اور انسپکٹر بابر کے عقوبت خانے میں نظر آؤں گا۔ راجا کی وساطت سے ہمیں باہر کے حالات کی تھوڑی بہت خبر ہوتی رہتی تھی۔ کاشف کے والد نے بھاگ دوڑ کرکے آرزو کی دوست انیلا کو ریاض ساہی کے چنگل سے نکال لیا تھا' اب وہ لاہور کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھی۔ آرزو کے خلاف اپنے شوہر ڈاکٹر رفیق کے قتل کا کیس درج ہو چکا تھا اور ہم بھی اعانت جرم کے ملزم ٹھہرے تھے۔ ایک

اخبار میں کچھ اس سے ملتی جلتی خبر بھی شائع ہوئی تھی "آرزو نے اپنے آشنا جلال کے پر شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔" ایک اخبار نے لکھا کے ملزمہ نے بڑی ہوشیاری اس سارے معاملے کو پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کی ہے.......... اب دو پولیس اہلکاروں کے قتل اور آرزو کے روپوش ہوجانے کے بعد یہ معاملہ اور بھی سنگین ہوگیا دوسری طرف مجھے اور کاشف کو پولیس نے بدترین قاتلوں اور ڈاکوؤں کی فہرست لاکھڑا کیا تھا۔ پولیس چوکی سے ہمارے فرار کا واقعہ خوب مرچ مسالہ لگا کر بیان کیا گیا اخبار میں اس واقعے کی رپورٹنگ پڑھ کر ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید ہم جگا پھولن دیوی اور چارلس سوبھراج کے پائے کے مجرم ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے اہل خانہ ہمارے حالات سے انتہائی پریشان تھے۔ بھابی اس صدمے سے بیمار ہوگئی تھیں۔ والد صاحب بھی کاروبار چھوڑ کر قانونی چکروں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بڑے بھائی کو بھی ایک دو دن حوالات میں رہنا پڑا تھا..... آرزو کی والدہ آنٹی تابندہ کے متعلق معلوم ہوا کہ انہیں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ دو بھگتنے کے بعد اب جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھیں۔

ایک دن میں نے کاشف سے کہا۔ "یار! پتہ نہیں کیوں دل کرتا ہے کہ ایک بار جی صاحب سے ملا جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ پیر صاحب جن کے ڈیرے پر آنٹی کو تم نے گھنگرو باندھ دھمال ڈالتے دیکھا تھا؟"

"ہاں.......... پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمیں آرزو کے بارے میں کچھ کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، مل لیں گے، مگر اس معاملے کو ذرا ٹھنڈا ہولینے دو۔ یہ نہ ہو باہر نکلتے ہی دھر لئے جائیں۔"

"مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا کاشی! میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی میں نے روہانسی آرزو میں کہا۔

کاشف نے اثبات میں سرہلادیا۔

اگلے روز ہم اکبر بھائی کے ٹرک میں چھپ کر ایبٹ آباد گئے، اور اسی طرح

چھپاتے پیر شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہ جان کر ہمیں سخت مایوسی ہوئی کہ شاہ جی ہم سے ملنا نہیں چاہتے۔ ہم نے منت سماجت کی مگران کے مریدوں نے ہماری کوئی بھی بات سننے سے صاف انکار کردیا۔ کچھ دیر بعد شاہ جی کی طرف سے فرمان آگیا کہ ہم فوراً یہاں سے چلے جائیں ورنہ اپنے نقصان کے ہم خود ذمے دار ہوں گے۔ بڑی مایوسی کے عالم میں ہم اپنی پناہ گاہ پر واپس پہنچ گئے۔

اس سے دو روز بعد کاشف اکیلا شاہ جی کی طرف گیا، مگر ایک بار پھر ناکامی ہوئی، شاہ جی نے کاشف کو صورت تک نہیں دکھائی اور کاشف جس طرح منہ سر لپیٹ کر گیا تھا اسی طرح واپس آگیا۔ جو خبریں ہمارے اردگرد سے موصول ہورہی تھیں، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے اور اگر ہم یہیں مقیم رہے تو نہ صرف خود پکڑے جائیں گے بلکہ ہماری وجہ سے اکبر بھائی بھی زبردست رگڑے میں آجائے گا۔

ایک روز آدھی رات کو جب زبردست بارش ہورہی تھی ہمارے کمرے کا دروازہ دھڑدھڑ بجا۔ دوسری طرف اکبر بھائی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ منظر چونکا دینے والا تھا۔ اکبر بھائی کے ساتھ یوسف راجا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ لہولہان تھی اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اکبر بھائی نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اکبر بھائی کے ہاتھ میں مجھے کھلا ہوا چاقو نظر آیا اور میری تشویش کئی گنا بڑھ گئی۔ اکبر بھائی اپنے مخصوص پٹھانی انداز میں بولا۔ "بڑا گڑبڑ ہوگیا ہے ہو سکتا ہے کہ ام کو یہاں سے جانا پڑے۔ تم دونوں اس کو سنبھالو میں ابھی آتا ہوں۔"

راجا کو ہماری طرف دھکیل کر اکبر باہر بھاگ گیا۔ "یہ ہوا کیا ہے؟" کاشف نے راجا کو جھنجوڑ کر پوچھا۔

وہ بولا۔ "گولی لگی ہے۔ بہتر ہے کاشی تم دونوں یہاں سے بھاگ جاؤ.......... پولیس تمہیں چھوڑے گی نہیں۔"

"لیکن ہوا کیا ہے یار؟"

"تمہارا یہ ٹھکانہ پولیس کی نظر میں آچکا ہے۔ میں یہاں پہنچا تو دو سادہ پوش پولیس والے ڈیرے سے باہر فقیروں کے بھیس میں موجود تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور پکڑنے کی کوشش کی۔ میں بھاگنے لگا تو انہوں نے

گولی چلا کر مجھے گرالیا' اس دوران میں اکبر بھائی بھی پہنچ گیا۔ اس نے ایک پولیس وال
کے پیٹ میں خنجر مار کر اسے زخمی کردیا اور اس کا پستول چھین لیا' دوسرا بھاگنے
کامیاب ہوگیا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" کاشف نے سر پکڑ لیا۔

"اب کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ کراہتا ہوا راجا کوئی جواب دیتا' دروازہ دھماکے سے کھلا اور اک
خان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ ریوالور تھا اور ایک چھوٹا سا سفری تھیلا تھا۔

"چلو آؤ امارے ساتھ۔" اس نے ہم تینوں سے مخاطب ہوکر تیزی سے کہا۔

"مگر کہاں؟"

"یہ سوالوں کا وقت نہیں ہے بھئی۔ بس نکلو یہاں سے۔"

ہمارا سامان ہی کیا تھا۔ روز مرہ استعمال کی چند چیزیں تھیں وہ ہم نے جیبوں
ٹھونسیں اور ڈیرے کے عقبی دروازے سے اکبر بھائی کے ساتھ باہر آگئے۔ زخمی راجا
ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے اکبر بھائی نے سہارا دے رکھا تھا۔ مو
دھار بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ گلی میں پہنچتے ہی ہمارے لباس بھی راجا اور اکبر بھائی
طرح شرابور ہوگئے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہاں عمارتی لکڑی سے بھرا ہوا ا
ٹرک کھڑا ہے۔ دو مزدور قسم کے صحت مند پٹھان بھی یہاں موجود تھے۔ اکبر نے میر
اور کاشف کے ساتھ مل کر پہلے زخمی راجا کو ٹرک پر چڑھایا پھر ہمیں بھی چڑھنے کی ہدا
کی۔ ٹرک کے اندر لکڑیوں کے بیچوں بیچ ایک کشادہ خلا موجود تھا۔ ہم باری باری اس
میں اتر گئے۔ اکبر بھائی بھی ہمارے درمیان آگیا۔ ٹرک پر موجود صحت مند مزدوروں
جلدی جلدی لکڑی کے سلیپر خلا کے اوپر برابر کردیئے۔ اب ہم ایک ایسے تہہ خانے
تھے جو چاروں طرف سے بند تھا۔

دیار کی عمارتی لکڑی سے بھرا ہوا یہ ٹرک "حویلیاں قصبے" کی اس سڑک سے چ
پھر چلتا ہی چلا گیا۔ خدشوں اور اندیشوں کی دھول سے اٹا ہوا وہ ایک طویل.........
طویل سفر تھا۔ رات کا بقیہ حصہ اور اگلا دن بھی ہم نے چلتے ہوئے گزارا۔ اس دوران
صرف ایک دو جگہ ٹرک تھوڑی دیر کے لئے رکا تھا۔ ہم دوپہر کے وقت لاہور

گزرے جانا پہچانا شور ہمارے کانوں میں پڑ رہا تھا لیکن جانی پہچانی سڑکوں اور صورتوں کو ہم
دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہم ایک تاریک خلا میں بند تھے اور ہمارے درمیان ایک زخمی تھا جو
مسلسل کراہ رہا تھا۔ رات کو ہم نے ملتان کے کسی ڈرائیور ہوٹل میں دو گھنٹے قیام کیا۔ ہمارا
قیام اسی تاریک خلا میں رہا۔ ٹرک کا ڈرائیور اور اس کا ہیلپر موقع محل دیکھ کر ہمیں کھانا
پانی اسی خلا میں پہنچا رہے تھے۔ اس سفر کی مکمل روئیداد بیان کی تو یہ خاصی طویل ہو جائے
گی۔ مختصر یہ کہ ہم حویلیاں کی اس سڑک سے روانہ ہونے کے تقریباً اڑتالیس گھنٹے بعد
کراچی پہنچ گئے۔ اس دوران میں فقط دو بار ہی ڈرائیور نے ہمیں باہر نکالا تھا اور دونوں
مرتبہ یہ آزادی ہمیں رات کے وقت کسی ویرانے میں ملی تھی۔

بعد کے دو چار دنوں میں جو واقعات پیش آئے وہ بھی میں مختصراً ہی بیان کرنا چاہتا
ہوں۔ کراچی میں ہمارا قیام پٹھان بھائیوں کے ایک چھوٹے سے ڈیرے پر ہی رہا.........
یہاں اکبر بھائی نے ایک ڈاکٹر کا انتظام کرکے ڈیرے پر ہی راجا کی پنڈلی سے گولی نکلوائی۔
ضرورت کی کچھ چھوٹی موٹی اشیاء بھی ہم نے یہیں سے خریدیں۔ اخبار کے ذریعے ہمیں
حالات کا علم ہو رہا تھا۔ اکبر بھائی نے پٹھانی روایت پر عمل کرتے ہوئے "پناہ دینے" اور ہر
قیمت پر یہ ذمے داری نبھانے کی عمدہ مثال قائم کی تھی۔ بہرطور پولیس کا جو ہیڈ کانسٹیبل
اکبر بھائی کے وار سے زخمی ہوا تھا وہ اسپتال جاکر جانبر نہیں ہوسکا تھا۔ کیس نے اب ایک
نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ پولیس ہمارے ساتھ ساتھ اب راجا اور اکبر بھائی کو بھی ڈھونڈتی پھر
رہی تھی۔ تھانوں اور چوکیوں میں دور دور تک ہماری تصویریں لگ چکی تھیں۔ اکبر بھائی
کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا' یکسر اکیلا آدمی تھا وہ......... ایک ٹرک ایک مکان اور آٹھ دس
لاکھ کا سرمایہ جو لکڑی کے کام میں لگا ہوا تھا' یہی اس کی کل دنیا تھی۔

ایک روز ہم چاروں پلاننگ کے مطابق صبح منہ اندھیرے اٹھ گئے۔ اکبر خان کے
ایک جاننے والے کی "مزدا لوڈر" ڈیرے پر پہنچی۔ ہم لوڈر میں بیٹھے اور ڈیڑھ گھنٹے کے سفر
کے بعد سمندر کے کنارے ایک ویران مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک بڑی لانچ موجود تھی۔
لانچ میں چار مسافر اور بھی موجود تھے۔

لانچ والوں کے ساتھ لین دین کے معاملات اکبر خان نے پہلے ہی طے کرلئے تھے۔
پرمٹ وغیرہ بھی ہوچکی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے لانچ ہمیں

لے کر اپنے طویل سفر پر روانہ ہوگئی۔ ہمارا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا اور ہم
ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمیں کاٹھیا واڑ کے قریب سے گزرتے ہوئے
طرف جانا تھا۔ ہمارے قدموں کے نیچے لانچ کا چوبی فرش تھا اور اس فرش کے
عرب کی لہریں تھیں جو ہم راہ گم کردہ مسافروں کو نامعلوم منزل کی طرف لے
تھیں۔

☆==========☆==========☆

سمندر کا سفر بھی عجیب ہوتا ہے۔ انسان اپنے اردگرد سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ کوئی منظر نہیں کوئی راستہ نہیں' نہ سنگ میل کا نشان نہ کوئی کارواں سرائے۔ بس سفر ہی سفر اوپر آسمان اور نیچے پانی.......... کہیں جب کسی ساحل کی جھلک یا بستی کی روشنیاں نظر آتی ہیں تو بڑی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے قریباً چار دن تک اسی طرح بغیر رکے سفر کیا۔ لانچ والے اپنے کام کے بڑے ماہر اور ہوشیار لوگ تھے۔ وہ خطرے کی بو میلوں دور سے سونگھ لیتے تھے۔ جونہی انہیں کوسٹ گارڈز وغیرہ سے خطرہ محسوس ہوتا تھا ہمیں فوراً لانچ کے تہہ خانے میں لے جا کر ایک سلائیڈنگ تختہ ہمارے اوپر برابر کر دیتے تھے' اس تختے کے اوپر بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ میں جالے لگے ہوئے تھے اور ان جالوں میں مردہ مکھیاں جھولتی تھیں۔ اس کاٹھ کباڑ کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے نیچے ایک راستہ موجود ہے۔ جس تہہ خانے میں ہمیں اتارا جاتا تھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اس تہہ خانے کی چھت کی اونچائی فرش سے فقط دو فٹ تھی۔ اس دو فٹ کے خلا میں ہم پشت کے بل یا پیٹ کے بل رینگ کر داخل ہوتے تھے اور پھر دم سادھ کر پڑے رہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم قبر میں ہیں اور ہمارے اوپر تختے رکھ کر مٹی ڈال دی گئی ہے۔

ایسے میں اکبر خان لانچ والوں کو پشتو میں خوب گالیاں سناتا تھا۔ بہرحال ان
گالیوں میں غصہ کم اور تفریح زیادہ ہوتی تھی۔ اکبر خان ہر حال میں خوش رہنے والا
تھا۔ کراچی میں شروع کے دو تین دن اس نے پریشانی میں گزارے تھے لیکن پھر سار
مندیاں پرانی نسوار کی طرح تھوک دی تھیں۔ سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ بھی کہ ہمار
کرتے کرتے اس کے ہاتھوں ایک پولیس والا قتل ہو چکا ہے اور اب وہ ہماری ہی
ایک مفرور قاتل کی حیثیت رکھتا ہے......... راجا ذرا اندروں بین شخص تھا۔ وہ اکثر
بیٹھے اردگرد موجود لوگوں سے کٹ جاتا تھا اور گہری سوچ میں گم نظر آنے لگتا تھا۔ ا
میں اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھولتے تھے اور آنکھیں مظاہر قدرت میں کھو
جاتی تھیں۔ وہ گاہے گاہے ایک نوٹ بک کے اندر اس سفر کے بارے میں نوٹس وغیرہ
لیتا رہتا تھا۔

ہماری پہلی منزل انڈیا کا ساحلی شہر کالی کٹ تھا۔ لانچ نے ہمیں ایک ویران ساحل
نصف شب کے وقت اتارا۔ لانچ کو کنارے پر لگانے کی بجائے انہوں نے سمندر میں
روک دیا اور ہمیں اترنے کا حکم جاری کیا۔ یہاں پانی گہرا تھا اور مسافروں میں سے دو
ایسے تھے جنہیں تیرنا بالکل نہیں آتا تھا۔ ان میں سے ایک راجا تھا۔ اسے تیرنا آتا ہو
بھی زخمی پنڈلی کی وجہ سے اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ ڈیڑھ دو سو میٹر تیر کر ساحل
میں پہنچتا۔ اکبر خان نے لانچ والوں سے کہا کہ وہ ہمیں کچھ اور آگے لے جائیں تاکہ
چل کر کنارے تک پہنچ سکیں۔ لانچ والوں نے یہ بات ماننے سے انکار کیا اور بتایا کہ
آگے لے جانے میں سخت خطرہ ہے۔ ہم نے اصرار کیا تو لانچ والوں کا رویہ سخت ہو گیا
ہر صورت ہمیں اتارنا چاہتے تھے اور فوراً اتارنا چاہتے تھے۔ ہمیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ
کہیں اسلحہ وغیرہ نکال کر ہمیں زبردستی سمندر میں نہ دھکیل دیں۔ اس موقع پر اکبر
نے ذرا تحمل مزاجی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ اس نے کہہ سن کر لانچ والوں سے دو
بھری ٹیوبیں حاصل کر لیں۔ ان ٹیوبوں کی مدد سے ہم راجا اور ایک ساتھی مسافر کو سا
پر لے آئے۔

کہا جاتا ہے کہ سردار حضرات دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ کالی کٹ
بھی سردار حضرات موجود تھے۔ ایسے ہی ایک سردار صاحب جن کا نام راجے سنگھ تھا

جو چند سال پہلے ڈلہوزی میں لکڑی کا کاروبار کرتے تھے' اکبر خان کے دوست تھے' کالی
کٹ میں ہماری پناہ گاہ راجے سنگھ کا ڈیرہ ہی تھا۔ راجے سنگھ لکڑی کا کام چھوڑ چکا تھا۔
اب وہ مسالہ جات کا کام کرتا تھا۔ وہ سری لنکا سے تھوک کے حساب سے مسالہ جات لاتا
تھا اور جنوبی انڈیا کے کئی شہروں میں سپلائی کرتا تھا۔ یہاں اس کا کاروبار ٹھیک ٹھاک جما ہوا
تھا اور خاصا اثر و رسوخ بھی تھا۔ راجے سنگھ کا ٹھکانا ہمارے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔
یہاں ہمیں نہ صرف مکمل آرام ملا بلکہ تحفظ اور سلامتی کا احساس بھی ہوا۔ راجے سنگھ
نے اپنے تعلقات استعمال کئے اور چند دن کے اندر ہمارے لئے سفر کے کاغذات تیار کرا
دیئے اس کام کو راجے سنگھ کا کارنامہ ہی کہنا چاہئے۔ یہ کاغذات فرضی ناموں سے تھے۔
دوسرے لفظوں میں یہ جعلی کاغذات تھے مگر تیار کرنے والوں نے ان میں کوئی کسر نہیں
چھوڑی تھی۔ راجے سنگھ کو سو فیصد یقین تھا کہ ہم ان کاغذات کے ذریعے بہ آسانی تھائی
لینڈ پہنچ سکتے ہیں۔ تھائی لینڈ میں راجے سنگھ کے کئی ہم مزاج دوست موجود تھے۔ ہم وہاں
انڈیا کی نسبت کہیں زیادہ محفوظ رہ سکتے تھے۔ ہم کالی کٹ سے بنکاک روانگی کے لئے بالکل
تیار تھے۔ جب اتفاقاً کاشف اور اکبر خان کے پاسپورٹ بمعہ ٹکٹ وغیرہ گم ہو گئے۔ راجے
سنگھ نے بتایا کہ اب ہمیں دس پندرہ دن مزید رکنا پڑے گا۔

میرے لئے کالی کٹ میں رکنا بڑا دشوار ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ہم جلد سے جلد
یہاں سے نکل جائیں۔ انسان کو جانے کی جلدی تب ہوتی ہے جب اسے کہیں پہنچنا ہو۔
مجھے کہیں جانا نہیں تھا۔ پھر بھی جانے کی جلدی تھی۔ بس عجیب سی بے کلی تھی جسے میں
کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بنکاک پہنچ کر بھی میں شاید دو چار دن ہی
سکون سے رہ سکوں گا' پھر دل چاہے گا کہ کہیں اور نکل جاؤں......... کسی اور جانب چل
پڑوں۔ انگارے سے تھے جو میرے سارے بدن میں دہکتے رہتے تھے اور مجھے کسی پل کسی
جگہ قرار نصیب نہیں تھا......... میرا کچھ کھو گیا تھا اس کھونے سے میرے اندر ایک ایسا خلا
پیدا ہوا تھا جس کی کوئی انتہا نہیں تھی......... میری آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر ایک خون
آلود پاؤں کا نقش آتا تھا۔ وہی نقش جو میں نے ایبٹ آباد کی نواحی پہاڑیوں میں دیکھا تھا۔
وہ نقش کھوہ کے اندر سے نکلا تھا اور پھر ایک گہری جان لیوا کھائی کے عین کنارے پر پہنچ
کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ نقش خاموشی کی زبان میں چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا کہ آرزو کی زندگی

کا سفر اس کھائی کے کنارے تک پہنچ کر ختم ہو چکا ہے۔ اب میں اسے کبھی نہ دیکھ
گا۔ میرے سارے آنسو' سارا انتظار' ہجر کی ساری سسکیاں اور جان لیوا راتوں کی
کروٹیں اب بیکار ہیں۔ ان آنسوؤں کروٹوں اور جاں گسل انتظار کا صلہ دینے کے
کوئی میرے پاس نہیں آئے گا' کوئی اپنی مہربان نگاہوں سے میرے رستے ہوئے زخم
مرہم نہیں رکھے گا۔ وہ مجھے ہجر دوام دے کر لامتناہی فاصلوں پر جاچکی ہے۔ جب میں
سوچتا تھا تو فوراً ذہن میں خیال آتا تھا کہ میں زندہ کیوں ہوں۔ ایک پُرعذاب ز
گزارنے سے پہلے ہی مر کیوں نہیں جاتا......... جب خودکشی کا خیال ذہن میں آتا
عین اس وقت دل کے اندر کہیں بہت گہرائی سے اس کی ایک کرن پھوٹتی تھی
سارے الفاظ میرے ذہن میں آتے تھے جو کاشف نے اکبر خان نے اور راجا نے اب
میری تسلی تشفی کے لئے کہتے تھے' وہ ہزاروں لاکھوں الفاظ گہری تاریکی میں امید
چھوٹے چھوٹے چراغوں کی طرح روشن ہوجاتے تھے۔ پھر ان چراغوں کے درمیان
اور بڑا چراغ جل اٹھتا تھا۔ اس چراغ کے گرد ایک پُراسرار سیاہ ہالہ سا نظر آتا تھا.........
یہ اس اسرار کا چراغ تھا جو ان تمام واقعات میں موجود تھا' اور ان واقعات کو ناقابل
بناتا تھا۔ میں اس انداز سے سوچتا تھا تو خیال آتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ جس طرح پہلے
واقعات ہماری سمجھ سے بالاتر رہے ہیں' اس طرح آرزو کی موت کا واقعہ بھی ہماری
سے بالاتر ہو۔ کوئی ایسی انہونی ہوگئی ہو جس نے آرزو کو مجھ سے چھین کر بھی نہ چھ
آخر اس سے پہلے بھی تو دو ایسی ہی انہونیاں ہو چکی تھیں۔ لاہور میں نجیب کے
آرزو کی شادی اور اس کے بعد ایبٹ آباد میں ڈاکٹر رفیق کے ساتھ شادی۔ دونوں
میں نے سمجھا تھا کہ اب میرے اور آرزو کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ حائل ہوگیا
مگر دونوں مرتبہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ سب کچھ اتھل پتھل ہوگیا تھا.........
وقت سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر میں دور شمال مغرب کی
دیکھتا۔ لاہور اور ایبٹ آباد کی گلیوں میں گھومنے والا ایک پُراسرار کالا کتا میری نگاہوں
سامنے آجاتا۔ نہ جانے وہ کتا اب کہاں تھا مگر اس کا خیال ہر جگہ میرے ذہن سے چمٹا
تھا......... جب لاہور کے گلی کوچے یاد آتے تو پھر اپنے پیاروں کے چہرے بھی نگاہوں
سامنے گھومنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ بھابی سمن مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ ابھی میں

میں ہی تھا جب میرے "حالات" نے انہیں بیمار کر دیا تھا۔ اب کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کا
کیا حال ہے۔ امی ابو اور نٹ کھٹ رومی کے چہرے بھی میرے تصور کو زخمی کرتے رہتے
تھے۔ میں نے چاہا تھا کہ خط یا ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے ان سے رابطہ کیا جائے مگر کاشف
اور اکبر خان کے خیال میں یہ ٹھیک نہیں تھا۔ کاشف کا خیال تھا کہ جب تک ہم تھائی لینڈ
نہیں پہنچ جاتے ہمیں اس طرح کا کوئی رابطہ قائم نہیں کرنا چاہئے۔ وہ سب میرے
لئے......... صرف میرے لئے مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ میں نے پلک جھپکتے میں ان کے
لئے خطرات کے پہاڑ کھڑے کردیئے تھے' ان کی زندگیوں کو درہم برہم کر ڈالا تھا' اب ان
کے لئے مزید کوئی خطرہ مول لینا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے پاکستان میں کسی
سے رابطہ کرنے کا خیال ذہن سے بالکل نکال دیا تھا۔

بالآخر پندرہ بیس دن کی تاخیر کے بعد اکبر خان اور کاشف کے کاغذات پھر تیار ہو
گئے ہم اپنے دل میں راجے سنگھ کی مہمان نوازی کی ناقابل فراموش یادیں لئے کالی کٹ
سے بنکاک پہنچ گئے۔ بنکاک ایک شہر ہزار داستان ہے۔ دنیا بھر سے سیاح یہاں کھچے چلے
آتے ہیں۔ ڈانس ہال' نائٹ کلب اور عشرت کدے اس شہر کی پہچان ہیں۔ انسان اس
ہنگامہ پرور شہر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی راجے سنگھ کے ایک گہرے دوست
سلطان تایا نے ہماری میزبانی کی۔ سلطان تایا یہاں ایک اشتہاری کمپنی چلا رہا تھا۔ اس کے
علاوہ ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ سے جو فلمی یونٹ شوٹنگ وغیرہ کے لئے یہاں
آتے تھے سلطان تایا ان کی رہنمائی بھی کرتا تھا۔ ان کو ایکسٹرا اداکار اور سازوسامان مہیا
کرکے وہ ہزاروں ڈالر کما لیتا تھا۔ اس نے بنکاک کے وسطی علاقے میں ہوٹل کا ایک
شاندار سوئٹ ہمارے لئے غیر معینہ مدت کے لئے بک کرا دیا تھا۔ ہم زیادہ تر وقت سوئٹ
کے اندر ہی گزارتے' ہاں کبھی کبھی میں کاشف اور اکبر خان سیر کرنے کے لئے نکل
جاتے۔ اکبر خان سرراہ نوجوان تھائی لڑکیوں کے بے ہودہ لباس دیکھتا تو ناک بھوں چڑھاتا۔

"یار! یہ کوئی عورتیں ہیں۔ امارے بس میں ہو تو ان سب کو ٹوپی والا سفید برقعہ
پہنائے اور جو شادی کے قابل ہیں ان کا شریف بندوں کے ساتھ دو دو بول پڑھوا دے۔"

کاشف کہتا۔ "یہ اس ٹائپ کی عورتیں نہیں ہیں اکبر بھائی۔ یہ تو آزاد تتلیاں
ہیں۔"

"کوئی تتلی شتلی نہیں۔ جب پیچھے تین چار بچوں کا لائن لگ جاتا ہے تو سب
کا پر کٹ جاتا ہے۔"

اکبر خان جتنی دیر ہمارے ساتھ رہتا ہمیں ناک کی سیدھ میں دیکھنے کی ہدایہ
کسی ناچ گھر یا کلب کے پاس سے گزرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ اکبر خان کی ان
پابندیوں کی وجہ سے کسی کسی وقت کاشف اسے ہوٹل میں راجا کے پاس ہی چھوڑ
اس تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھے کسی نائٹ کلب یا دوسری تفریح گاہ میں لے
ہم خوب سگریٹ پھونکتے سافٹ ڈرنکس پیتے اور اپنے اردگرد پھیلے دھوئیں میں
جوان جسموں کو دیکھتے۔ کاشف کی خواہش ہوتی کہ میں اس ماحول میں گم ہو جاؤں
شاید وہ اس طریقے سے اس بے پناہ غم کی طرف سے میرا دھیان بٹانا چاہتا تھا جو
اندر مجھے سوکھی لکڑی کی طرح جلا رہا تھا........ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک فضو
کار کوشش کر رہا ہے۔ وہ ساری دنیا کی رنگینیاں اور خوشیاں بھی میرے سامنے ڈھ
تو اس غم کی طرف سے میرا دھیان ہٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ غم تو میرے جسم کا حصہ
تھا۔ آرزو سے آخری ملاقات کا منظر ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔
چوکی کے ایک سال خوردہ اسٹور روم میں' میں نے آرزو سے جو گفتگو کی تھی اس
ایک لفظ میں اپنے ذہن میں سینکڑوں مرتبہ دہرا چکا تھا۔

میں نے واشگاف الفاظ میں آرزو سے اظہار محبت کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ
مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اپنے اس جذبے پر بے رخی اور لاتعلقی کے دبیز پرد
رہی ہے۔ وہ سسک کر بولی تھی۔ "میں آپ کو خود سے دور رکھنا چاہتی تھی اور اب
چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے جلال! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے
سائے سے دور چلے جائیں۔ میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں جلال۔ اگر آپ
بات نہ مانی تو میں قسم کھاتی ہوں۔ میں اپنی جان لے لوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں
میں نے اسے چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا اور وہ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی
پھر وہ پُراسرار واقعہ۔ ایک کالی سفید بلی کہیں سے نمودار ہوئی تھی اور نہایت
انداز میں غرانے لگی تھی........

اس واقعے نے بے شمار مرتبہ میرے تصور کے دروازے پر دستک دی

اس کے ساتھ ساتھ ان آخری الفاظ نے بھی جو میں نے ایک دو دن بعد آرزو کے ہونٹوں
سے سنے تھے۔ پولیس چوکی ہی کے کسی کمرے میں آرزو کسی پولیس اہلکار سے مخاطب
ہوئی تھی۔ "مجھے جانے دو' میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں یہاں نہیں رکوں گی۔ میں
نہیں رک سکتی۔" ان الفاظ سے بھی زیادہ عجیب اس کا لہجہ تھا۔ وہ جیسے گہری نیند میں بول
رہی تھی۔ ایک اضطراب اور ہیجان تھا اس کے لہجے میں۔

میں نے تنہائی میں کاشف سے کئی بار آرزو کے ان آخری الفاظ کا ذکر کیا تھا۔ میں
نے کاشف کو بتایا تھا کہ آرزو کا لب و لہجہ کسی صحیح الدماغ شخص کا نہیں تھا۔ وہ جیسے کسی
آسیب کی گرفت میں تھی........ کاشف نے حسب عادت میری بات کو زیادہ سنجیدگی سے
نہیں لیا تھا۔ اس نے ہر بار مجھے ایک طویل لیکچر پلایا تھا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں
اپنے ذہن کو اسرار اور واہموں کی دھند سے باہر نکالوں۔ بہت زیادہ سوچنا بند کردوں اور
خود کو حقیقت پسند بناؤں........

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ 14 اگست کی رات تھی جب ہم نے ایک "پی سی او"
سے دھڑکتے دل کے ساتھ پاکستان فون کیا۔ یہ فون میرے گھر کا تھا۔ فون اٹھانے والی میری
پیاری بھابی سمن تھیں۔ قریباً دو مہینے کے بعد یوں اچانک میری آواز سن کر وہ ششدر رہ
گئیں۔ کئی لمحے تک تو ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر گلوگیر آواز میں انہوں نے کہا۔
"تم نے ہم سب کو جیتے جی مار دیا ہے جلال۔ تم نے یہ کیا کیا ہے ہم سب کے ساتھ؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا بھابی۔ میری قسمت میں یہی تھا کہ میں آپ سب سے دور
ہو جاؤں۔ ہم بے گناہ پکڑے گئے تھے' ڈاکٹر رفیق کے قتل سے ہمارا دور کا تعلق بھی نہیں
تھا۔ آپ تو جانتی ہی ہیں' کیا آپ کا میاں مٹھو قاتل ہو سکتا ہے۔ کیا رومی کا چاچو کسی کی
جان لے سکتا ہے؟"

"لیکن تم تھانے سے کیوں بھاگے۔ کیوں پولیس مقابلے کا اتنا بڑا الزام اپنے سر لیا۔
اب تو تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر پولیس والے کے قتل کا الزام بھی لگ چکا ہے۔"

"تھانے میں ہم پر بہت زیادہ ظلم کیا گیا بھابی۔ جب سب کچھ برداشت سے باہر
ہو گیا تو ہم نے تھانے سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔"

"جو کچھ بھی ہوا لیکن ہو تو گیا۔ اب وہ لوگ تمہیں اور کاشف کو پھانسی پر چڑھائے

بغیر نہیں چھوڑیں گے.......... تت.......... تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"بہت دور سے بھابی۔"

بھابی نے سسک کر کہا۔ "تمہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ امی ر
رو رو کر اپنی نظر بند کر لی ہے۔ ابو برسوں کے بیمار لگ رہے ہیں لیکن ہم سب کی خوا
ہے کہ تم جہاں بھی ہو وہیں رہو۔ اسی میں تمہاری اور کاشف کی سلامتی ہے۔ ہم ر
اپنے دلوں پر پتھر رکھ لیں گے۔ اپنی ہر خواہش کو ماریں گے۔" بھابی ہچکیوں سے رو
لگیں۔

بھابی کے بعد امی نے تھوڑی سی بات کی۔ وہ مجھے گالیاں نکالتی رہیں اور اسی سا
میں دعائیں بھی دیتی رہیں۔ میرے صدمے نے انہیں نیم پاگل سا کر رکھا تھا۔ آخر فر
سے ان کی آواز بھرا گئی اور بولنا ان کے بس میں نہ رہا۔ ان سے فون پھر بھابی نے
لیا۔

میں نے دھڑکتے دل اور کانپتی آواز میں ان سے پوچھا۔ "بھابی۔ آرزو کا
چلا.........."

"مر کھپ گئی ہے وہ۔" بھابی نے بڑے کرب سے جواب دیا۔ "اور ساتھ میں
سب کو بھی مار ڈالا ہے اس نے۔ اخباروں کی خبروں میں یہی بتایا گیا تھا کہ اس نے پہا
نالے میں کود کر خودکشی کر لی ہے.......... مگر اس کی لاش نہیں ملی ہے، جس سے شک
ہوتا ہے کہ شاید وہ زندہ ہو.......... اخباروں نے اس واقعے کو خوب اچھالا ہے۔ پتہ
کیا کیا کہانیاں گھڑی ہیں۔ آنٹی تابندہ جیل میں ہیں، تمہاری بھابی کو بھی بار بار پولیس تھا
بلا لیتی ہے۔ بہرحال ہم یہ ساری مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور جھیلیں گے.......... لیکن
واپس نہ آنا اگر ہو سکے تو پاکستان سے کہیں باہر نکل جاؤ۔ یہ لوگ تمہیں زندہ
چھوڑیں گے۔"

بھابی نے روتے ہوئے کہا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں ہفتوں پہلے پاکستان
چکا ہوں۔ میں رومی سے بات کرنا چاہتا تھا اس کی چند توتلی باتیں سننا چاہتا تھا لیکن
دوران میں رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆==========☆==========☆

تھائی لینڈ میں سلطان تایا کے ہاں ایک ماہ گزارنے کے بعد ہم سنگاپور چلے گئے۔ سلطان تایا کا کاروبار سنگاپور میں بھی تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تھائی لینڈ سے سنگاپور پہنچا تھا۔ سنگاپور میں بھی ہمیں ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں۔ کاشف نے راجے سنگھ کے تعاون سے ایک موٹی رقم بھی منگوالی تھی۔ یہ رقم کاشف کے والدین نے بھجوائی تھی۔ اس کے علاوہ راجے سنگھ بھی یاروں کا یار تھا۔ وہ ہر گھڑی ہم سے ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار رہتا تھا اور اس میں مالی تعاون بھی شامل تھا۔ راجے سنگھ کو اس بات کا بے حد افسوس بھی تھا کہ ہم سب سنگین کیس میں پھنس کر یوں دربدر بھٹکنے پر مجبور ہیں۔ کاشف اور اکبر خان کے پاس اب اتنی رقم موجود تھی کہ ہم چاہتے تو بغیر کچھ کئے آٹھ دس ماہ سہولت اور آسائش سے گزار سکتے تھے۔ سنگاپور پہنچ کر میں نے تین چار مرتبہ گھر پر فون کیا۔ رومی اور والد صاحب سے بھی بات ہوئی۔ ہر دفعہ ایک ہی طرح کی باتیں ہوئیں۔ وہی سسکیاں وہی آہیں، وہی ناقابل عبور فاصلوں کے نوحے، میں نے محسوس کیا کہ اس قسم کی کالوں سے میں اپنے دکھی اہل خانہ کو مزید دکھی کر دیتا ہوں۔ ان کے زخم نئے سرے سے خون اگلنے لگتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب فون نہیں کروں گا۔ کم از کم تین چار ماہ تو اسی طرح گزار دوں گا۔ دوسری طرف کاشف بھی اسی قسم کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دراصل آہستہ آہستہ ہم نے ان ناقابل عبور فاصلوں کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

پاکستان سے نکلے ہوئے اب ہمیں تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ہم چاروں ایک دوسرے کی عادات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اکبر خان ایک آزاد اور من موجی آدمی تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے ہمہ وقت ایک مطمئن مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ بلا کا نشانے باز اور دلیر پٹھان تھا۔ گوشت خوری اس کی کمزوری تھی، وہ ہر قسم کا گوشت یعنی حلال گوشت کھا لیتا تھا اور اچھے گوشت اور اچھی نسوار کے لئے اسے دنیا کے آخری کنارے تک بھی جانا پڑتا تو فوراً تیار ہو جاتا تھا۔ راجا میوزک کا شوقین تھا۔ اس کے علاوہ آرٹ ٹائپ فلمیں بھی اسے پسند تھیں۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنا پسند کرتا تھا.......... اور کاشف کا تو مجھے پتہ ہی تھا، بلکہ شاید اسے خود اپنا بھی اتنا پتہ نہیں ہوگا جتنا مجھے تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جن دنوں ہم سنگاپور میں تھے ایک لڑکی سے ہماری ملاقات ہوئی اس سرخ و سپید نہایت خوبصورت امریکن لڑکی کا نام جولیا تھا۔ جولیا

تھوڑی بہت اردو اور ہندی بھی بول لیتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انڈیا میں تعینات
ایک امریکن سفارت کار کی بھانجی تھی اور کافی عرصہ انڈیا میں رہی تھی۔ اب کچھ عرصہ
سے وہ مادر پدر آزاد ہو چکی تھی۔ سیاحت کے شوق میں اس نے دنیا کا کونہ کونہ دیکھا
اور اب بھی دیکھ رہی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے یہ تمام سفر تن تنہا کئے تھے
ایسی آزاد خیال لڑکیوں کو بھلا خوف کس بات کا ہو سکتا ہے' وہ کھانے پینے اور سونے جاگنے
کی طرح مرد اور عورت کے تعلق کو بھی ایک معمول کا کام سمجھتی ہیں۔ پبلک لائبریری
میں رکھی ہوئی کتاب کی طرح ہر کوئی انہیں کھول سکتا ہے' پڑھ سکتا ہے اور پڑھنے کے بعد
اپنا راستہ لے سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ کتاب کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی
جبکہ اس قسم کی لڑکیاں اپنی مرضی سے یہ سب کچھ کرتی ہیں اور اگر ان کی اپنی مرضی نہ
ہو تو پھر انہیں پڑھنے والے کو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔

شوخ و چنچل جولیا اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھی جہاں ہم رہ رہے تھے۔ یہ فور
ہوٹل تھا اور یہاں ہمارے قیام کا سارا خرچا دریا دل راجہ سنگھ کے ذمے تھا۔ ج
ہمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی اور سیر سپاٹے میں بھی ہمارے ساتھ شریک ہونے لگی۔ خا
طور سے کاشف کے ساتھ وہ بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ کاشف کے لئے لڑکی
نئی چیز نہیں تھی' پاکستان اور پھر انگلینڈ میں وہ عشق محبت کی کئی گھاتیں پہلے بھی لگا چکا
مگر اس جولیا نامی لڑکی میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس کی طرف مائل ہوتا چلا جا
تھا...... اکبر خاں کو ان دونوں کی یہ بڑھتی ہوئی بے تکلفی ہرگز پسند نہیں تھی' ایک
جب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوٹل کی لابی میں نمودار ہوئے تو اکبر خاں غصے میں
بیٹھا تھا۔ وہ فوراً کاشف کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "برادر! ام تمہارے بڑے
بھائی کے مافق ہے۔ بولو ہے کہ نہیں ہے؟"

"بالکل ہے اکبر بھائی۔" کاشف نے سر ہلایا۔

"تو پھر تم سے امارا دست بستہ درخواست ہے کہ اس بی بی کا پیچھا چھوڑ دو۔
یہ اچھا بی بی نہیں ہے۔ یہ چالو عورت ہے۔ ادھر امارے آزاد ایجنسی میں ایسی عورت
پہلی فرصت میں گولی مارا جاتا ہے۔"

کاشف بولا۔ "اکبر بھائی! میں اس سے کون سا رشتے داری جوڑ رہا ہوں یہ تو

ذرا وقت گزاری ہے۔ اکٹھے گھوم پھر لیتے ہیں۔ آپ سب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر لیتے
ہیں۔ ہنس لیتے ہیں۔"

"ام نے کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا برادر۔ ام نے کل رات اس سفید چھوکری کو
تمہارے کمرے سے نکلتے دیکھا ہے۔ وہ آدھی رات کو کون سا لطیفہ سنانے گیا تھا تمہیں؟"

"آدھی رات کو؟ ہاں یاد آیا" کاشف نے جلدی سے بات بنائی۔ "وہ تو موم بتی
لینے گئی تھی۔ اس کے کمرے کی لائٹس نہیں جل رہی تھیں۔"

"موم بتی لینے گئی تھی یا کچھ اور' بہرحال ام کو یہ چکر بالکل پسند نہیں ہے.........
اگر تم واقعی اس سے دل لگا بیٹھا ہے تو پھر بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کو ایک دم مسلمان
بناؤ۔ اس سے نکاح کرو' اور اس کو پردے میں بٹھاؤ۔"

کاشف نے میری طرف دیکھ کر آنکھیں نچائیں۔" اکبر بھائی کی تجویز تو بالکل
مناسب ہے۔"

"ام ہمیشہ مناسب تجویز دیتا ہے۔ امارا ایمان ہے برادر کہ کسی کو غلط مشورہ نہیں
دینا چاہئے اور لڑکیوں کے بارے میں تو بالکل نہیں۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی جولیا وہاں آ گئی۔ اس نے پتلون کے اوپر باریک سی
شرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے جسم کو چھپانے کی بجائے مزید نمایاں کرتی تھی۔ اکبر بھائی
نے اسے دیکھ کر منہ میں لاحول پڑھا اور اس کی طرف سے نظریں چرا لیں۔ کاشف جولیا کو
دیکھ کر چہکا۔" اکبر بھائی نے تمہارے لئے ایک بڑی اچھی تجویز پیش کی ہے۔ ان کا خیال
ہے کہ ہم یونہی جھک مارنے کی بجائے ایک دوسرے سے شادی کر لیں۔"

"شادی مجھ کو بھی بہت پسند ہے۔ بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں بہت سی شادیاں
کروں۔" جولیا نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا۔

"خبردار!" کاشف نے رعب سے کہا۔ "بہت سی شادیوں کی بات مت کرنا۔
ہمارے ہاں صرف ایک شادی ہوتی ہے۔ پھر جو بھی ہو ساری عمر اس ایک شادی کے ساتھ
گزارا کرنا پڑتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پاؤں میں ایک زنجیر ڈال لو اور ساری عمر اس کے ساتھ
کھینچا تانی کرتے رہو۔ نہ بابا نہ۔ میں باز آئی ایسی شادی سے۔ شادی کے بغیر کون سا کام

رکا ہوا ہے ہمارا۔" وہ نشیلی نظروں سے کاشف کو دیکھ کر بولی۔
"دیکھ لو......... دیکھ لو......... دیکھ لو۔" اکبر خان نے سٹپٹا کر کہا۔ "ام غلط
کہتا کہ یہ دو نمبر عورت ہے۔"
"یہ دو نمبر کیا ہوتا ہے کاشی ڈیئر۔" جولیا نے معصومیت سے پوچھا۔
"دو نمبر......... دو نمبر دراصل دلیر عورت کو کہتے ہیں۔" کاشف نے جلد
بات بنائی۔ "خان صاحب کہہ رہے کہ تم بڑی بولڈ اور سچی کھری عورت ہو۔"
وہ خوش ہو گئی اور اکبر خان کی طرف دیکھ کر شکریے کے انداز میں سر
لگی......... بس ایسی ہی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں کے ساتھ دن گزرتے رہے......... چن
بعد ہم نے ملائشیا کا ایک چکر بھی لگایا۔ واپسی میں ہم نے سمندری سفر کیا اور ایک
چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی دیکھے۔ راجا فوٹو گرافی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔
ساتھ وہ ہر سفر کے نوٹس وغیرہ بھی لیتا رہتا تھا۔ کاشف کا خیال تھا کہ عنقریب راجا
دھانسو قسم کا سفرنامہ لکھے گا اور کسی پبلشر کو بہت مہنگے داموں بیچے گا۔ وہ اس سفر
کے تمام ایڈیشنوں اور ان کی رائلٹی وغیرہ کا حساب بھی پیشگی ہی لگا چکا تھا اور راجا کو
وقتاً فوقتاً بتاتا رہتا تھا کہ اگر اس نے سفرنامے کی تمام آمدن اکیلے ہی اکیلے ڈکارنے کی کوشش
تو پانی پت کی تیسری لڑائی چھڑ جائے گی۔ راجا اور کاشف کے درمیان اس تصوراتی
کی بندربانٹ پر دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ اکبر خان کی تمام تر بیزاری کے
اس سفر میں آفت جان جولیا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ وہ بڑی "شاہراہ عام" قسم کی
ثابت ہوئی تھی۔ بے شک کاشف کے ساتھ اس کی زیادہ بے تکلفی تھی مگر وہ ہم میں
ہر ایک کے ساتھ ہر وقت آنکھیں چار کرنے کے لئے تیار رہتی تھی اور تو اور اس
اکبر خان کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ ایک رات جب ہم نے Malay Pen کے
ایک ساحل پر کیمپ لگا رکھا تھا' رات کو بڑی تیز بارش ہوئی تھی۔ اس تیز بارش میں
کا ٹینٹ گر گیا تھا اور پانی اندر داخل ہو گیا تھا' وہ بڑی بے تکلفی سے اکبر خاں والے
میں جا گھسی تھی اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی تھی۔ صبح دم جب اکبر خان نے اس
فتنے کو اپنے پہلو میں محو خواب پایا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا وہ ٹینٹ سے نکلا اور اتنا شور
ہم سمجھے شاید سمندری طوفان نے ہمارے کیمپ کو آ دبوچا ہے۔ بعد میں جولیا ہنس

لوٹ پوٹ ہوتی رہی۔ اکبر خان سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ اچھے خاصے بارعب شخص
ہیں آپ کو تھوڑا سا دو نمبر (دلیر) ہونا چاہئے۔ آپ سے زیادہ تو کاشف دو نمبر ہے۔"
'دو نمبر' کے غلط استعمال نے ہمیں بھی بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔
وہ اپنی خرمستیوں اور بے راہروی کے قصے خود بھی مزے لے کر بیان کر دیا کرتی
تھی۔ اس نے ہمیں فرانس کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کس طرح اس نے ایک رات صرف
ایک وقت کے کھانے کے لئے خود کو بخوشی ایک ریستوران کے باورچی کے حوالے کر دیا
تھا۔ ادھیڑ عمر باورچی اپنی قسمت پر اتنا نازاں ہوا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ
گیا تھا۔ بعد ازاں جولیا کو اپنے ڈیڈ کی طرف سے ایک نہایت موٹی رقم کا ڈرافٹ پیرس
کے پتے پر آ گیا تھا۔ دو دن بعد جولیا نے کھانے کی قیمت سے پچاس گنا زیادہ قیمت باورچی
کو ادا کر دی تھی اور اس بے چارے کو ایک بار پھر سینے میں درد کی شکایت ہو گئی
تھی......... اپنی سیاحت کے دوران میں جولیا نے پولینڈ میں کچھ عرصہ گلوکاری بھی کی تھی
اور گٹار وغیرہ بجایا تھا۔ تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں سلطان تایا سے جولیا کا رابطہ
بھی گلوکاری اور ماڈلنگ وغیرہ کے سلسلے میں ہی ہوا تھا۔ سلطان تایا نے جولیا سے ایک دو
اشتہاری فلموں میں کام کرایا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حسب رواج جولیا کے ساتھ کچھ
رنگین وقت بھی گزارا تھا۔ جولیا اب سلطان تایا کی ایک اچھی دوست اور مشیر کی حیثیت
بھی رکھتی تھی......... مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے ہم اکتوبر کے آخر میں دوبارہ سنگاپور
آ گئے۔ اس سیاحت میں سب نے خاصا لطف اٹھایا تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی کئی بار نئے نئے
مناظر کے سحر میں گم ہو جاتا تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ تھا مگر وہ انگارے بھی اپنی جگہ تھے جو ہر
وقت میرے سینے میں سلگتے رہتے تھے۔ آرزو کو بھلانے کی ہزار کوششوں کے باوجود میں
اسے بھول نہیں پایا تھا۔ اس کا غم تو جیسے گزرنے والے ہر دن کے ساتھ نکھرتا جا رہا تھا۔
اگلے دو تین ماہ بھی ہماری پارٹی نے اسی طرح سیر سپاٹے میں گزار دیئے' سلطان
تایا کے ساتھ ہم ایک فلمی یونٹ کے ساتھ سنگاپور ایک قریبی جزیرے میں بھی گئے۔ یہ
انڈیا کا فلمی یونٹ تھا اور اسے وہاں قریباً تین ہفتے تک شوٹنگ کرنا تھی۔ ہمیں پہلی بار فلمی
لوگوں کے قریب رہنے اور ان کے کام کے طریقہ کار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ فلمی یونٹ کو تو
اس جزیرے پر کام کرنا تھا' وہ کام کرتے رہے مگر ہم چند دن بعد بور ہو گئے اور کاشف کو

صلواتیں سنانے لگے۔ دراصل فلمی یونٹ کے ساتھ اس بے کار جزیرے پر آنے کا
شوق کاشف ہی کو تھا۔ اور بات صرف اس جزیرے ہی کی نہیں تھی پچھلے چار پانچ ماہ
وہ کئی چھوٹے بڑے جزیرے دیکھ چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے جزیروں کی سیاحت کا خبط
سا ہو گیا ہے۔ بیکراں پانی میں گھرے ہوئے خشکی کے ویران ٹکڑوں کو دیکھ کر پتہ نہیں
اسے کیا راحت ملتی تھی۔ میں پوچھتا تھا تو وہ کہتا تھا۔ "یار! مجھے ایسے لگتا ہے جیسے دنیا کے
سارے جزیرے ہمارے لئے ہی بنے ہیں۔ ان ہی جزیروں میں گھومتے گھومتے کوئی جزیرہ
ہمیں ایسا مل جائے گا جو ہمیں اپنی رہائش کے لئے بہترین لگے گا۔ ہم ایک دو اچھی
لڑکیاں ڈھونڈھ کر اس جزیرے میں آباد ہو جائیں گے۔ وہ جزیرہ ہمارے لئے سلامتی اور
سکون کا جزیرہ ہو گا۔ وہاں ہمیں کسی ڈی ایس پی ریاض، کسی انسپکٹر بابر اور کسی اندھے
بہرے قانون کا ڈر نہیں ہو گا۔ ہماری اولاد ہو گی اولاد کی پھر اولاد ہو گی، ہماری
نسل سے دو تین بڑے بڑے قبیلے بن جائیں گے، ان قبیلوں کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دنیا
کے نقشے پر ایک نیا ملک وجود میں آ جائے۔ بعد میں یہ ملک اقوام متحدہ کا رکن بھی بن
ہے۔ اقوام متحدہ بیچاری کو کیا معلوم ہو گا کہ یہ سارے کا سارا چکر ایک خوبصورت لڑکی کی
وجہ سے چلا تھا جس کے دو شوہر اوپر تلے اتفاقاً دار فانی سے کوچ کر گئے تھے........"

وہ جب موڈ میں ہوتا تھا تو یونہی بے پر کی ہانکا کرتا تھا...... مگر ایک بات طے تھی
کہ نامعلوم وجہ سے کاشف کو جزیروں کی سیاحت میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس
دلچسپی کے سبب وہ ہمیں بھی ساتھ ساتھ لئے پھرتا تھا۔ اس سیاحت میں کسی وقت
بوریت بھی ہوتی تھی مگر زیادہ تر وقت اچھا گزرتا تھا۔ اکبر خان اور جولیا کی نوک جھونک
اور کاشف کی رنگین طبع کے باعث اکثر کئی طرح کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں۔
پھلجھڑیاں میرے لئے شدید درد میں پین کلر کا کام دیتی تھیں۔ جس طرح درد کش دوا کی
وجہ سے شدید ترین تکلیف بھی کچھ وقت کے لئے دب جاتی ہے۔ میں بھی اپنے
مسلسل غم کو عارضی طور پر فراموش کر دیتا تھا۔

جن دنوں ہم فلمی یونٹ کے ساتھ مینارو نامی جزیرے میں موجود تھے ایک روز شام
کے وقت جولیا میرے ساتھ مٹر گشت کے لئے نکل گئی۔ ابھرتے چاند کی روشنی میں
دونوں ساحل کے ساتھ دور نکل گئے۔ جولیا نے شروع میں مجھے بھی اپنی خوبصورت

آنکھوں کے ذریعے سبز جھنڈی دکھائی تھی لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کسی
اور پٹڑی پر چل رہا ہوں اور اس کی دکھائی ہوئی سبز جھنڈی سے مجھے کوئی غرض واسطہ
نہیں۔ بعد ازاں اسے کاشف سے میری کہانی بھی معلوم ہو گئی تھی اور اگر نہ بھی معلوم
ہوتی تو شاید وہ جلد ہی جان لیتی کہ میں کسی جان لیوا غم کے شکنجے میں ہوں۔ اس کی نگاہ
بڑی تیز تھی اور میں جانتا تھا کہ میرا چہرہ میرے اندرونی دکھ کا چلتا پھرتا اشتہار بن چکا ہے۔
چہل قدمی کرتے ہوئے جولیا نے اپنے بالوں کی آوارہ لٹیں چہرے سے ہٹائیں اور چھوٹی
سی ناک چڑھا کر بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ سیاحت کے لئے تو بڑی اچھی اچھی
جگہیں ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ کاشف کو پتہ نہیں ان ویران جگہوں کی خاک چھاننے
کا کیا خبط ہو گیا ہے۔"

"تو واپس چلی جاؤ۔ تم کوئی پابند تو نہیں ہو اس کی........"

"اور آپ سب پابند ہیں؟"

"ہاں بھئی! ہم تو پابند ہیں، زندگی موت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور پھر تم
خود کو ہمارے ساتھ کیوں ملاتی ہو؟ ہم تو بھگوڑے ملزم ہیں۔ تم ایک آزاد پنچھی ہو۔ کسی
صیاد کا ڈر نہیں ہے تمہیں۔ جہاں چاہو اڑ سکتی ہو۔ جس باغ میں چاہو چہک سکتی ہو۔"

"خیر اب اتنی بھی آزاد نہیں ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ گہری وابستگی پیدا ہو گئی
ہے۔"

"ہم لوگوں کے ساتھ یا صرف ایک لوگ کے ساتھ۔"

وہ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ کاشف کی طرف ہے۔ بال جھٹک کر بولی۔ "کچھ بھی سمجھ
لو........" ویسے ایک بات ہے سری لنکا اور اس کے آس پاس کے جزیرے دیکھنے کا مجھے
بھی بڑا شوق ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ایک دم سری لنکا کا ذکر بیچ میں کیسے آ گیا؟"

"گویا تمہیں ابھی کچھ معلوم ہی نہیں؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اچھا یاد آیا۔ اس وقت تم اکبر خان کے ساتھ مچھلی کے شکار کے لئے گئے ہوئے
تھے یہ کل کی بات ہے........ کاشف کا ایک دوست اس سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے

کہ ایک کارگو شپ (مال بردار جہاز) میں ہمارے سفر کا انتظام ہو گیا ہے۔ جلد ہی ہم اور دلچسپ بحری سفر پر سنگاپور سے براستہ نکوبار جزائر سری لنکا روانہ ہو رہے ہیں۔"

"اس چرغے کی اولاد نے مجھ سے تو ذکر تک نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ بھول گیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ تم سب کو سرپرائز دی رہا ہو۔ میں نے بھی اس کی گفتگو بس اچانک ہی سن لی تھی۔"

مجھے کاشف پر سخت تاؤ آنے لگا۔ آج کل وہ کچھ بدل سا گیا تھا۔ اس نے بچپن سے اب تک کبھی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی تھی لیکن اب لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کئی باتیں چھپانے لگا ہے۔ مٹرگشت سے واپس آنے کے بعد میں نے کیمپ میں پہنچتے ہی کاشف کو آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے کہا۔ "بھئی ٹھیک ہے کہ تمہارے پاس پیسے ہیں اور آج ہم تمہارے پیسوں کی مدد سے جی رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم ہمیں زر خرید غلام سمجھنے لگو اور اپنی مرضی سے جہاں جی چاہے ہانک کر لے جاؤ۔ بس اب بہت دیکھ لیا ہے دربدر بھٹک کر، اب ہم کچھ دن کہیں آرام سے رہنا چاہتے ہیں۔"

"آرام کے بچے! ایک جھانپڑ دوں گا تیری گردن پر، لگتا ہے کہ تجھے عزت راس نہیں ہے۔ کاٹھ کے بندر ذرا اپنی عقل کو ہاتھ مار۔ کسی ایک جگہ بیٹھ کر جوئیں مارنے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم نئی نئی جگہیں دیکھ رہے ہیں۔ پیارے پیارے لوگوں سے مل رہے ہیں۔ شاندار سواریوں پر سفر کر رہے ہیں۔ تیرے بڑوں نے کبھی خواب میں بھی سمندر کا تفریحی سفر نہیں کیا ہوگا۔ پیسہ تو میرا خرچ ہو رہا ہے۔ تیرے باپ کا کیا جاتا ہے اس میں۔"

"تو مہربانی کر.......... نہ اپنی دولت لٹا میرے اوپر.......... میں بس واپس جا رہا ہوں پاکستان.......... میں گرفتاری دے دوں گا۔"

"میں گرفتاری دے دوں گا۔" کاشف نے میری نقل اتاری اور اچھل کر میری گردن دبوچ لی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ اوپر اور میں نیچے تھا۔ جولیا اور اکبر خاں وغیرہ سمجھے ہم سچ مچ لڑ پڑے ہیں۔ تاہم قریب سے ہمارے تاثرات دیکھنے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ یہ تو دوستانہ لڑائی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئے اور ٹرپل فائیو کے سگریٹ پینے لگے.......... کاشف نے گہرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بہت عرصے سے دل چاہتا تھا ان ساحلی علاقوں

جزیروں میں گھومنے کا.......... اب اگر موقع ملا ہے اور سہولتیں بھی میسر ہیں تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے.......... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں جلال، ہم بڑا انجوائے کریں گے۔ سری لنکا اور اس کے آس پاس کے جزیرے بڑے خوبصورت ہیں۔"

اس دوران میں راجا بھی ہمارے پاس آبیٹھا۔ "کاشی ٹھیک کہہ رہا ہے جلال۔ ایک جگہ بیٹھ کر خون جلانے سے بہتر ہے کہ گھوم پھر کر جی بہلایا جائے۔"

"تم تو حمایت کرو گے ہی۔" میں نے کہا۔ "تمہارا سفرنامہ جو تیار ہو رہا ہے اور تصویریں بھی دھڑا دھڑ اتر رہی ہیں۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن وہ جزیرے بھی تو دیکھنے کے قابل ہیں۔" راجا نے کہا۔ "اور پھر بحری سفر کا ایک اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔"

ہمارے درمیان دیر تک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کے اختتام پر میں نیم رضامند ہو چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ مجھے نیم رضامند کیا جا چکا تھا۔

☆==========☆==========☆

جس جہاز پر ہم نے سنگاپور سے سری لنکا تک کا سفر کیا وہ ایک برطانوی جہاز تھا اور اس کا نام "مارکو" تھا۔ یہ جہاز صرف مال بردار ہی نہیں، مسافر بردار بھی تھا۔ اس میں قریباً 800 کے قریب مسافروں کی گنجائش تھی۔ اول اور دوم درجے کے بڑے شاندار کیبن بنے ہوئے تھے۔ ماحول صاف ستھرا تھا۔ کھانے کا معیار بھی اعلیٰ تھا۔ سوئمنگ پول، کھیل کا میدان، نائٹ کلب، سبھی کچھ جہاز میں موجود تھا۔ یہ جہاز عموماً گاڑیوں کی نقل و حرکت کے لئے استعمال ہوتا تھا، جس وقت ہم اس جہاز پر سوار ہوئے قریباً ڈھائی سو نئے ماڈل کی کاریں جہاز پر موجود تھیں۔ یہ کاریں ٹوکیو سے کولمبو لے جائی جا رہی تھیں..........

اس جہاز میں آنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ کاشف ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ایک آرام دہ اور بارونق بحری جہاز میں سفر کرنا بھی ٹھیک ٹھاک تفریح کے زمرے میں آتا ہے۔ اس جہاز میں انگریز، جاپانی، سنگاپوری غرض مختلف قوموں کے لوگ سوار تھے اور سب تفریحی موڈ میں تھے۔

جہاز میں آ کر میں اپنے موڈ میں کافی بہتری محسوس کر رہا تھا مگر سفر کے چوتھے پانچویں دن ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے ایک دم پریشان کر دیا۔ رات کا وقت تھا۔ سمندر میں

ہلکی طغیانی تھی اور جہاز چلتے ہوئے تھوڑا سا ہلکورا لے رہا تھا' شاید یہی وجہ تھی کہ
نیند نہیں آ رہی تھی۔ کیبن کی لائٹ بجھی ہوئی تھی' میرے ساتھ والے بیڈ پر اکبر
گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک......... بالکل اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے بالکل
موجود ہے۔ مجھے کسی کے سانسوں کی آواز اپنے کانوں کے بالکل نزدیک سنائی دی
میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ اکبر خان ہے۔ "اکبر
میں نے آواز دی۔ جواب میں مکمل خاموشی طاری رہی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھ
لائٹ جلائی۔ اکبر بدستور اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔

مجھے اپنی پیشانی سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ رات کا باقی حصہ میں نے جا
ہوئے ہی گزار دیا۔ میں کمزور اعصاب کا شخص نہیں تھا' پھر بھی پتہ نہیں کیا بات
میرے ذہن پر ایک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ اک بے معنی اور بے نام سا خوف...
اس بے شکل خوف محسوس کرنے کے بعد نجانے میں میرے ذہن میں آرزو کا سراپا اجاگر
گیا تھا۔ وہ بھی تو کسی ایسے ہی خوف کا ذکر کیا کرتی تھی۔ کوئی ڈر جو بلا وجہ اس کے
دماغ کو جکڑ لیتا تھا۔ میرے کانوں میں بار بار سانسوں کی آواز گونج رہی تھی اور میں خ
یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ تیز سمندری ہوا کی سرسراہٹ تھی جو سانسو
آہٹ بن کر میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

اگلے روز دل و دماغ پر عجیب سا بوجھ رہا۔ کاشف جولیا اور اکبر خان نے کئ
پوچھا لیکن میں نے بے خوابی اور سر درد کا بہانہ بنا دیا۔ اس روز جب شام کو سب ڈا
ہال میں جمع تھے اور آرکسٹرا وغیرہ بج رہا تھا ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے با
پاس آ کر بیٹھ گیا ہے' مجھے اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور جسم کی باس تک محس
ہوئی۔ میں نے بوکھلا کر ارد گرد دیکھا' میں اکیلا تھا' میری دونوں جانب ایک ایک نش
خالی تھی۔ ان سے اگلی نشستوں پر اکبر خاں اور راجا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کاشف
جولیا خوش باش ہجوم کے درمیان موجود تھے اور خود بھی ہنس کھیل رہے تھے۔ ایک
پھر کوئی عجیب سا خوف میرے دل و دماغ پر طاری ہو گیا تھا۔ اس دوران میں جولیا ہاتھ
شیمپئن کا گلاس لئے واپس آ گئی۔ اس نے شیمپئن جام کی بجائے عام گلاس میں ڈال
تھی۔ یہ احتیاط وہ اکبر خاں کی وجہ سے کرتی تھی۔ اکبر خاں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ

ڈرنک وغیرہ پی رہی ہے۔ وہ میری بائیں جانب والی خالی نشست پر بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی
کیونکہ اکبر خاں دائیں جانب تھا اور وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر شراب نہیں پی سکتی تھی
لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ وہ دائیں جانب بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے مجبوری کا
تاثر ملتا تھا۔ "ادھر بیٹھ جاؤ۔" میں نے بائیں جانب کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

اسی دوران میں حاضرین کا دل بہلانے کے لئے ایک انگریز جوکر سامنے اسٹیج پر
نمودار ہو گیا اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں بدستور ایک نامعلوم خوف کے
گھیرے میں تھا۔ اگر کوئی اس وقت مجھ سے بات چیت کرتا تو یقیناً میری اندرونی کیفیت کو
بھانپ لیتا۔ میں اٹھ کر ٹیرس کی طرف آ گیا اور وہاں سے چہل قدمی کرتا ہوا ڈیک کی
طرف نکل آیا۔ یہاں اوپن ایئر میں بھی بہت سے افراد بیٹھے تھے اور تاروں بھرے آسمان
کا نظارہ کر رہے تھے۔ میں جنگلے کے سہارے کھڑا ہو کر سمندر کے تاریک پانی کو دیکھنے لگا۔
اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کوئی پھر میرے بالکل پاس آن کھڑا ہوا ہے......... دو تین
منٹ برقرار رہنے کے بعد اچانک یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ میں خود کو پھر سے تنہا محسوس
کرنے لگا۔ اسی دوران میں کاشف بھی مجھے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے ہنس ہنس
کر اکبر خاں کا قصہ سنانے لگا کہ کس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک تھائی لڑکی نے اکبر
خاں کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی پیش کش کی ہے اور کس طرح اکبر خان نے اس پر
نصیحتوں کی بارش کی ہے اور اسے اچھی اچھی دینی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا ہے.........

میں کھوئے کھوئے انداز میں اکبر خان والا واقعہ سنتا رہا۔ کاشف جھلا کر بولا۔
"اوئے ماں کے مجنوں' میں تجھے لطیفہ سنا رہا ہوں اور تو بس ہوں ہاں کرتا جا رہا ہے۔ تیرا
دماغ تو ٹھکانے پر ہے۔"

"سمجھو کہ نہیں ہے۔"

"دیکھ تیرے دماغ کو ٹھکانے پر لانے کے لئے اتنے پاپڑ بیل رہا ہوں میں۔ اگر اب
بھی نہیں سدھرے گا تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی کسی دن تجھے اٹھا کر اسی سمندر میں
پھینک دوں گا۔"

اسی رات بارہ ایک بجے کا عمل ہو گا جب ایک بار پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے

محسوس ہوا تھا جیسے کوئی بھاری بھرکم شخص میرے بستر پر آکر بیٹھ گیا ہے۔ میں نے تاریکی میں بے ساختہ دائیں بائیں ہاتھ گھمایا۔ ہاتھ ہوا میں گھوم کر رہ گیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ایک بار پھر خوف کی وہی کیفیت دل و دماغ کو گھیرے میں لے رہی تھی۔ میری حسیات مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ کوئی میرے بالکل پاس موجود تھا۔ شاید ایک آدھ فٹ کے فاصلے پر۔ وہ بول رہا تھا نہ مجھے چھو رہا تھا۔ نہ کوئی نقصان پہنچا رہا تھا۔ مگر اس کی موجودگی سو فیصد یقینی تھی۔ اس کے سانسوں کی آواز اس کے جسم کی بو سب کچھ موجود تھا۔

آج میں نے دل کو مضبوط رکھا اور جان بوجھ کر لائٹ آن نہیں کی۔ میں نے آواز دے کر اکبر خان کو جگایا۔ وہ نیند سے جاگا تھا پہلے تو اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا تاہم پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد اس کے حواس بحال ہو گئے۔ وہ جماہی لے کر بولا۔ "کیا بات ہے برادر؟ کیوں اب تک اُلو کے مافق جاگ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اکبر بھائی میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور دکھاؤ۔" وہ بولا۔

آہٹوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنا ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا رہا ہے۔

"نہیں اکبر بھائی۔" میں نے پکار کر کہا۔ "لائٹ نہیں جلاؤ......... بس ایسے ہی میرے پاس آجاؤ۔"

وہ الجھن سے بولا۔ "برادر جلال خیر تو ہے' تم اندھیرے میں ام کو کیا دکھائے گا؟"

"تم آؤ تو سہی۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھا اور ٹٹولتا ہوا میرے بستر پر آبیٹھا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "کہیں تم ڈر تو نہیں گیا ہے؟"

"اکبر بھائی......... ذرا دھیان دو' خوب غور سے محسوس کرو۔"

"یا اللہ خیر......... ام کیا محسوس کرے؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اکبر بھائی' اس کمرے میں ہم دونوں ہی ہیں......... کوئی تیسرا بھی موجود ہے۔"

"برادر جلال! تم کیسی باتیں کر رہا ہے۔" اکبر نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "کیبن

میں ام دونوں کے علاوہ اور کون ہوگا؟"

"ذرا دھیان سے سنو اکبر بھائی کیا تمہیں کسی کے سانسوں کی آواز نہیں آرہی۔ کسی کے جسم کی بو۔ تھوڑا سا غور کرو۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر اکبر کی لرزاں آواز ابھری۔ "برادر تم نے تو امارے دماغ کو چکرا دیا ہے۔ تم کیسی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ یہاں اور کون ہوگا؟"

اکبر ٹھیک کہہ رہا تھا اور میں بھی غلط نہیں تھا۔ میں جو کچھ محسوس کر رہا تھا پورے ہوش و حواس کے ساتھ کر رہا تھا۔ میں نے بستر سے نیچے اتر کر کیبن کی لائٹ جلا دی وہاں میرے اور اکبر خاں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اکبر خان مجھے تشویش ناک نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے گلے سے چمڑے کا ایک تعویذ اتار کر میرے گلے میں ڈال دیا اور ایک بار پھر اپنے بستر پر جا کر سو گیا۔

اگلی صبح ناشتے پر کاشف نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "رات بھر مفرور اُلو کی طرح گھومتے رہے ہو؟"

"کہاں گھومتا رہا ہوں۔ میں تو اپنے کیبن میں تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ میں نے......... خود تمہیں کھڑکی میں سے دیکھا ہے۔"

"کس کھڑکی میں سے؟"

اس نے سٹپٹا کر ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "اگر تمہیں بتاؤں گا تو پھر تم ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاؤ گے' لہٰذا بس یہ سمجھ لو کہ میں نے تمہیں کسی کھڑکی میں سے دیکھا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ رات تم پھر جولیا کے کیبن میں موجود تھے' اس کیبن کی کھڑکی سے ہمارا کیبن نظر آسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اکبر بھائی کو سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ تمہاری خرمستیاں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔"

"ارے تو بتا دو اپنے اکبر بھائی کو......... میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں اور نہ ـــ کر کھاتا ہوں۔ بس ویسے ہی دل میں عزت ہے اکبر بھائی کی اس لئے کھل کر بات نہیں کرتا۔" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ پھر ٹون بدل کر بولا۔ "اچھا یار! چھوڑو اس بات کو......... تم باتوں باتوں میں بات کسی اور طرف لے گئے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ رات کو کہاں گئے تھے کیبن سے نکل کر؟

"میں نہیں تھا یار، کوئی اور ہوگا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"اور کون ہو سکتا ہے۔ تم ہوگے یا اکبر بھائی ہوگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کیبن سے نکلتے ہوئے۔ میں نے تو ٹائم بھی نوٹ کیا تھا۔ بارہ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔

بارہ بج کر پچاس منٹ........ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کل رات لگ بھگ اسی وقت تو اکبر خاں سے سوال جواب کرنے کے بعد میں نے کیبن کی لائٹ روشن کی تھی۔ اس وقت بارہ بج کر پینتالیس پچاس منٹ ہی ہوئے تھے، اس وقت کیبن سے نکل کر کس نے جانا تھا۔ میں نے کاشف کے سامنے بات گول مول کر دی لیکن ذہن میں ایک عجیب سا شک موجود رہا۔ ایسا شک جسے میں کسی ساتھی کے سامنے بیان کرتا تو وہ مجھے فاترالعقل سمجھ بیٹھتا۔

میں سارا دن عجیب و غریب سوچوں میں گھرا رہا۔ وہ سارے انہونے واقعات ذہن میں پھر تازہ ہوگئے تھے جو چند ماہ پہلے لاہور اور پھر ایبٹ آباد میں پیش آئے تھے۔ ذہن عجیب طرح کے تانوں بانوں میں الجھا رہا۔ شام کو جب ڈائننگ ہال میں اکٹھے ہوئے تو اچانک نہیں کیوں مجھے کل شام والا واقعہ یاد آگیا۔ جولیا شیمپئن کا گلاس لے کر میری بائیں جانب والی کرسی پر بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر پھر وہ دائیں جانب کی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا انداز معمولی ہونے کے باوجود مجھے غیر معمولی نظر آیا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں جولیا سے پوچھا۔ "کل کیا ہوا تھا۔ تم شیمپئن کا گلاس لے کر میری بائیں جانب والی کرسی پر بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر پھر وہ دائیں جانب کی کرسی پر اکبر بھائی کے پاس جا بیٹھی تھی۔ اسے تمہاری کولڈ ڈرنک میں سے الکحل کی بو آجاتی تو........ میرا مطلب ہے کہ تم بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ جاتیں۔"

"ادھر ہی بیٹھنے لگی تھی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "لیکن پھر وہ لمبا آدمی وہاں بیٹھ گیا۔"

"کون لمبا آدمی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہی جس کی لمبی داڑھی تھی اور ویلوٹ کا لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔"

"لمبی داڑھی۔ چوغہ؟" میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

جولیا جس وقت کی بات کر رہی تھی وہاں میرے آس پاس کوئی ایسا شخص موجود

نہیں تھا، اور وہ کرسی بھی یکسر خالی رہی تھی........ اچانک ہی مجھے اپنے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، بہت غیر معمولی تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ایک جنگ سی میرے اندر ہونے لگی تھی........ عقل ششدر تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص میرے آس پاس موجود رہا ہو اور میں اسے نہ دیکھ سکا ہوں مگر دوسروں نے اسے دیکھا ہو؟ کیا ایسا ہو سکتا تھا؟

سنگاپور سے سری لنکا تک کے ہمارے سفر نے قریباً دس روز لئے۔ ہم پہلے جزائر سماٹرا کی خلیج کے اندر سے گزرے پھر جزائر انڈیمان کے پاس سے ہوتے ہوئے سری لنکا پہنچ گئے۔ اس سارے سفر کی اہم ترین بات وہی پُراسرار احساس تھا جو مجھے اپنے قریب کسی ان دیکھے وجود کی موجودگی کا پتہ دیتا تھا۔ ایک دو مواقع کو چھوڑ کر مجھے اس وجود کی موجودگی کا احساس صرف اس وقت ہوتا تھا جب میں یکسر تنہا ہوتا تھا۔ خاص طور سے میں جب بھی کمرے میں یا باتھ روم وغیرہ میں اکیلا ہوتا تھا، پُراسرار سانسوں کی سرسراہٹ مجھے اپنے قریب سنائی دینے لگتی تھی۔ میں نے اپنی یہ کیفیت اپنے ساتھیوں سے بالکل چھپائے رکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کافی کامیاب رہا ہوں۔

اس سفر کے دوران میں کاشف اور جولیا کا رومانس بھی جاری ساری رہا تھا۔ دونوں اکبر خان کے ساتھ باقاعدہ آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ اکبر خاں انہیں دیکھتے ساتھ ہی نکاح کرنے کی ترغیب دیتا تھا، کبھی ڈانٹتا ڈپٹتا تھا، کبھی پیار سے سمجھاتا تھا۔ اکبر خاں کے سامنے وہ دونوں اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں جس کا خوفناک نتیجہ شادی کی صورت میں نکلے۔ اکبر خاں کو رام کرنے کے لئے کبھی کبھی جولیا اپنی حکمت سے کام لیتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھنا اور تلا ہوا گوشت اکبر خاں کی کمزوری ہے۔ وہ موقع محل دیکھ کر کبھی اس کے لئے تکہ کباب کبھی چکن جنجر، کبھی چکن مالک اور کبھی فنگر فش کا اہتمام کرتی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اسے یہ حلفیہ بیان بھی اکبر خان کی "عدالت" میں داخل کرانا پڑتا تھا کہ یہ سوفیصد حلال گوشت ہے۔ اس سارے سفر کے دوران بھی راجا اپنی فوٹوگرافی اور اپنے سفرنامے میں کھویا رہا تھا۔ اب تک جزائر کی سیر کے حوالے سے راجا کے پاس خاطر خواہ مواد جمع ہو گیا تھا۔

جہاز کولمبو کے ساحل پر لنگر انداز ہوا مگر ہمارا پروگرام سری لنکا میں داخل ہونے کا

نہیں تھا۔ ہم نے پورٹ سے ہی ایک بار پھر رخت سفر باندھ لیا۔ راجے سنگھ کے د وعریض تعلقات نے یہاں بھی کام دکھایا تھا۔ کولمبو پورٹ پر ہمارے لئے ایک لگژری لا جسے چھوٹا موٹا بجرہ ہی کہنا چاہئے' موجود تھی۔ یہ لانچ ہمیں قریبی جزائر کی سیر کرانے لئے کل وقتی بنیاد پر حاصل کی گئی تھی۔ اس کا عملہ دو چوکس افراد پر مشتمل تھا۔ لا ڈرائیور محمد عظیم پراتھا ایک سنہالی مسلمان تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی۔ وہ خا خوش اخلاق آدمی تھا۔

بذریعہ لگژری لانچ ہمارا سفر 28 اکتوبر کو شروع ہوا۔ ہم نے اب تک انہی کاغذا کے سہارے سفر کیا تھا جو کالی کٹ میں ہمیں راجے سنگھ نے بنوا کر دیئے تھے' اب بھی کاغذات ہمارے پاس تھے۔ بحرہند میں سفر کرتے ہوئے ہم سری لنکا کے دارالحکومت کو سے شمال مغرب کی طرف گئے۔ ہماری پہلی منزل ڈے کارے نام کا ایک جزیرہ تھا۔ یہ آبادی بہت کم تھی۔ کیلے' تاڑی اور پام وغیرہ کے درخت بکثرت تھے۔ مقامی باشند ناریل کو کئی ڈھنگ سے اور بکثرت استعمال کرتے تھے۔ فضا میں ہروقت ناریل کے تیز خوشبو رچی رہتی تھی۔ جزیرے کا ساحل بہت خوبصورت تھا۔ ہم نے ساحل کے قریب کیمپ لگایا۔ لانچ ڈرائیور ان جزائر کی مقامی زبانیں بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس موجودگی سے ہمیں بہت فائدہ تھا اور جزائر کے باشندوں سے رابطہ قائم کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ لوگ ہمارے لئے پھل' تازہ سبزی اور مرغی وغیرہ لے کر آتے تھے' اس کے بدلے ہم انہیں کھانے پینے کی اشیاء' کپڑے اور نقد بھی دیتے تھے۔ عظیم پراتھا کی لانچ میں راجے سنگھ نے ایک خفیہ خانے کے اند رائفلیں اور ایک پستول بھی رکھوا دیا تھا۔ اس اسلحے کی موجودگی ہمارے لئے اضافی تح باعث تھی۔ میں نے اضافی اس لئے کہا ہے کہ یہاں کے لوگ بلکہ ان تمام جزیروں لوگ بڑے ملنسار اور کوآپریٹو تھے۔ پھر بھی اچھے برے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے خصوصاً اس وجہ سے ہمیں کچھ احتیاط کی ضرورت تھی کہ ہمارے ساتھ ایک خوبرو لڑکی بھی موجود تھی۔

"ڈے کارے" نامی اس جزیرے میں ہم کوئی دس روز رہے پھر رخش شو سوار ہو کر آگے روانہ ہو گئے........ اگلے تین ہفتے میں ہم نے تین چار اور چھ

چھوٹے آباد اور بے آباد جزیرے دیکھ لئے۔ آخری جزیرے میں ہمیں ایک شدید اور طویل بارش نے آگھیرا' ہم قریباً دس دن تک اپنے کیمپ میں پھنسے رہے اور جی بھر کر بور ہوئے۔ اس جزیرے پر پہنچنے کے بعد ہمارا مختصر گروپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میرا اور اکبر خان کا خیال تھا کہ ہم کافی دور نکل آئے ہیں' اب واپس چلا جائے اور کولمبو کے آرام دہ ماحول میں چند دن گزارے جائیں۔ کاشف اور سفرنامہ نگار راجا ابھی آگے جانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جولیا غیر جانبدار تھی' اس کا کہنا تھا کہ جو بھی فیصلہ جمہوری انداز میں ہو گا وہ اس کا ساتھ دے گی۔

کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ ابھی چند دن مزید یہ سفر جاری رکھا جائے' کیونکہ اب موسم ایک دم بہتر ہو گیا ہے اور دو تین جزیرے بھی یہاں قریب قریب ہی واقع ہیں۔ ہم ایک بار پھر اپنی لانچ پر سوار ہوئے اور عازم سفر ہو گئے۔ ڈیڑھ دن کی مسافت کے بعد ہم ویران سمندر کے ایک دور افتادہ جزیرے میں پہنچے۔ جزیروں کا شناور عظیم پراتھا بھی اس علاقے میں پہلی بار پہنچا تھا۔ یہ سمندر آمدورفت کے راستوں سے کافی ہٹ کر تھا لہٰذا حد نگاہ تک آسمان اور پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جزیرہ جس کا نام عظیم پراتھا کو بھی معلوم نہیں تھا ہماری لانچ کے سامنے شمالاً جنوباً آٹھ دس میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی گہرائی ہماری نگاہ سے اوجھل تھی۔ جزیرے پر پام کے بلند و بالا درخت دور ہی سے نظر آتے تھے۔ زمین سطح مرتفع کی طرح تھی اور کہیں کہیں ٹیلے بھی تھے۔ "کیا خیال ہے آبادی ہو گی؟" راجا نے پوچھا۔

"یہ تو جا کر ہی پتہ چلے گا۔" کاشف نے جواب دیا۔

"کسی ان دیکھے جزیرے پر اترنے کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔" جولیا نے کاشی کو خوش کرنے کے لئے کہا۔

"یہ مزا ام سب درجنوں مرتبہ لے چکے ہیں' اور سیانا لوگ کہتا ہے کہ مزے کا بھی ایک حد ہوتا ہے جہاں یہ حد ختم ہوتا ہے وہاں سے کوئی نہ کوئی آفت شروع ہو جاتا ہے۔" اکبر خاں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

عظیم پراتھا نے بڑی ہوشیاری سے لانچ کو ایک قدرتی کھاڑی میں پہنچایا اور ساحل سے لگا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس نئے جزیرے پر قدم رکھ چکے تھے۔ پچھلے جزیرے کی

طرح یہاں بھی نباتات کی بھرمار تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ بارش کے بعد ہر شے نکھری اور دھلی دھلائی نظر آتی تھی۔ ہم نے لانچ کو دو مضبوط رسو کی مدد سے درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔ لانچ کی حفاظت کے لئے عظیم پراتھا کا ساتھ سورن جسے ہم پہلوان کہنے لگے تھے لانچ پر ہی رہا۔ ایک رائفل بھی اس کے پاس موجو رہی' دوسری لائسنس یافتہ رائفل اور پستول ہم نے اپنے ساتھ لے لئے۔ اجنبی جگہوں اس قسم کی احتیاط لازمی ہوتی ہے۔ جزیرے کی مٹی سیاہی مائل اور زرخیز تھی۔ فضا نباتات کی مہک رچی تھی۔ کیلے ناریل اور تاڑ کے طویل قامت پودے نظر آرہے تھے۔ خودرو جھاڑیاں بھی بے شمار تھیں۔ ہم سب نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ کیمپنگ کا کچ سامان ہمارے کندھوں پر تھا باقی ہم فی الحال لانچ میں چھوڑ آئے تھے۔ راجا ایسے مقامات بہت خوش نظر آنے لگتا تھا...... وہ گاہے گاہے تصویریں بھی لے رہا تھا۔ کاشف کے پا ہینڈی ویڈیو کیمرا تھا۔ وہ بھی مختلف مناظر کو شوٹ کرتا جارہا تھا۔ دو ڈھائی فرلانگ آ آنے کے باوجود ہمیں کہیں آبادی کے آثار نظر نہیں آئے۔ کچھ آگے جاکر ہمیں ایک ٹی نما جگہ دکھائی دی۔ اس ٹیلے کا کچھ حصہ بالکل ہموار تھا اور کیمپ لگانے کے لئے موزو دکھائی دیتا تھا۔ مزید فائدہ یہ تھا کہ یہاں سے سمندر کا نیلگوں پانی اور اس پر ہچکولے کھا ہوئی ہماری سرخ لانچ بھی دکھائی دیتی تھی۔

ہم نے جگہ اچھی طرح صاف کرکے وہاں کیمپ لگالیا۔ عظیم پراتھا نے تاڑ کے درختوں کے درمیان ایک مچان سی بنالی اور اس مچان پر چڑھنے کے لئے رسی کی سیڑھی لگادی۔ یہ مچان ہمارے کیمپ سے قریباً پچیس فٹ کی بلندی پر تھی اور اس پر سے ارد گ نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ کیمپ تیار کرتے کرتے شام ہوگئی تھی۔ ہم تھکے ہوئے بھی تھے جلدی سونے کا فیصلہ ہوا۔ حسب پروگرام پہلوان کو لانچ میں ہی سونا تھا۔ کاشف راجا ا جولیا کے لئے ایک خیمہ تھا جب کہ میں اکبر خاں اور عظیم پراتھا دوسرے خیمے میں تھے جدید طرز کے یہ چھوٹے چھوٹے خیمے بے حد محفوظ اور آرام دہ تھے......

آدھی رات کو ایک بار پھر اسی نامعلوم خوف نے مجھے آگھیرا۔ یہ کیفیت آٹھ د روز کے وقفے کے بعد پیدا ہوئی تھی اور خاصی شدید تھی...... کوئی میرے بالکل پاس گیا تھا شاید میرے ساتھ ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سانسوں کی سرسراہٹ میرے کانوں

ی اور اس کے جسم کی بو...... آج یہ بو زیادہ قریب اور واضح محسوس ہو رہی تھی۔ اس میں ایک حیوانی سا تاثر تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا جیسے یہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کسی گلی جانور کی بو ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا' تھرماس میں سے پانی نکال کر پیا اور اپنے اعصاب پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً ایک آواز نے مجھے چونکایا...... فضا کا سینہ رتی ہوئی یہ تیز باریک آواز شکرے کی تھی۔ یہ آواز ہمارے خیموں کے اوپر سے گزری رچند سیکنڈ کے اندر اندر بہت فاصلے پر چلی گئی...... یہ آواز میرے لئے بالکل نئی نہیں ی۔ کل دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے بھی میں نے اور میرے ساتھیوں نے یہ آواز سنی ی۔ اس وقت ہم کھلے سمندر میں تھے۔ کسی جنگلی طیارے کی گونج کی طرح یہ آواز دو رتبہ ہمارے سروں کے اوپر سے گزری تھی اور پھر جزیرے کی طرف چلی گئی تھی۔ نہ نے کیوں اب مجھے یہ آواز بھی پُراسرار محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید کاشف ٹھیک ہی کہتا ا میں اب ہر چیز میں پُراسراریت ڈھونڈنے لگا تھا...... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ایک ندہ ہے جو کل سے ہمارے ارد گرد چکرا رہا ہے۔

اگلے روز ہم دو ٹولیوں میں بٹ گئے اور اس جزیرے کی سیر کے لئے نکل گئے۔ اشف' راجا اور جولیا ایک ٹولی میں تھے جبکہ میں اکبر خان اور پراتھا دوسری ٹولی کی شکل ں تھے۔ اکبر خاں کے پاس پستول جب کہ کاشف کے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ ب تھک کر ہم دوپہر کے بعد واپس آئے۔ جزیرہ ہماری توقع سے زیادہ بڑا دکھائی دیتا ا۔ ایک دو جگہوں پر ہمیں ایسی نشانیاں ملی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید یہاں گ موجود ہیں' مگر ابھی تک نظر کوئی نہیں آیا تھا۔ کاشف جلی ہوئی لکڑی کے کچھ کوئلے اتھ لایا تھا اور ان کوئلوں کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہا تھا کہ یہاں لوگ وجود ہیں......

جواب میں پراتھا نے یہ کہا تھا کہ یہ کوئلہ آسمانی بجلی کی وجہ سے لگنے والی آگ کے ب بھی بن سکتا ہے۔ جولیا نے اپنے ہینڈ بیگ میں دو تین طرح کے جنگلی پھول توڑ کر ال رکھے تھے جبکہ راجا نے کچھ سیپیاں وغیرہ جمع کی تھیں۔ جزیرے پر مچھر بھی تھا جبکہ ام درختوں پر چیونٹیاں وغیرہ بھی پائی جاتی تھیں۔ ابھی تک ہمیں گرگٹ' چھپکلے اور لہریاں وغیرہ تو ملی تھیں تاہم بڑا جانور کوئی دکھائی نہیں دیا تھا......

لنچ ہم نے ٹن پیک فوڈ سے کیا۔ جولیا ہمارے درمیان اکلوتی خاتون تھی اور نے اپنا فرض بخوبی انجام دیا۔ ٹن پیک کیے جانے والے اکثر کھانے صرف پانی ڈال گرم کرنے سے تیار ہو جاتے ہیں۔ جلد ہی گرما گرم کھانا ہمارے سامنے تھا۔

"اس پلیٹ میں کیا ہے؟" کاشف نے جولیا کے عقب میں رکھی پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو یہ خان صاحب کے لئے ہے۔"

"خان صاحب کے لئے ہے تو پھر ظاہر ہے کہ گوشت ہی ہو گا......... لیکن مس تم کچھ بھی کر لو مگر ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے ہمارے ساتھ رہنا ہے تو پھر خان صاحب تمہیں، ٹوپی والا برقعہ پہنا کر چھوڑیں گے۔" کاشف نے کہا۔

"بالکل غلط۔ اب ام نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ام اس میم صاحب سے اور تم سے نہیں کہیں گا۔ جب کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ہے تو پھر کہنے سے فائدہ کیا؟ یہ میم صاحب شاید یہاں آیا ہی امارا عاقبت خراب کرنے کے لئے ہے۔ بس تم لوگوں کے ساتھ یہ آخری دن ہے۔ جس دن ام یہاں سے واپس جائے گا' سیدھا پاکستان جائے گا۔ وہاں بھی امارے ساتھ ہوگا ام بھگتے گا۔"

جولیا نے میٹھی نظروں سے اکبر خان کو دیکھا اور بولی۔ "اگر خاں صاحب کہیں تو میں برقعہ پہننے کو بھی تیار ہوں لیکن آپ سب کا ساتھ چھوڑنا مجھے قبول نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے سب سے خوبصورت دن آپ لوگوں کے ساتھ گزارے ہیں۔"

"اور ام نے سب سے مشکل دن۔" اکبر خان نے کہا۔

"دیکھیں خان صاحب اب تو میں برقعہ پہننے کو بھی تیار ہو گئی ہوں۔" جولیا نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"برقعہ پہن لینے سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ خوچے اصل برقعہ تو دل نے پہننا ہے۔ تم اگر برقعہ پہن کر بھی ایسی حرکتیں جاری رکھے گا تو پھر برقعے کو بھی اپنی طرح کر دے گا۔"

"کنڈم......... یہ کنڈم کیا ہوتا ہے؟" جولیا نے کاشف سے پوچھا۔

"میرا سر ہوتا ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"یعنی سر کو کنڈم کہا جاتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"یعنی میں کہہ سکتی ہوں کہ جب سے میں یہاں آئی ہوں میرے کنڈم میں سخت درد ہو رہا ہے؟"

"بالکل کہہ سکتی ہو بلکہ جو بھی تمہارے دل میں آئے کہہ سکتی ہو۔" کاشف نے کہا۔

"ویسے تو میرے کنڈم میں بھی بہت درد ہو رہا ہے۔" راجا نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ طبیعت بھی بھاری بھاری ہے۔ شاید مچھروں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔"

"ہاں صبح سویرے جب ام حاجت کے لئے نکلا تو مچھروں نے امارے ساتھ بھی بہت برا کیا۔ جگہ تو یہ اچھا ہے لیکن بیمار ہونے کا ڈر ہے۔ امارا تو خیال ہے کہ کل کا دن اور گھوم پھر کر دیکھ لو' پھر نکلو یہاں سے......... ویسے بھی ایسی جگہوں کا سیاحت اب کافی ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے برادر جلال۔"

"میرا خیال وہی ہے جو کاشف کے علاوہ ہم سب کا ہے۔"

کاشف ایک دم بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

ہم خیموں کے سامنے کھلی جگہ پر بیٹھے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں دسترخوان پر رکھی تھیں۔ ہمارے کھانے کے دوران ہی بہت سے کوے اردگرد کے درختوں پر آ بیٹھے تھے اور کھانے پینے کی اشیاء کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے سر کا کچھ حصہ گرے کلر کا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے ہم نے اردگرد دیکھا تو کوؤں کی تعداد کافی زیادہ ہو چکی تھی۔ ابھی مزید کوے اڑ اڑ کر ہماری طرف آ رہے تھے اور شاخوں پر بیٹھ رہے تھے۔ کچھ کوے زمین پر اچھلتے اچھلتے ہمارے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ اکبر خاں اور عظیم پراچا نے کنکر پھینک کر انہیں اڑانے کی کوشش کی۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر پھر جم گئے۔ ان کا کریہہ شور دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کوؤں کی تعداد بے شمار ہو گئی۔ اردگرد کے درخت ان کی موجودگی سے سیاہ نظر آنے لگے۔ ہم سب کا ماتھا ٹھنکا۔ ویران جگہوں پر کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر عموماً پرندے جمع ہو جاتے ہیں مگر یہ تو ایک جم غفیر تھا جو ہماری طرف لپکنے

کے لئے پر تول رہا تھا۔ میرے دل میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کوئی انہو
ہونے لگی ہے۔

اپنے اردگرد لاتعداد کوؤں کو دیکھ کر جولیا نے مری مری آواز میں کہا۔ "کہیں
حملہ ہی نہ کر دیں۔"

"چلو خیموں میں چلے جاتے ہیں۔" کاشف نے کہا۔

ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کا ہم نے تصور بھ
نہ کیا تھا۔ چند کوے چیختے ہوئے کھانے پینے کی اشیا پر جھپٹے اور پھر فراٹے کی زور دار آوا
کے ساتھ سینکڑوں کوے بھرا مار کر ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ میں نے جولیا کی کرب ناک
چیخیں سنیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے کوے مجھ سے چمٹ گئے۔ میں نے ان کی بے
رحم چونچوں کی چبھن اپنے سر بازوؤں اور سینے پر محسوس کی۔ چہرہ میں نے اپنے ہاتھو
اور بازوؤں کے درمیان چھپا لیا تھا۔ ہماری پناہ گاہ ہمارے خیمے تھے۔ ہم کوؤں کو اپنے او
سے ہٹاتے اور کھینچتے ہوئے خیموں کی طرف دوڑے' جس وقت میں خیمے کے اندر داخ
ہو رہا تھا میں نے راجا کو لڑکھڑا کر ایک گڑھے میں گرتے دیکھا۔ ایک دم ہی چیختے چلا
کوؤں نے اسے ڈھانپ لیا۔ یہ بڑا روح فرسا منظر تھا۔ اس وقت میں نے باہمت اکبر خا
کو دیکھا' وہ راجا کے عین پیچھے آ رہا تھا۔ راجا کو شدید مشکل میں دیکھ کر وہ گڑھے میں کو
گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے' اس
نے خونخوار کوؤں کے درمیان سے راجا کو نکالا اور گڑھے کے کنارے سے پرے آیا۔ اس
دوران میں میں بھی چالیس پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے واپس گڑھے تک پہنچ چکا تھا۔ ہ
نے راجا کو ڈنڈا ڈولی والے انداز میں اٹھایا اور کوؤں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خیمے میں
پہنچ گئے۔ جونہی ہم اندر گھسے کاشف نے پھرتی سے خیمے کا راستہ بند کر دیا۔ حیرت انگیز طو
پر دو کوے ابھی تک راجا کے زخمی جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ پرندوں کا یہ رویہ انتہائی غی
معمولی اور انوکھا تھا۔ ایک کوے کو اکبر خاں نے اپنی رائفل کے کندے سے کچل دیا
دوسرے کی گردن میں نے اپنے ہاتھ سے مروڑ دی دونوں پرندے کچھ دیر تک ہمار
ہراساں نظروں کے سامنے جان کنی کے عالم میں پھڑپھڑاتے رہے پھر ساکت ہو گئے۔

ہم سب کے جسموں پر سرخ نشان تھے' کچھ نشانوں سے خون رس رہا تھا۔ کہیں

سے تھوڑی بہت کھال بھی اتر گئی تھی۔ راجا زیادہ زخمی ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی محفوظ نہیں
رہا تھا۔ ایک رخسار سے بوٹی نکلی ہوئی تھی۔ گردن سر بازو غرض ہر جگہ سے خون رس رہا
تھا۔ اگر اکبر خاں بروقت اس کی مدد کو نہ پہنچتا تو خبر نہیں کیا ہو جاتا۔ جولیا نے جلدی سے
میڈیکل باکس نکالا اور راجا کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ مرہم پٹی کی سب سے زیادہ
ضرورت بھی اسی کو تھی۔ جولیا کو خود بھی ایک دو زخم آئے تھے تاہم وہ بہت جلدی خیمے
کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

دو چار منٹ بعد ہمیں احساس ہوا کہ کوے ابھی تک منتشر نہیں ہوئے۔ یعنی اگر
ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء صاف کرنے کے بعد چلے جائیں گے تو یہ غلط
تھا.......... وہ نہ صرف موجود تھے بلکہ ہمارے خیموں کے گرد جمع ہو رہے تھے' ان کی
بھدی اور کرخت آوازیں ایک بار پھر بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ جلد ہی وہ ہمارے
خیموں سے ٹکرانے لگے' وہ درجنوں کے حساب سے خیموں کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے اور
اپنی چونچیں آزما رہے تھے۔ یہ کلیجہ نکال لینے والی صورت حال تھی۔ میں نے دیکھا کہ
جولیا کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا ہے اور دیگر ساتھی بھی شدید ہراساں ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟" جولیا نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

اکبر خاں کی گرفت رائفل پر خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔ پستول اب کاشف کے
پاس تھا۔ اچانک ہمارے قریب سے کہیں فائرنگ کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ یہ بڑی شدید
فائرنگ تھی۔ سیون ایم ایم' ٹریل ٹو اور پمپ ایکشن رائفل استعمال کی جا رہی تھیں۔ یہ
فائرنگ ہماری عقبی جانب سے شروع ہوئی تھی۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس فائرنگ
کا نشانہ وہ خونخوار پرندے ہیں جو ایکا ایکی ہماری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہم خیموں کے
اندر اوندھے لیٹ گئے۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارتوسوں کے چھرے ہر سمت محو
پرواز ہیں۔ یہ اندھا دھند فائرنگ قریباً تین چار منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد ایکا ایکی
سکون ہو گیا۔ میں نے جھونپڑے کے ایک روزن سے جھانکا۔ ہمارا گھیراؤ کرنے والے
کوے اوجھل ہو چکے تھے۔ سامنے زمین پر اور درختوں کی شاخوں پر کئی کوؤں کی لاشیں
جھول رہی تھیں۔ میں نے احتیاط سے اپنے ٹینٹ کا دروازہ کھولا اور پھر باہر نکل آیا۔
میرے پیچھے ہی پیچھے کاشف اور اکبر خان بھی باہر آ گئے۔

باہر کا منظر حیرت زدہ کرنے والا تھا۔ زمین پر اور درختوں پر دور تک کووں کی لاشیں تھیں۔ ان کے خون کے چھینٹے ہمارے خیموں سے لے کر جھاڑ جھنکار تک ہر جگہ موجود تھے۔ دسترخوان پر رکھے ڈونگوں اور پلیٹوں میں بھی کووں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان لاشوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی کوا ایک دم پھڑکتا تھا اور پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ ہماری نگاہیں فائرنگ کرنے والوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ اچانک وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے نمودار ہوئے۔ جو افراد ہمیں نظر آئے ان کی تعداد آٹھ کے قریب تھی۔ ان سب نے اپنے چہرے عجیب وضع کے ماسک سے چھپا رکھے تھے۔ جیسے لکڑی یا لوہے کی گڑوی الٹی کر کے اپنے سر پر رکھی ہوئی ہو۔ اس گڑوی میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ماسک ان مقامی لوگوں کے لئے ہیلمٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ ہمارے قریب پہنچے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ چہروں کے ماسک اتار کر اسرار کا یہ پردہ چاک کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے مقامی زبان میں ہم سے کچھ کہا۔ عظیم پراتھا نے ان کی بات کا جواب دیا پھر اس نے ہمیں ترجمہ کرتے ہوئے انگریزی میں بتایا کہ ہمارے مددگار ہمیں اس جزیرے میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں جب تک چاہیں حفاظت اور سلامتی سے رہ سکتے ہیں۔

میں نے پراتھا سے کہا۔ "ان سے پوچھو جزیرے کا نام کیا ہے اور یہاں کوئی بستی وغیرہ نظر کیوں نہیں آ رہی۔"

جواب میں ان میں سے ایک شخص نے جو کچھ کہا اس کا ترجمہ کرتے ہوئے پراتھا نے بتایا۔ "اس جزیرے کو مقامی زبان میں "ہولو" کہتے ہیں۔ یہ زبان سنہالی زبان سے ملتی جلتی ہے اور اس زبان میں ہولو کا مطلب "الگ تھلگ جگہ" ہے۔ جزیرے کی بستیاں یہاں سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہیں اور درختوں کے ایک قدرتی حصار میں گھری ہوئی ہیں۔"

کاشف نے پوچھا۔ "اگر ہم بستیوں تک جانا چاہیں تو۔"

اس سے پہلے کہ ماسک والا شخص کوئی جواب دیتا میں نے ایک دم اسے اور اس کے ساتھیوں کو چونکتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں بھی شکرے کی طویل اور

باریک آواز پڑی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کے چمکدار سورج کی کرنوں میں لمحوں کے لئے شکرے کے خاکستری پر چمکے اور پھر وہ پام کے بلند درختوں کے عقب میں اوجھل ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس آواز کو سننے کے بعد ہمارے مددگاروں کے اندر بے چینی سی پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی باڈی لینگوئج ان کے اندرونی اضطراب کا پتہ دے رہی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے عظیم پراتھا سے کچھ کہا اور پھر وہ لوگ تیزی سے درختوں میں اوجھل ہو گئے۔

"کیا کہا ہے انہوں نے؟" کاشف نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم بستی تک جانا چاہیں تو ہمیں کون روک سکتا ہے۔"

☆==========☆==========☆

رات سکون سے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے میرے اور کاشف کے درمیان تھوڑی سی تکرار ہو گئی۔ کاشف بستی تک جانا چاہتا تھا جبکہ باقی سب کل والے واقعے سے خوفزدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہیں آس پاس گھوم پھر کر اور تصویریں وغیرہ اتار کر واپس چلا جائے۔ کاشف اپنی بات پر اڑا ہوا تھا' اس کا کہنا تھا کہ اتنی دور آئے ہیں تو اب یہاں کے لوگوں سے ملے بغیر اور ان کا رہن سہن دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ ویسے بھی ایک دن بعد پورے چاند کی رات تھی۔ ہم جانتے تھے کہ ان علاقوں میں رہنے والے قبائلی اکثر پورے چاند کی رات میں جشن وغیرہ مناتے ہیں اور ناچ گانا ہوتا ہے۔ کاشف کو ایسے ہی کسی تہوار کی وڈیو بنانے کا خبط ہو رہا تھا۔ راجا بھی زخمی ہونے کے باوجود اس کا ہم خیال نظر آتا تھا۔ دھیرے دھیرے کاشف نے جولیا کو بھی ہم خیال بنا لیا۔ اس نے کل والے واقعے کے حوالے سے ساتھیوں کا ڈر دور کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ اس نے کہا۔ "یارو! تم تو خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو اور سب سے زیادہ یہ کاٹھ کا الو جلال ہو رہا ہے۔ ہر معاملے کو پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہو تم۔ پرندوں کا حملہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ایسے واقعات اکثر ہو جاتے ہیں۔ خاص طور سے جنگل وغیرہ میں......... جب کھانے پینے کی اشیاء کھلے میں رکھی جاتی ہیں تو ان کی خوشبو چرند پرند کو کھینچ لاتی ہے۔ ویسے بھی جن کووں نے کل ہم پر بلہ بولا وہ عام کوے نہیں تھے۔ خاص اس علاقے

کی پیداوار تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں جبلی طور پر جارحیت موجود ہو.........."

وہ کافی دیر تک لیکچر دیتا رہا اور اپنی دانست میں میرا اندرونی خوف دور کر
کوشش کرتا رہا۔ بہت کچھ دیکھ لینے کے باوجود وہ ابھی تک یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھ
آرزو سے وابستہ اس کہانی میں اسرار کا ایک انوکھا ٹچ موجود ہے۔

نہ جانے کیوں کچھ روز سے مجھے کاشف کچھ بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ مجھے محسوس
تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپاتا ہے۔ وہ جو ہمیشہ سے ہر بات بلاتکلف مجھ سے کہہ دیا کر
اب بہت سی باتیں اپنے دل میں رکھنے لگا ہے۔ میرے اس شک کی وجوہات میں سے ا
وجہ وہ مختصر سی گفتگو بھی تھی جو میں نے پچھلے جزیرے میں کیمپنگ کے دوران سنی تھ
اس جزیرے میں کئی روز تک ہمیں شدید بارش نے گھیرے رکھا تھا۔ ایک ایسی ہی مو
دھار رات کو میں دم سادھے خیمے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ کاشف اور راجا یہی سمجھ رہے
کہ میں سو رہا ہوں جبکہ میں خاموشی سے پڑا اپنے سینے کا لاعلاج درد سہنے کی کوشش کر
تھا۔ کاشف اور راجا دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے کاشف کے کچھ اڑتے اڑتے
جملے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ ان جملوں میں ایبٹ آباد کے پیر شاہ جی کا ذکر تھا۔ ایبٹ
آباد سے ہمارے ساتھ راہ فرار اختیار کرنے سے پہلے کاشف پیر شاہ جی سے ملنے کے لئے
گیا تھا۔ اس نے آکر یہی بتایا تھا کہ شاہ جی سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی، مگر اس را
خیمے میں کاشف اور راجا کے درمیان جو دھیمی گفتگو ہو رہی تھی اس سے مجھے شبہ ہوا
شاید کاشف کی ملاقات شاہ جی سے ہوئی تھی۔

اگر یہ ملاقات ہوئی تھی تو پھر کاشف نے مجھ سے کیوں چھپایا.......... اس میں ایک
بات تھی جو وہ اپنے تک یا راجا تک رکھنا چاہتا تھا.......... پھر ایک اور بات بھی رہ رہ
میرے ذہن کو کچوکے لگاتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ کاشف جو ہم
یوں جگہ جگہ لئے پھرتا ہے تو اس کی وجہ صرف سیاحت کا شوق نہیں ہے.......... کوئی ا
بات بھی اس جادہ پیمائی کے پیچھے ہے۔ بے شک کاشف کو سیاحت کا شوق شروع سے تھ
لیکن وہ ماڈرن شہروں کے رنگین ماحول کا شائق تھا۔ قدرتی ماحول اور جنگلات وغیرہ
اس نے کبھی خصوصی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اب اسے ایکا ایکی جزیروں کی سیاحت کا
خبط ہوا تھا تو اس کے پیچھے بھی مجھے کوئی وجہ نظر آ رہی تھی۔ میں اپنے ذہن میں ا

والے سوالوں کا جواب کاشف سے پوچھ سکتا تھا مگر میرا دل چاہتا تھا کہ اگر اس نے بتانا ہے
تو خود بتائے۔

وہ سارا دن بھی ہم نے جزیرے پر ہی گزارا۔ اس جزیرے کی اپنی ایک مہک تھی
اور یہ مہک ان ہزارہا زرد رنگ کے جنگلی پھولوں کی وجہ سے تھی جو اکثر جگہوں پر دکھائی
دیتے تھے۔ ہمیں وہ پُراسرار رائفل بردار دوبارہ نظر نہیں آئے جنہوں نے ایک روز پہلے
اچانک نمودار ہو کر ہمارا پیچھا خونخوار کوؤں سے چھڑایا تھا۔ ہاں اکا دکا کوے ہمیں نظر آتے
رہے اور جولیا انہیں دیکھ کر پریشان بھی ہوتی رہی، تاہم ان پرندوں میں وہ جنونی کیفیت
دوبارہ نظر نہیں آئی جو کل دوپہر نظر آئی تھی۔

وہ رات بھی یوں تو خیریت سے گزری مگر رات آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل
گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ایک بار پھر مجھے اپنے بالکل قریب کسی کی
موجودگی کا احساس ہوا اور ایک حیوانی بو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ میرے قریب اکبر
خان اور پراتھا بالکل بے خبر سوئے پڑے تھے، دونوں کے مدہم خراٹے خیمے کے مختصر خلا
میں گونج رہے تھے۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے اندھیرے میں آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

جواب میں خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اور خاموشی بھی ایسی جو سینے میں سیاہ
دھواں بھر دے۔

اچانک اکبر خاں نے کروٹ بدلی اور نیند میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں بھی دوبارہ اپنی
جگہ لیٹ گیا۔ چند لمحے بعد اکبر خاں جاگ گیا اور نسوار کی ڈبیا تلاش کرنے کے لئے اس
نے ٹارچ جلائی۔ ٹارچ روشن ہوتے ہی حیوانی بو میرے قریب سے اوجھل ہو گئی اور کسی
کی قربت کا احساس بھی جاتا رہا.......... صبح بے حد نکھری ہوئی تھی۔ کل کاشف نے عظیم
پراتھا کے ساتھی سورن عرف پہلوان سے کہا تھا کہ وہ ناشتہ ہمارے ساتھ کرلے اور دوپہر
کے کھانے کے لئے کچھ ٹن پیک سامان بھی لے آئے۔ ہم ناشتے پر دیر تک اس کا انتظار
کرتے رہے لیکن وہ نہیں آیا۔ پراتھا کا خیال تھا کہ شاید وہ پی پلا کر سو گیا ہے۔ ناشتے کے
بعد بھی ہم نے ایک ڈیڑھ گھنٹا اس کا انتظار کیا، پھر پراتھا مچان پر چڑھ گیا۔ وہاں سے ہماری
رُخ لانچ بالکل صاف نظر آتی تھی۔ عظیم پراتھا نے منہ کے سامنے ہاتھوں سے بھونپو سا

بتایا اور پہلوان کو آوازیں دیں لیکن فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ وہاں تک آواز کا پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

عظیم پراتھا نے کہا۔ "اچھا میں جا کر دیکھ آتا ہوں۔"

"میں نے کہا۔ "چلو میں بھی ساتھ جاتا ہوں۔"

میں اور پراتھا روانہ ہونے لگے تو کاشف بھی اپنی رائفل تھام کر ساتھ ہولیا۔ ویڈیو کیمرا بھی اس کے گلے میں موجود تھا۔

ہم چند منٹ میں ساحل کے نزدیک پہنچ گئے۔ جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے اب ہمیں لانچ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک پراتھا کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے دونوں ہاتھ تو پھیلا کر ہمیں آگے بڑھنے سے روک لیا۔ "کیوں کیا بات ہے؟" کاشف نے پوچھا۔

"مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ دیکھیں۔" اس نے کیچڑ آلود زمین پر کچھ نامانوس نشانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ پراتھا کوئی جواب دیتا ایک دم جھاڑیوں میں زبردست سرسراہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کچھ نامانوس پھنکاروں کی آواز کانوں میں پڑی۔ پراتھا کا رنگ اڑ گیا' وہ لرز کر بولا۔ "بھاگو صاحب جی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ مڑ کر بھاگا۔ ہم نے بھی اس کا پیچھا کیا' ابھی ہم بمشکل پندرہ بیس گز ہی گئے ہوں گے کہ ہمارے عین سامنے لمبی گھاس میں سرسراہٹ ہوئی اور ہم نے ایک خوفناک منظر دیکھا' ایک خاکستری رنگ کا طویل مگرمچھ کیچڑ میں لت پت ہمارے سامنے موجود تھا۔ اس کی گول آنکھیں جیسے اس کے سر کے اوپر دھری تھیں اور طویل دم گاڑی کے وائپر کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ میں نے قریب ہی مینگو شین کا ایک درخت دیکھا۔ درخت کا تنا ایک طرف جھکا ہوا تھا اور زمین کے ساتھ پچاس درجے کا زاویہ بنا رہا تھا۔

"ادھر آؤ۔" میں نے کاشف سے چیخ کر کہا۔

ہم تینوں بڑی تیزی کے ساتھ اور باآسانی اس مضبوط درخت پر چڑھ گئے۔ بلندی پر پہنچتے ہی ہمیں ایک ناقابل یقین اور ہولناک منظر نظر آیا۔ لانچ ہم سے صرف تیس

چالیس گز کے فاصلے پر تھی۔ مگر وہ ایسی حالت میں تھی کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لانچ کے مختصر سے عرشے پر کم و بیش چھ خونخوار مگرمچھ موجود تھے اور بات صرف عرشے ہی کی نہیں تھی۔ لانچ کے اندر' اس کی چھت پر اور اردگرد بھی درجنوں خونی مگرمچھ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے شیشے توڑ دیئے تھے۔ نفیس جنگلے ٹیڑھے کر دیئے تھے اور فرش اپنے نوکیلے دانتوں سے ادھیڑ ڈالا تھا۔

پراتھا اضطراب کے عالم میں چیخا۔ "سورن......... کہاں ہو سورن؟"

سورن کا انجام نوشتہ دیوار کی طرح ہمارے سامنے تھا' اور جلد ہی ہمیں اس انجام کی ایک جھلک بھی نظر آ گئی۔ سورن عرف پہلوان کی پھٹی ہوئی خون آلود پتلون کی کچھ دھجیاں ایک شکستہ جنگلے سے جھول رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے کی صورت میں عرشے پر خون کے دھبے بھی صاف نظر آ جاتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود پراتھا کے دل میں امید باقی تھی۔ وہ سورن کا نام لے کر پکارتا جا رہا تھا۔ اس کی آوازوں نے ہمارے لئے خطرہ بڑھا دیا تھا۔ چھوٹے بڑے درجنوں مگرمچھ پانی کے اندر اور خشکی پر موجود تھے۔ وہ اپنے بڑے بڑے پنجوں کے ساتھ کیچڑ آلود زمین پر رینگتے ہوئے اس درخت کے اردگرد جمع ہو رہے تھے جس پر ہم موجود تھے۔ ان کے جسموں پر چھوٹے چھوٹے لاتعداد ابھار تھے اور ان میں سے کچھ کے رنگ سبزی مائل خاکستری تھے۔

"اب کیا ہوگا؟" کاشف نے پوچھا۔

"اس جزیرے کی سیر ہوگی۔ مگرمچھ ہمیں اپنے منہ میں دبا کر جگہ جگہ گھمائیں گے۔" میں نے جل کر کہا اور اس کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔

"یہ درخت پر چڑھ سکتے ہیں۔"

"میرے خیال میں نہیں۔" پراتھا کی لرزاں آواز ابھری۔

"مگر یہ درخت تو زمین پر لیٹا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ خطرہ تو ہے۔" پراتھا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "درخت کا جھکاؤ بہت زیادہ ہے۔"

پھر ہمیں بالکل یہی محسوس ہوا کہ ایک دو مگرمچھ درخت پر چڑھنے کی کوشش کریں گے غالباً شدید خوف کے سبب ہمیں ایسا لگ رہا تھا۔ جو سیون ایم ایم رائفل میرے ہاتھ

میں تھی اس کے ساتھ 24 گولیوں کا میگزین منسلک تھا۔ ایک بھرا ہوا میگزین ہمارے پا
اس کے علاوہ بھی تھا۔ میں نے ایک نزدیک کے مگرمچھ پر فائر کیے۔ تین چار گولیاں ا
کے جسم میں پیوست ہوئیں اور وہ تڑپنے لگا' اردگرد کا کیچڑ اس کے خون سے سرخ ہو
لگا تھا۔ میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے فائرنگ
شروع کردی۔ ان خون آشام سمندری عفریتوں میں ہلچل پیدا ہوئی' دیکھتے ہی دیکھتے وہ
بتر ہونے لگے۔ ان کا رخ پانی ہی کی طرف تھا' یکے بعد دیگرے کئی چھپاکے ہوئے اور
آبی جانور واپس پانی میں داخل ہوتے چلے گئے۔ میں نے رائفل کا رخ لانچ کی طرف
دیا۔ پانچ چھ گولیاں لانچ کی طرف فائر کیں تو اس کا عرشہ بھی خالی نظر آنے لگا۔ لانچ
اندر باہر موجود مگرمچھ بڑی سرعت سے پانی میں غائب ہوگئے تھے۔

میں نے میگزین تقریباً خالی کردیا تھا۔ میری فائرنگ سے تین جسیم مگرمچھ خشکی پر
ہلاک ہوگئے تھے۔ ایک دو جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہے تھے۔ باقی میدان خالی ہو
تھا۔ فائرنگ کی آواز دور دور تک گونجی تھی۔ لاتعداد پرندے درختوں سے اڑ کر فضا
چکرانے لگے تھے۔ ان میں شاید وہ پُراسرار شکرا بھی تھا جس کی صدائیں یہاں آنے
بعد کئی بار سن چکا تھا۔ مجھے یاد پڑ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے فائرنگ کے دوران
اس کی آواز بھی کہیں آس پاس سنائی دی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟" پراتھا گلوگیر آواز میں بولا۔ "ہمارا ساتھی مر
وہ ہمارا ملازم نہیں ہمارا دوست تھا۔ اب ہم اس کے گھر والوں کو جا کر کیا منہ دکھا
گے۔ ان ظالموں نے تو اس کی ہڈیاں تک بھی نہیں چھوڑی ہیں۔" وہ سسکیاں لے
رونے لگا۔

"حوصلہ کرو پراتھا۔ اگر مسلمان ہو تو اس بات پر یقین رکھو کہ خدا کے کاموں
کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

"لیکن خدا نے ہمیں عقل تو دی ہے۔ اب میں یہاں ایک پل بھی رہنا نہیں
ہوں۔ یہ بڑی منحوس جگہ ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" آنسو پراتھا کے رخسار
بہہ رہے تھے۔

اچانک ایک نامانوس سا شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے بہت سے لوگ ایک ساتھ

رہے ہیں اور شور مچاتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

"وہ دیکھو۔" کاشف نے گھبرا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

وہاں سے دھول اڑتی نظر آرہی تھی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ کم و بیش پچاس گھڑ
سوار ہیں جو ایک نیم دائرے کی شکل میں پھیل کر ہماری جانب آرہے ہیں۔ ابھی ہم ان
نوواردگان پر غور ہی کر رہے تھے کہ قریبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی ایک شخص تیزی
سے برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پر وہی گول ماسک تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کا
لباس پائجامہ نما پتلون اور لمبی قمیض پر مشتمل تھا جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ وہ
ہاتھ میں رائفل تھامے تیزی سے ہمارے قریب آیا اور مقامی زبان میں دو فقرے بول کر
مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

پراتھا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ترجمہ کیا۔ "یہ کہتا ہے کہ کچھ لوگ ہمیں پکڑنے
کے لئے آرہے ہیں۔ ہم اپنی جان بچا کر مغرب کی طرف بھاگ جائیں۔"

ہمیں اطلاع دینے کے بعد ماسک والا شخص فوراً جھاڑیوں میں اوجھل ہوگیا۔

"کیا کرنا چاہیے؟" کاشف کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"یہ لوگ پہلے بھی ہماری مدد کر چکے ہیں۔ یقیناً اب بھی مدد کر رہے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔" کاشف نے درخت پر پیچھے کو کھسکتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مردہ مگرمچھ کے اوپر سے پھلانگتے ہوئے جھاڑیوں کے
اندرونی راستے میں گھسے اور اپنے کیمپ کی طرف دوڑے۔ چند ہی منٹ بعد ہم کیمپ کے
قریب تھے ہم نے دور ہی سے اکبر خاں اور راجا وغیرہ کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔
ہم کیمپ میں پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر اکبر خان اور جولیا وغیرہ کو
آوازیں دیں لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔ سامنے چولہے پر چائے کی کیتلی
پڑی تھی اور آگ بھی جل رہی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ لوگ خطرے کو محسوس کر کے آس
پاس چھپ گئے ہیں لیکن ایسا تھا تو انہیں آواز سن کر جواب دینا چاہئے تھا۔ ایک صورت
یہ بھی ہو سکتی تھی کہ انہوں نے ساحل کی جانب فائرنگ کی آواز سنی ہو اور آواز کے
کھوج میں نکل گئے ہوں۔

گھڑ سوار بڑی تیزی سے قریب آرہے تھے۔ اب ہم گھوڑوں کی ٹاپیں اور

سواروں کے للکارے بھی سن سکتے تھے۔ ”یہیں کھڑے رہے تو پکڑے جائیں گے۔“ کاشف نے کہا۔

”ارے پراتھا کدھر ہے؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم نے اردگرد دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ چند سیکنڈ پہلے ہم اکبر خان اور ج... وغیرہ کو آوازیں دے رہے تھے اب ہم نے پراتھا کو پکارنا شروع کر دیا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ یہاں تک آیا ہی نہیں۔ وہ سب سے پیچھے تھا۔ راستے ہی کسی طرف مڑ گیا ہے۔“

پراتھا۔ کہاں ہو؟“ میں نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اب یہاں کیمپ میں رکنا خود کو خطرے کے منہ میں جھ... تھا۔ میں نے کاشف کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں بھاگ نکلے۔ تاہم بھاگنے سے پہلے ... نے خیمے سے باہر پڑی ہوئی ایک ٹارچ اٹھالی تھی۔ اجنبی راستوں پر اندھا دھند بھاگنا نہایت مشکل کام تھا' مگر ہمیں بھاگنا پڑ رہا تھا' کئی جگہ جھاڑیاں بے حد گھنی اور خار... تھیں۔ ہمارے چہروں پر بار بار شاخوں کے طمانچے لگ رہے تھے۔ دو چار منٹ میں کاشف بری طرح ہانپ گیا۔ میں چونکہ ورزش کا عادی تھا لہٰذا خود کو بہتر پوزیشن محسوس کر رہا تھا۔

”وہ لوگ قریب آ رہے ہیں۔“ کاشف نے ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ کہا۔

”پر کیا کریں؟“

”کہیں چھپ نہیں سکتے؟“

”دیکھتے رہو' کوئی جگہ ملے تو چھپ جاتے ہیں۔“

ابھی بمشکل میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک مناسب جگہ دکھائی گئی۔ یہ ایک گڑھا تھا جو قدرتی طور پر گھاس پھونس سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے دوڑتے گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔ ذرا سے تذبذب کے بعد کاشف بھی میرے پیچھے گڑھے کی تہہ میں دلدل سی موجود تھی۔ ظاہر تھا کہ حشرات الارض بھی ہوں گے اس وقت حشرات کا خطرہ ہمیں ہیچ محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دبک کر بیٹھ گئے۔ کاشف سانسوں کی پھنکاریں عین میرے کان میں گونج رہی تھیں۔ بیس پچیس ”سیکنڈ“ بعد

رفتار گھڑسوار عین ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ وہ تیز رفتاری سے گھوڑے بھگاتے اور للکارے مارتے ہوئے ہم سے بمشکل تین گز کے فاصلے سے گزرے۔

گھڑسواروں کے آگے نکل جانے کے بعد بھی ہم چار پانچ منٹ تک گڑھے میں دبکے رہے۔ ہماری ٹانگوں پر کیڑے رینگنے لگے تھے' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ جونک نما کیچوے تھے۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا رہے تھے مگر ان کی موجودگی ہمیں مضطرب کر رہی تھی۔ جب اردگرد سکون محسوس ہوا تو ہم گڑھے سے باہر آگئے۔ پتلون کے پائنچے چڑھا کر پنڈلیوں کو کیچوؤں کی دستبرد سے آزاد کیا۔ یکایک ایک آہٹ سنائی دی۔

”کوئی ہے۔“ کاشف نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا دو افراد جھاڑیوں سے نکل کر ہمارے سامنے آگئے۔ وہ پائجامہ نما پتلونیں اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ بال لمبے تھے اور کندھوں تک پہنچتے تھے۔ ان کے کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ یہ دونوں افراد صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی' دوسرا کلہاڑی سے مسلح تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دونوں افراد نے حلق سے عجیب سی آواز نکالی' پلک جھپکنے میں دو مزید افراد جھاڑیوں سے برآمد ہو گئے۔ میرے دل نے کہا کہ ایک بار پھر مجھے اپنے ہنر کو آزمانا پڑے گا۔ چند ماہ پہلے ایبٹ آباد کی اس منحوس پولیس چوکی میں پہلی بار میں نے اپنا عہد توڑا تھا......... کئی برس کے بعد اس دن پہلی بار میں نے کسی مدمقابل پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ مدمقابل ڈی ایس پی ریاض تھا اور پھر اس کے ساتھی اہلکار تھے......... کہتے ہیں کہ عہد ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر ٹوٹتا ہی چلا جاتا ہے' شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہو رہا تھا۔ آج پھر میں اپنے سامنے کچھ ایسے افراد کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے ساتھ لڑے بھڑے بغیر جان بچتی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر جب لڑنا بھرنا ہی تھا تو کیوں نہ پہل کا فائدہ اٹھا لیا جاتا۔ میری نگاہ اپنے مدمقابلوں میں سے اس شخص پر جمی تھی جس کے ہاتھ میں طاقتور شاٹ گن تھی۔ میں نے اچانک اس کو نشانہ بنایا۔ میرے ہاتھ میں موجود سیون ایم ایم کی گولی رائفل بردار کے کندھے میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا' رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ پہل کا فائدہ میں حاصل کر چکا تھا۔ فائر ہوتے ہی باقی دو افراد اپنی کلہاڑیوں سے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں نے ایک کلہاڑی کا وار جھک کر بچایا۔ دوسری کلہاڑی کا وار میں نے

رائفل پر روکا اور کلہاڑی بردار کے سینے پر ٹانگ مار کر اسے دور گرا دیا۔ تیسرا شخص اس شاٹ گن کی طرف بڑھا تھا جو زخمی شخص کے ہاتھ سے گری تھی۔ کاشف نے اس کا راستہ روک لیا دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے اور شاٹ گن تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کاشف کوئی آسان حریف نہیں ہے' وہ مدمقابل کو آسانی سے شاٹ گن تک نہیں پہنچنے دے گا۔

میں نے اپنی رائفل سیدھی کی تاکہ بپھرے ہوئے دو کلہاڑی برداروں کو مہلک حملے سے روک سکوں۔ مگر اسی دوران قریبی جھاڑی سے ایک اور شخص برآمد ہوا۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس رائفل میں گولیاں نہیں تھیں۔ رائفل بردار نے اپنی رائفل کو وزنی لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے ایک شدید ضرب میرے ہاتھوں پر لگائی قسمت اچھی تھی کہ اس زور دار ضرب کے باوجود میری کلائیاں ٹوٹنے سے بچ گئیں رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور گڑھے میں جا گری تھی۔ میں نے طیش کے عالم میں پلٹ کر حملہ آور کے منہ پر ٹانگ رسید کی۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی اور مدمقابل کو ناک آؤٹ کرنے کے لئے کافی تھی۔ مگر حملہ آور سخت جان تھا لڑکھڑا کر پھر سنبھل گیا۔ میں نے اسی رفتار سے دوسری بار ٹانگ رسید کرنا چاہی۔ حیرت انگیز طور پر اس شخص نے پھرتی سے یہ وار بچالیا۔ تاہم پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ ایک گرے ہوئے تنے سے ٹکرایا اور الٹ کر گر گیا۔ میں نے سامنے سے آنے والے ایک کلہاڑی بردار کا وار بچا کر اس کی پنڈلی پر ایڑی کی مخصوص ضرب لگائی۔ ہر کھیل کی طرح مارشل آرٹ میں بھی ٹائمنگ کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ بروقت اور صحیح مقام پر لگائی ہوئی ضرب ایک اندھا دھند اور بے موقع ضرب سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ میرے مدمقابل کو بھی ایک جچی تلی ضرب سہنا پڑی تھی۔ اس کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی نمایاں تھی۔ وہ گرا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

دوسری طرف کاشف نے بھی اپنے مدمقابل کو ٹف ٹائم دے رکھا تھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے اور کاشف کی ایک زور دار ٹکر نے اس کے حریف کا چہرہ لہولہان کر رکھا تھا اب میرے سامنے صرف دو افراد تھے۔ ایک کلہاڑی بردار تھا اور دوسرا خالی ہاتھ...... خالی ہاتھ وہی تھا جس نے میری کلائیوں پر خالی رائفل سے ضرب لگائی تھی اور مجھے غ

سلح کر دیا تھا۔ یہ شخص خالی ہاتھ ہونے کے باوجود مجھے زیادہ خطرناک نظر آیا۔ میں نے اپنی زیادہ توجہ اس پر مرکوز رکھی۔

حملہ کرنے کے لئے یہی شخص پہلے آگے بڑھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ٹانگ چلائی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص بھی مارشل آرٹ جانتا ہے۔ اس نے کراٹے کے مخصوص انداز میں ٹانگ چلائی تھی۔ اسے کھیل کی زبان میں اپرپام کک کہا جاتا ہے۔ میں نے ایک کک بائیں ہاتھ پر بلاک کی اور جوابی حملہ کیا۔ آٹھ دس سیکنڈ تک ہمارے درمیان زبردست کشمکش ہوئی۔ اس دوران کلہاڑی بردار ہمارے اردگرد ناچتا رہا تھا' اس کو وار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ پھر میرے حریف کی ایک بیک کک میرے چہرے پر لگی اور میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ یہ گرنا میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مجھے ایک نئی زندگی دے گیا۔ جب میں گرا تو کلہاڑی بردار کی چمکیلی کلہاڑی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ سچ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی مصیبت بھی رحمت بن کر آتی ہے۔ کلہاڑی بردار کا دوسرا وار میں نے زمین پر پلٹنی کھا کر بچایا۔ اپنے جسم کو اس طرح رول کرنا میرے لئے سلامتی کا ایک نیا راستہ کھول گیا۔ میں اس گڑھے میں گرا جہاں کچھ دیر پہلے میں اور کاشف چھپے تھے۔ اس گڑھے میں ایک منٹ پہلے میری رائفل بھی گری تھی۔ گڑھے میں گرتے ہی میں نے رائفل کی تلاش میں دیوانوں کی طرح ہاتھ چلائے اور رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ رائفل کا ٹھوس لمس حسینہ عالم کے لمس سے بھی بڑھ کر خوشگوار تھا۔ میں نے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی رائفل اپنے دونوں حریفوں کی طرف سیدھی کی تھی۔ کلہاڑی بردار تو جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا' مگر دوسرا شخص بلا کی پھرتی سے جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے اس کے عقب میں فائر کرنا چاہا مگر پھر ارادہ بدل دیا' جھاڑیوں پر گولی ضائع کرنے کے سوا فائر کا اور کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"ہینڈز اپ!" میں نے گرج کر کہا۔

کلہاڑی بردار کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تاہم اس نے پسپائی کا اظہار کرتے ہوئے کلہاڑی گرا دی۔ میں جست لگا کر باہر نکل آیا۔ کاشف اپنے مدمقابل پر حاوی رہا تھا۔ وہ تقریباً اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا' اور اس کوشش میں تھا کہ مدمقابل اس کے نیچے سے نکل نہ پائے۔

"چھوڑ دو اس کو۔" میں نے کاشف سے کہا۔

کاشف اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔ وہ بھی اپنی ناک سے خون صاف کرتا ہوا کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ طاقت کی زبان ہر جگہ اور ہر قسم لوگوں کو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب یہ دونوں افراد ڈری ڈری نظروں سے ہ رائفل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باقی دونوں افراد چونکہ شدید گھائل ہو چکے تھے' لہذا کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایک صاحب بہادر کی تو پنڈلی ٹوٹ گئی تھی دوسرے کے کندھے میں سیون ایم ایم کی ظالم گولی لگی تھی اور اس کا گوشت پھاڑ کر نے نکل گئی تھی۔ وہ اپنے ہی خون میں نہایا ہوا تھا اور اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔

"اب کیا کرنا ہے ان کا؟" کاشف نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیا کرنا چاہئے۔"

"کسی طرح کی پوچھ گچھ تو ہم ان سے کر نہیں سکتے' کیونکہ ان کی زبان ہمیں ن آتی۔"

"ویسے بھی پوچھ گچھ کا ٹائم نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ ایک بدبخت یہ سے بھاگ گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اپنے چاچے مامے لے کر واپس پہنچ سکتا ہے۔"

"تو پھر نکلیں یہاں سے۔"

"تو یہ جو دو شتونگڑے تیرے سامنے کھڑے ہیں یہ تیرا پیچھا نہیں فرمائیں گے؟"

"تو پھر کرو ناں جو کرنا ہے۔" کاشف نے جھلا کر کہا۔

حملہ آوروں سے دست بدست لڑائی کرنے کے بعد ایک عجیب سی بے میرے اندر عود کر آئی تھی۔ کچھ پرانی خوابیدہ لہریں جسم میں اٹھ رہی تھیں اور پو سراپے میں ایک کایا پلٹ کیفیت پیدا کر رہی تھیں........ ہمارے پاس کوئی رسی وغ تھی نہیں کہ ان دو افراد کو باندھ کر یہاں سے بھاگ نکلتے۔ ان کو اپنے پیچھے آنے روکنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ انگلی ٹریگر پر رکھی اور یکے دیگرے دو فائر کئے۔ دونوں افراد کی ٹانگیں نشانہ بنیں۔ وہ چہروں پر درد و کرب کی کہا سجا کر زمین پر گر پڑے۔

"چلو بھاگو۔" میں نے سب سے پہلے حملہ آور کی لوڈڈ رائفل اٹھاتے ہوئے کہا

ہم ایک بار پھر بھاگ اٹھے۔ اب ہمارا رخ ساحل کی طرف تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت نے زرد پھولوں کی مخصوص خوشبو کو پتیوں میں سے کشید کر کے چار سو پھیلا دیا تھا۔ اس خوشبو میں سینکڑوں طرح کی نباتات کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں ہم جزیروں پر اتنا گھومے تھے کہ اگر میری آنکھیں بند بھی ہوتیں اور مجھے کچھ پتہ نہ ہوتا کہ میں کس مقام پر ہوں اور میرے اردگرد کیا ہے تو میں بتا دیتا کہ میں "بحرہند" کے کسی جزیرے پر پایا جاتا ہوں۔ کوئی اچھا وقت ہوتا تو ہم اس چمکیلی دھوپ اور لہریں برساتی اور لشکارے مارتی ہوئی خوشبوؤں پر توجہ مرکوز کرتے لیکن اب تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ ایک جدا طرح کی قیامت ہم پر ٹوٹ پڑی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ابھی تک لانچ کا خونی منظر تھا اور سورن عرف پہلوان کی پھٹی ہوئی پتلون کی دھجیاں تھیں۔ اس جزیرے کے حوالے سے ایک عجیب سا ہراس ہمارے دلوں میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اپنے نامعلوم دشمنوں سے بچنے کے لے ہم اندھا دھند درختوں کے درمیان بھاگ رہے تھے۔ ذہن میں خیال یہی تھا کہ ساحل کی طرف چلیں اور پناہ کے لئے محفوظ جگہ ڈھونڈیں۔ ایسے میں ایک بار پھر میرے کانوں میں اسی منحوس شکرے کی آواز پڑی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکا اور نہ ہی کاشف دیکھ پایا۔ ہاں یہ اندازہ ضرور ہوا کہ کوئی شے بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے سروں کے اوپر سے گزری تھی۔

ابھی ہم پچاس ساٹھ گز آگے ہی گئے تھے کہ سامنے گھنی جھاڑیوں میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہم رک گئے اور احتیاط سے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ آگے کیا ہے۔ کچھ گڑبڑ موجود تھی مگر دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ لمبی زرد گھاس اور جھاڑیوں کے اندر سے کچھ لوگوں کے لباس کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ لمبے بالوں والے وہی مقامی لوگ ہیں جو ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سے تین چار گھڑسواروں کی ایک ٹولی بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری اور جنگل میں اوجھل ہو گئی۔ ساحل کی طرف جانا زیادہ خطرناک محسوس ہوا۔ ہم واپس چلے اور ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔

دن کا بقیہ حصہ اسی جاں گسل بھاگ دوڑ میں گزرا پیاس اور تھکن سے ہمارا برا حال تھا۔ کیچڑ نے ہمیں بھوت بنا رکھا تھا۔ چار پانچ گھنٹے کی اس دربدری میں ہمارا سامنا کسی

دشمن سے ہوا اور نہ دوست ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ راجا اکبر خاں اور جولیا پر کیا گزری ہے' نہ ہی یہ پتہ تھا کہ پراتھا ایکا ایکی ہم سے جدا ہو کر کہاں چلا گیا ہے۔ ہم کیمپ کی طرف واپس بھی نہیں جاسکتے تھے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ کیمپ اس وقت حملہ آوروں کے نرغے میں ہو گا۔ جونہی شام ہوئی اور رات کے اندھیرے نے اس جزیرے کو ڈھانپا ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ ہمارا دشمن کس طرف ہے۔ ہم ذرا بلندی پر موجود تھے۔ دائیں جانب ساحل سے ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر روشنیوں کا ایک جھمگٹا سا نظر آ رہا تھا۔ یہ ٹارچوں اور لائٹوں وغیرہ کی روشنی تھی اور ہمیں یقین تھا کہ اس جگہ پر ہمارا کیمپ واقع ہے۔ اس جگہ سے کچھ فاصلے پر سو ڈیڑھ سو روشنیوں کا ایک بڑا دائرہ دھیرے دھیرے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس دائرے کا پھیلاؤ دو فرلانگ سے کم نہیں تھا۔

"بڑے وسیع پیمانے پر تلاش ہو رہی ہے ہماری۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ........" کاشف نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں جنہوں نے دو بار ہماری مدد کی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کی مدد خفیہ ہے' جبکہ ہمیں تلاش کرنے والوں کی دشمنی اعلانیہ ہے۔ وہ دیکھو بالکل ہانکا کرنے والے انداز میں ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ جنگلوں میں اس طرح خطرناک جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے۔"

"مگر........ ہم نے بگاڑا کیا ہے ان کا؟"

"یہ تو تمہیں معلوم ہو گا' یا پھر ان لوگوں کو۔" میں نے کہا۔

"مجھے کیوں معلوم ہو گا؟" کاشف نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ تمہیں ہی جنون سوار تھا یہاں کی سیاحت کا۔"

کاشف منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ روشنیوں کا رخ بتا رہا تھا کہ ہمیں جان بچانے کے لئے ایک بار پھر جنوب کی طرف جانا ہو گا۔ کاشف نے یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے اپنے ویڈیو کیمرے کے ذریعے قریب آتی ہوئی روشنیوں کو چند سیکنڈ کے لئے شوٹ کیا پھر ہم تیزی سے مخالف سمت میں چل پڑے۔ جونہی ہم بلندی سے اترے روشنیاں اور ہانکا کرنے

والے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ گہری تاریکی میں انجان راستوں کا یہ بڑا پُرخطر سفر تھا۔ کسی کسی جگہ ہمیں ٹھٹک کر رکنا پڑتا۔ جھاڑ جھنکار میں دبکا ہوا کوئی جانور ہمارے قریب سے بدک کر بھاگتا اور دور تک گھاس میں اس کی سرسراہٹ سنائی دیتی۔ سہ پہر کے وقت ایک جگہ پودوں میں سے کوئی کیڑا کاشف کی کمر پر پھر گیا تھا اور اس کی کمر پر دو تین جگہ سرخ ابھار سے نمودار ہو گئے تھے........ جہاں راستہ زیادہ مشکل نظر آتا تھا وہاں ہم بڑی احتیاط کے ساتھ چند سیکنڈ کے لئے ٹارچ روشن کر لیتے تھے۔ ہم بہت تھک گئے تھے۔ خاص طور سے کاشف کا تو برا حال تھا۔ ایک جگہ وہ بیٹھ ہی گیا۔ جہاں وہ بیٹھا وہاں لمبی زرد گھاس موجود تھی۔ اس گھاس میں کوئی کیڑا مکوڑا یا سانپ نکل کر ہم پر حملہ آور ہو سکتا تھا' مگر ہم خطرات میں یوں گھرے ہوئے تھے کہ اب عام قسم کے خطرات ہمارے لئے اہمیت کھوتے جا رہے تھے۔ بقول غالب ؎

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ہم نے ایک پتھر سے ٹیک لگائی اور سانسیں درست کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم نے سارا دن بھاگ دوڑ کی تھی اس کے باوجود اب بھی ہم اپنے کیمپ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ بمشکل ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہو گا۔

اچانک بیٹھے بیٹھے مجھے ایک شک سا ہوا۔ ہمارے عین سامنے پانچ فٹ اونچی زرد گھاس میں کوئی رخنہ سا موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر تاریکی میں اس رخنے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ سے لمبی گھاس کو ایک جانب ہٹایا اور ٹارچ کا روشن دائرہ چند سیکنڈ کے لئے اپنے سامنے پھینکا' مجھے ایک قدرتی کھوہ نظر آئی۔ کھوہ کا دہانہ بڑے اچھے طریقے سے گھاس میں چھپا ہوا تھا۔ اگر اس کھوہ میں کوئی خطرناک جنگلی ذی نفس موجود نہیں تھا تو پھر یہ ہمارے لئے رات بھر کے لئے اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ کاشف نے بھی کھوہ دیکھ لی تھی اور سوالیہ نظروں سے میرا چہرہ تک رہا تھا۔

"کب تک بھاگتے رہیں گے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اچھی پناہ گاہ ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے احتیاط سے ٹارچ کا روشن دائرہ اندر پھینکا۔ کوئی چمگادڑ قسم کا پرندہ پھڑپھڑا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں تھوڑا سا مزید اندر گھسا۔ کھوہ اندر سے کشادہ تھی۔ کسی

جانور کا فضلہ خشک حالت میں پڑا تھا' چند خشک ٹہنیاں وغیرہ بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ کھوہ خالی اور صاف تھی۔ اپنی شہادت کی انگلی رائفل کے ٹرائیگر پر رکھ کر میں رکوع کے انداز میں جھکا اور اندر داخل ہوا۔ میرے پیچھے ہی کاشف بھی اندر آگیا......... کھوہ کے اندر پہنچ کر ہم نے آزادانہ ٹارچ کے دائرے کو گردش دی اور مطمئن ہو گئے......... اس کھوہ میں ہم نے قریباً تین گھنٹے اضطراب کے عالم میں گزارے۔ آخر ہمیں یقین ہو گیا کہ ہماری متلاشی روشنیاں اپنی تمام تر قہرناکی کے ساتھ کسی اور طرف نکل گئی ہیں۔ چہار سو خاموشی تھی بس کبھی کبھار کسی گیدڑ یا لگڑ بھگے کی آواز سناٹے کا سینہ چیر کر گزر جاتی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے پہلی بار اچھی طرح کھوہ کا جائزہ لیا۔ اچانک نیم پختہ زمین پر چند نشانات دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ جوگر کے نشانات تھے اور چھوٹے سائز کے اس جوگر کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ جولیا کے جوگر تھے۔ اس کے تلوے میں آٹھ کے ہندسے کی شکل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔

کاشف نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جولیا یہاں آئی ہے۔"

"یہ دیکھو!" میں نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں سیاہ دھبہ سا نظر آرہا تھا۔ ہم نے بغور دیکھا۔ یہ اکبر خان کی پھینکی ہوئی نسوار لگتی تھی۔ تھوڑی سی تحقیق کے بعد ثابت ہو گیا کہ یہ اکبر خاں کے ہونٹ سے نکلی ہوئی نسوار ہے۔ اب اس امر میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ کل کسی وقت جولیا اور اکبر خان اس کھوہ میں موجود رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان کے ساتھ راجا بھی ہو تاہم ہمیں کھوہ کے اندر سے قدموں کے جو مدہم نشانات ملے وہ صرف جولیا کے جوگر تھے یا پھر ایک دو نشانات اکبر خاں کے چپل کے تھے۔

کاشف بولا۔ "لگتا ہے کہ کل جولیا اور اکبر خاں بھی ہماری ہی طرح کیمپ سے بھاگے ہیں اور پناہ کے لئے اس کھوہ میں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں بھی ہماری ہی طرح ماسک والوں نے خطرے سے آگاہ کر دیا ہو۔"

میں کھوہ کے دہانے پر پہنچا اور چند سیکنڈ کے لئے ٹارچ جلا کر اردگرد کی زمین کا جائزہ لیا۔ زمین کی گواہی یہی تھی کہ جولیا اور اکبر خاں یہاں اکیلے آئے ہیں اور اکیلے ہی واپس گئے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ چند گھنٹے یہاں رہے ہوں اور پھر اپنے اردگرد خطرہ

محسوس کر کے یہاں سے نکل گئے ہوں' یا پھر انہوں نے کسی زیادہ محفوظ پناہ گاہ کی تلاش کی ہو۔

میں اور کاشف واپس کھوہ میں آگئے اور اس صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ جولیا اور اکبر خاں وغیرہ کے بارے میں ہمارے خدشات کسی حد تک کم ہو گئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیمپ سے نکلنے میں کامیاب رہے ہیں اور ہماری ہی طرح اب تک خود کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ہماری گفتگو جولیا' اکبر خاں اور راجا وغیرہ کے گرد گھومنے لگی۔ ہم قیافہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کیا کر سکتے ہیں اور کہاں جا سکتے ہیں۔ اگر تو وہ ہماری ہی طرح کسی کشتی وغیرہ کی تلاش میں ساحل کی طرف گئے تھے تو ان کی سلامتی مشکوک تھی۔ ہم جان چکے تھے کہ ہمیں تلاش کرنے والے ساحل کی جانب پوری طرح چوکس ہیں اور ممکن ہے کہ جہاں جہاں کشتی لانچ وغیرہ موجود ہو وہاں خصوصی نگرانی کی جا رہی ہو۔ کاشف کو اور مجھے زیادہ پریشانی جولیا کی طرف سے تھی۔ وہ نوجوان اور خوبصورت تھی۔ اس خطرناک علاقے اور خطرناک لوگوں میں اس کی حیثیت وہی تھی جو درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں تنہا ہرنی کی ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے ہمارے لئے ابھی تک اجنبی تھے۔ ہم ان کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے رنگ سانولے تھے۔ خدوخال میں تامل لوگوں کی سی جھلک ملتی تھی' تاہم ناک ذرا سی چپٹی اور پپوٹے بھاری تھے' جس طرح تھائی یا ملائشین لوگوں کے ہوتے ہیں ابھی تک جو افراد بھی ہمیں ملے تھے وہ صورتوں سے کافی کرخت اور بدلحاظ نظر آتے تھے۔ ایسے لوگوں سے کسی خیر کی توقع بے کار تھی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر کہیں جولیا ان کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ اس سے برا سلوک کریں گے۔

باتوں باتوں میں ہماری گفتگو کا رخ جولیا کی طرف ہو گیا۔ وہ عجیب لڑکی تھی' نہایت خوبصورت لیکن نہایت ارزاں۔ اس نے اپنے آپ کو شاہراہ عام بنا رکھا تھا۔ عزت آبرو پاکیزگی' شرم جیسے الفاظ کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ موڈ کے زیر اثر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ایک وقت کے کھانے کے لئے ایک غریب باورچی کو اپنے حسن کا خزانہ سونپ سکتی تھی' یا کسی راہ چلتے خوبرو نوجوان کو روک کر اس کی گاڑی میں بیٹھ سکتی تھی۔ کاشف کے لئے بھی وہ ایک کھلی کتاب ہی ثابت ہوئی تھی۔ کاشف نے اسے بڑی تفصیل

سے پڑھا تھا' اور اکبر خان کی سخت ترین وارننگ کا بھی اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ دراصل کاشف ایک عرصہ "انگلینڈ" میں رہا تھا' اور وہاں کے آزاد ماحول کا رنگ اس پر چڑھ چکا تھا۔ وہ لندن کے حوالے سے اپنے چٹ پٹے قصے اکثر مجھے سناتا رہتا تھا۔ میں نے کھوہ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔ "ایک بات مجھے سچ سچ بتانا کاشی! جولیا کس طرح کی لڑکی ہے؟"

"جس طرح کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میٹھی میٹھی' نرم گرم اور جوشیلی۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم اس کے ساتھ سیریس تو نہیں ہو گئے؟"

"اُلو کے! کیا میں تمہیں شکل سے ایسا چغد لگتا ہوں۔"

"اور وہ؟ میرا مطلب ہے کہ وہ تو سیریس نہیں؟"

"وہ سیریس ہے۔" کاشف نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ وہ سیریس ہے.......... لیکن میرے ساتھ نہیں۔"

"کیا پہیلیاں بوجھوا رہے ہو؟"

کاشف کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے' کہنے لگا۔ "تمہیں یہ بات بڑی عجیب لگے گی اور میرا خیال ہے کہ تم یقین بھی نہیں کرو گے۔"

"لیکن کچھ بولو بھی۔"

کاشف نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "مجھے پچاسی نوے فیصد یقین ہے کہ جولیا اکبر خان میں گہری دلچسپی لیتی ہے؟"

میں اپنی جگہ سے تقریباً اچھل پڑا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو کاشی' بھنگ تو نہیں پی لی گئے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق جولیا اب تک کسی شخص کے بارے میں اتنی سنجیدہ نہیں ہوئی جتنی اکبر خان کے بارے میں ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس سفر میں اگر ہمارے ساتھ ہے تو اس کی وجہ میں نہیں ہوں' صرف اور صرف اکبر خان ہے۔"

"یار کیسی بات کر رہے ہو۔ وہ الٹرا ماڈرن لڑکی' کہاں ہمارا پشتو مارنے اور نسو

نسو کرنے والا اکبر بھائی۔ دونوں کی عمروں میں بھی فرق ہے۔ مزاج' تعلیم' رہن' سہن ہر لحاظ سے وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی شاندار قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"شاندار قسم کی صحیح فہمی ہوئی ہے۔" کاشف نے غصے سے کہا۔ "سچ پوچھو تو میرے ساتھ تو اس کا تعلق وہی فلرٹ اور وقت گزاری والا ہی تھا۔ میں نے بھی اسے وقت گزاری ہی سمجھا ہے۔ جولیا کے دماغ کی اصل ڈور تو اکبر خان کے ساتھ ہی بندھی ہوئی ہے۔ اکبر خان اس کے لئے ایک بلند و بالا قلعے کی طرح ہے جس پر کمند ڈالنے کے لئے اس نے بے شمار منصوبے بنائے اور بگاڑے ہیں۔ پھر دیکھو کمال یہ ہے کہ ابھی تک تم سب میں سے کسی کو شبہ تک نہیں کہ اس کی نگاہ کا اصل نشانہ کون ہے۔"

میں سناٹے کی کیفیت میں کاشف کی باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاید کاشی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ایک دو موقعوں پر مجھے بھی بالکل موہوم سا شک پڑا تھا کہ جولیا' اکبر خاں کی طرف متوجہ ہے۔ میرے ذہن میں شروع شروع کا وہ منظر گھوم گیا جب ہمارا کیمپ Malay Pen کے گھنے درختوں میں تھا اور شدید بارش کے باعث جولیا کا خیمہ گر گیا تھا' وہ صبح دم اکبر خاں کے بستر پر سوئی پائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات موجود تھے۔

"کس سوچ میں کھو گئے۔" کاشی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "یہ دنیا ہے' یہاں چہرے پر چہرہ سجایا جاتا ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور.........."

"میری سمجھ میں تو اب بھی یہ بات نہیں آ رہی۔"

"جولیا جیسی لڑکیاں سمجھ میں نہیں آتیں اور نہ ان کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں اکثر اوقات وہ کام کرتی ہیں جو نہ کیا جاسکتا ہو۔ ایسے راستے پر چلتی ہیں جس پر چلنا ناممکن ہو۔ تم ہر لڑکی کو آرزو تو نہ سمجھو۔ وہ تو ایک بھلی مانس تھی۔ بابل کے کھونٹے پر بندھی ہوئی گائے۔ جس طرف ہنکایا چل دی' جتنی بار ہنکایا چل دی۔"

اچانک سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی ایک تیز باریک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کھوہ سے باہر تاریک آسمان پر وہی شکرا کسی جنگی جہاز کی سی تیزی کے ساتھ گزر گیا تھا۔ میرا دل

گواہی دیتا تھا کہ یہ پرندہ بھی اب تک پیش آنے والے پُراسرار واقعات کی ایک کڑی ہے، لیکن میں اس سلسلے میں کاشف سے بات کرکے اس سے ایک لمبی تقریر سننا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری اس بات کو بھی اس طرح رد کرے گا جس طرح پہلی باتوں کو کرچکا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میرا ذہن وسوسوں اور واہموں کا جنکشن بن چکا ہے۔ میں ہر چھوٹے بڑے واقعے کا ناطہ کسی کالے کتے سے جوڑ دیتا ہوں، کسی بلی، چھپکلی یا کوے سے جوڑ دیتا ہو......... کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ شاید کاشف میری تسلی کے لئے یہ ساری باتیں کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اندر سے وہ بھی پُراسراریت کی اس "لہر" کا قائل ہوچکا ہو جو لاہور سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے اس جزیرے تک ہمارے ساتھ ساتھ تھی۔ بے شک کچھ واقعات کو عام قرار دیا جاسکتا تھا مگر بہت سے واقعات غیر معمولی تھے اور کاشف ان کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ ان واقعات کو کیونکر نظرانداز کرسکتا تھا۔ ایبٹ آباد کی نواحی چوکی کے جنگل میں ہم نے سب انسپکٹر وصی جان وغیرہ کی نچی کھسی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں، ان لاشوں کے زخم بعین ویسے ہی تھے جیسے آرزو کے آخری دلہا ڈاکٹر رفیق کی گردن پر تھے......... اس کے بعد اس جزیرے پر آنے کے بعد جو کچھ ہوا تھا، مجھے وہ بھی ایک ہی سلسلے کی کڑیوں جیسا لگتا تھا۔ کوؤں والا واقعہ، لانچ پر سورن عرف پہلوان کی لرزہ خیز ہلاکت اور اب ہمارے اردگرد موت کا ایک نامعلوم جال۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس آسیب نے آرزو کو جکڑا تھا وہی آسیب اب ہمارا پیچھا کررہا ہے......... میں نے اپنی بہت سی محسوسات کاشف کو نہیں بتائی تھیں، مجھے اندیشہ تھا کہ وہ میرا مذاق اڑائے گا اور مجھے نفسیاتی مریض قرار دینے لگے گا۔ وہ حیوانی بو جو تنہائی میں میرے قریب آجاتی تھی......... ہرگز ہرگز وہم نہیں تھی۔ وہ سانسوں کی سرسراہٹ، وہ کسی کی قربت کا واضح احساس، وہ کون تھا، جو ہر جگہ میرا پیچھا کررہا تھا۔ سابقہ تجربات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے دوسروں کو نظر آتا ہے لیکن مجھ سے پوشیدہ رہتا ہے۔ لانچ کے سفر کے دوران میں بھی ایک دو ایسے ہی حیرت ناک واقعات ہوئے تھے۔ مجھے صرف مانوس بو کا احساس ہوا تھا اور دیکھنے والے نے دیکھا تھا کہ میرے قریب کوئی موجود ہے۔

وہ رات ہم نے اسی طرح جاگتے گزار دی۔ صبح پیشاب وغیرہ کرنے کے لئے کاشف باہر چلا گیا۔ میں کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ آرزو تنہائی میں بڑی

شدت سے یاد آتی تھی۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کا غم ناقابل برداشت ٹیس بن کر رگ رگ میں اتر گیا۔ میں دل ہی دل میں کاشف کو کوسنے لگا۔ اس نے ہمیں اپنے ہی چکروں میں ڈال دیا تھا۔ ویران سنسان جگہوں پر ہم کو لئے پھرتا تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ کٹا ہوا تھا میں نے آخری بار قریباً دو ماہ پہلے پاکستان فون کیا تھا۔ یہ فون میں نے "سنگاپور" کی ایک مصروف شاہراہ سے کیا تھا۔ روتی سسکتی بھابی سمن سے میری مختصر بات ہوئی تھی انہوں نے والد کی بیماری کی اطلاع دی تھی اور بتایا تھا کہ آرزو کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔ تاہم پولیس کو کوئی تھوڑا بہت سراغ ملا تھا جس کے بعد چند مزید افراد کو شامل تفتیش کیا گیا تھا۔ اب اس فون کال کو دو ماہ بیت چکے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس نئی تفتیش کا کیا نتیجہ نکلا تھا۔

خیالی گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے اچانک میں چونک گیا۔ کاشف کو گئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ میں نے قریباً پانچ منٹ تک مزید انتظار کیا، پھر اس کو دیکھنے باہر نکل آیا۔ رات کی تاریکی اب دن کے اجالے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جزیرے کے صاف شفاف آسمان پر پرندوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے احتیاط کے ساتھ پہلے اطراف کا جائزہ لیا پھر خود رو درختوں میں کاشف کو تلاش کرنے لگا۔ بھری ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ٹارچ میں نے بیلٹ میں اڑس رکھی تھی۔

جی چاہا کہ آواز دوں۔ مگر یہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ رائفل تو کاشف کے پاس بھی تھی مگر اس اجنبی جگہ کوئی مقام خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے قریباً آدھ گھنٹا کھوہ کے آس پاس کاشف کو تلاش کیا اور پسینے سے شرابور ہوگیا۔ "تو کیا دوسرے ساتھیوں کی طرح کاشف بھی مجھ سے جدا ہوگیا ہے؟" یہ سوال ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر برسنے لگا۔ اچانک میرے عقب میں مدہم سی آہٹ ہوئی میں نے تیزی سے مڑکر دیکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی تھوڑا سا جھک گیا۔ مارشل آرٹ کی تربیت میرے کام آئی تھی اور میں گردن پر آنے والے مہلک وار سے بچ گیا تھا۔ یہ وار رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرکے کیا گیا تھا۔ رائفل کا وزنی دستہ میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، رائفل بردار نے حیرت انگیز پھرتی سے دوسرا وار کیا۔ اس مرتبہ دستے کی ضرب

میری کنپٹی پر لگی۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ میں پشت کے بل گرا۔ میر
دھندلائی ہوئی نظروں کے سامنے ایک لمبے بالوں والا شخص تھا۔ اس کے کانوں میں سو
کی بالیاں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ کی چمک تھی۔
وہی تھا جس سے کل میری دوبدو لڑائی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی مجھے یہ احساس ہوا تھا
یہ ایک خطرناک مدمقابل ہے۔ آج اس نے اپنی خطرناکی ثابت کر دی تھی۔ اس کے عق
میں مجھے دو اور افراد کے ہیولے بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے سر جھٹک کر نظر کے سا
آنے والی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی.......... سفاک مسکراہٹ والے شخص
کھڑے کھڑے "فرنٹ کک" میری ٹھوڑی پر رسید کی۔ ضرب میں زبردست ما
طاقت تھی۔ میرا ٹمٹماتا ہوا ذہن گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆=========☆==========☆

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں ایک پتھریلے فرش پر تھا۔ میرے سامنے آہنی سلاخیں
تھیں.......... بالکل کسی حوالات کا سا منظر تھا۔ مجھے ایبٹ آباد کی وہ پولیس چوکی یاد آ گئی
جہاں میں نے اور کاشف نے کچھ ناقابل فراموش دن گزارے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔
ٹھوڑی پر لگنے والی ایک شدید ضرب کے بعد میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو پیارے۔" ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ ایک سردار جی اس لاک اپ میں موجود تھے۔ ان کے
کیس بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں نشے میں سرخ تھیں اور بالائی جسم عریاں تھا۔ "کون ہو
تم؟" میں نے پوچھا۔

"میں جرأت سنگھ ہوں۔" ایک جرأت کی وجہ سے پچھلے آٹھ ماہ سے یہاں قید
ہوں۔ کیا تم نے بھی میری طرح کوئی جرأت کی ہے؟"

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ابھی مجھے خود بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔" میں نے اپنی
کنپٹی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"دلچسپ آدمی لگتے ہو۔ اور شاید ہم وطن بھی ہو۔"

"نہیں میرا تعلق پاکستان سے ہے۔" میں نے کہا۔

ایک دم کانوں میں غراہٹ کی آواز آئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ لاک
سے باہر دو گرانڈیل سینٹ برنارڈ کتے موجود تھے۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے
پہچانتے ہوں اور ابھی وہ مجھ سے باتیں کرنے لگیں گے۔ ان کتوں کے عقب میں چند
کوٹھریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ سب کوٹھریوں کے سامنے سلاخ دار کھڑکیاں تھیں
کوٹھریوں کی تعداد دس تھی۔ سامنے والی یہ کوٹھریاں ہر لحاظ سے بہتر دکھائی دیتی تھیں۔
میں باقاعدہ بستر موجود تھے۔ سلاخوں کے اندر کی طرف مچھر مکھی سے بچاؤ کے لئے جالی
تھی۔ تپائیاں اور کرسی نما نشستیں بھی ان کوٹھریوں میں نظر آ رہی تھیں۔ سب سے حیر
ناک بات یہ تھی کہ تین کوٹھریوں میں مجھے قیدیوں کے ساتھ نوجوان لڑکیاں بھی نظ
آئیں۔ ان کوٹھریوں میں بند قیدی مختلف نسلوں اور شکلوں کے تھے۔ کچھ تھائی نظر آ
تھے' ایک دو جاپانی تھے۔ باقی تامل یا سنہالی تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ قید خانہ ایک
مربعے کی شکل میں تھا۔ چاروں طرف کوٹھریاں تھیں اور درمیان میں چار پانچ کینال
چوکور احاطہ تھا جس میں تاڑ اور پام وغیرہ کے درخت جھوم رہے تھے۔ سلاخ دار کوٹھریو
سے باہر رکھوالی کے کتے چکرا رہے تھے' اس کے علاوہ مسلح پہریدار بھی تھے۔ پہریدار ا
شکل اور حلیے کے تھے جن سے میری اور کاشف کی مڈبھیڑ کل جنگل میں ہو چکی تھ
کندھوں تک پہنچتے ہوئے لمبے بال' پائجامہ نما پتلونیں اور کانوں میں بالیاں۔ ہر پہرے
رائفل یا کلہاڑی سے مسلح تھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے سردار جی سے پوچھا۔

"یہ پاگل خانہ ہے۔ یہاں بہت سے سمجھدار پاگل رہتے ہیں۔ جو یہاں آتا ہے
بھی میری طرح پاگل ہو جاتا ہے۔" سردار نے نشے میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیوں پکڑ رکھا ہے ان لوگوں نے؟"

"میں نے بتایا ہے ناں کہ میرا نام جرأت سنگھ ہے اور میں ایک جرأت کی وجہ
پکڑا گیا ہوں۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں' وہاں سے میں ایک اخبار بھی نکالتا تھا' اس
نام تھا "جرأت ٹائم۔" میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ کہو تو میں واہگرو کی
کھا سکتا ہوں' میری ظاہری حالت پر نہ جاؤ۔ میں واقعی ایک صحافی ہوں۔"

"اگر تم صحافی ہو تو پھر تم سے اچھے رویے کی توقع رکھنی چاہئے۔ مجھے تمہاری مدد
کی ضرورت ہے۔ مجھے بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے مجھے
اور تمہیں پکڑا ہے۔"

جرأت سنگھ نامی یہ سردار ایک بار پھر بے پر کی ہانکنے لگا' کبھی وہ اس جگہ کو پاگل
خانہ قرار دے رہا تھا' کبھی جادونگری اور کبھی اپنی پھوپھو سراپ کور کی سسرال۔ وہ نشے
میں دھت تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا نشہ اترنے کا انتظار کیا جائے۔ بہرحال جرأت
سنگھ کی باتوں سے یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی چکا تھا کہ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں مجھے اچانک حملہ
کر کے بے ہوش کیا گیا تھا اور اگر مجھے کوئی نہ بھی بتاتا تو زرد پھولوں کی وہ خوشبو بتا سکتی
تھی جو اس جزیرے کی زبردست پہچان تھی۔ ایسی خوشبو جس میں کیچڑ اور سڑی ہوئی
نباتات کی باس بھی شامل ہو گئی تھی' نہ میں نے پہلے کبھی سونگھی نہ بعد میں۔

اب شام ہونے والی تھی' میں نے اندازہ لگایا کہ میں نو دس گھنٹے بے ہوش پڑا رہا
ہوں۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا' بس رائفل میرے پاس نہیں تھی اور جوتے غائب
تھے۔ میرا دھیان ایک بار پھر کاشف کی طرف چلا گیا اور ان گنت وسوسوں نے مجھے گھیر
لیا۔ اندھیرا پھیلتے ہی ہماری کوٹھری کے سامنے لیمپ روشن ہو گئے۔ اے کلاس کوٹھریوں
میں زیادہ روشنی تھی وہاں لیمپس کے علاوہ شمعدان وغیرہ بھی موجود تھے۔ دوسری بات یہ
تھی کہ روشنیوں کا یہ سامان کوٹھریوں کے اندر تھا' وہ اپنی مرضی سے اسے روشن کر سکتے
تھے یا بجھا سکتے تھے۔

شام سے کچھ دیر بعد کھانے کی خوشبو آئی۔ کوٹھڑی کے دروازے میں ایک چھوٹا
سا خلا پیدا ہوا اور دو ٹرے اندر کھسکا دیئے گئے۔ ناریل کے تیل کی خوشبو ہمارے نتھنوں
میں گھسنے لگی۔ کھانے میں چاول تھے' گوشت کا شوربہ تھا اور دودھ میں پکا ہوا دلیہ تھا۔
سخت غیر یقینی اور سنگین حالات کے باوجود مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے کھانا شروع
کیا۔ جرأت سنگھ بھی نشے کے عالم میں بڑے بڑے لقمے لے رہا تھا۔ اس دوران میں اے
کلاس قیدیوں کو بھی کھانا سرو کیا جانے لگا۔ ان لوگوں کا کھانا بہت بہتر تھا۔ کچھ کوٹھریوں میں
تو ایسا کھانا پہنچایا گیا جسے دیکھ کر پُرتکلف دعوت کا گمان گزرا۔ کئی طرح ڈشیں' خوبصورت
برتن' پھلوں کے جوس اور ولایتی شراب۔

میں نے جرأت سنگھ سے پوچھا۔ "یہ لوگ قید کاٹ رہے ہیں یا گلچھرے اڑا رہے ہیں۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ان گلچھروں سے واہگرو کی پناہ مانگو۔ تمہیں نہیں معلوم اس عیش کی قیمت کیا ہے۔ پتہ چلے گا تو کانوں کو ہاتھ لگاؤ گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کل شام تک خود ہی پتہ چل جائے گا تمہیں۔" جرأت سنگھ نے مبہم سا جواب دیا۔

جرأت سنگھ کی بات میں مجھے کچھ وزن محسوس ہوا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لگژری ہوٹلوں کا آرام ہونے کے باوجود ان کوٹھڑیوں کے قیدی کچھ پریشان حال سے تھے۔ چپ چپ بجھے بجھے سے۔

ابھی ہم بمشکل کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہماری کوٹھڑی کے سامنے موجود کتے آہستہ آہستہ غرانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ قید خانے میں موجود پہریداروں کے اندر بھی عجیب طرح کی بے چینی اور ہلچل پائی جا رہی ہے۔ چند سیکنڈ بعد موی شمعوں کی روشنی نظر آئی۔ آٹھ دس افراد کا ایک چھوٹا سا جلوس ہماری کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اچانک تمام پہریدار سجدے میں گر گئے اور کوٹھڑیوں میں موجود قیدی بھی ناف پر ہاتھ باندھ کر باادب کھڑے ہو گئے۔ جرأت سنگھ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ میں بدستور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں میرا بازو کھینچا اور سرگوشی میں بولا۔ "اوئے کھوتے، کیوں مصیبت کو ماسی کہہ رہا ہے، کھڑا ہو جا، نہیں تو کبھی کھڑا نہیں ہو سکے گا۔"

جرأت سنگھ کی آواز سے لگتا تھا کہ اس کا نشہ چند سیکنڈ میں ہرن ہو چکا ہے۔ میں گھٹنوں پر زور دے کر کاہلانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا دیر میں نے اپنے سامنے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک سرخ وسپید شخص جس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا اور شانے "افق تا افق" پھیلے ہوئے تھے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے شہد رنگ بال شانوں تک پہنچ رہے تھے اور کانوں میں بڑی بڑی جڑاؤ بالیاں تھیں۔ اس کی شکل دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کبھی کسی بزرگ کا قول سنا تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک جانور ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ جانور انسان پر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ انسان کی شکل بھی جانور سے ملنے لگتی ہے۔ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ سرتاپا انسان تھا۔ اس کا چہرہ

انسانوں جیسا تھا، مگر جب غور سے اس کا چہرہ دیکھا جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ انسانی کندھوں پر ایک بھیڑیے کا سر رکھا ہے........ خدا کی پناہ۔ ایسی مشابہت تھی کہ روح تک لرز اٹھی تھی۔ اس شخص کے کان، آنکھیں، ہونٹ، رخسار سب انسانوں جیسے تھے لیکن ان اعضاء کا مجموعی تاثر سو فیصد بھیڑیئے کا تھا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "تم انگلش جانتے ہو؟" بھیڑیئے کے منہ سے بھیڑیئے جیسی غراہٹ نکلی۔

میں نے اثبات میں سرہلایا۔

"میں تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب........ کون ہیں........ آپ؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تم مجھے جانتے ہو۔ بڑی اچھی طرح........"

"میں نے........ آپ کو........ پہلے کبھی نہیں دیکھا؟" میں نے کہا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے احتراز کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ روح لرز اٹھتی تھی........ پہریدار ابھی تک سجدہ ریز تھے۔

وہ دو قدم چل کر آگے آ گیا۔ "تمہاری آنکھوں کے سامنے پردہ ہے۔ بہت جلد یہ پردہ ہٹ جائے گا۔"

"مجھے اور میرے ساتھیوں کو کیوں پکڑا گیا ہے۔ ہم سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے؟"

"ہمیں نہیں معلوم تم کن ساتھیوں کی بات کر رہے ہو۔ اس وقت ہم تم سے طالب ہیں اور صرف تمہیں جانتے ہیں۔"

"مجھے کیوں پکڑا گیا ہے۔"

"اس کا جواب بہت جلد تمہیں دیا جائے گا۔"

یہی وقت تھا جب اچانک میرے نتھنوں سے ایک جانی پہچانی حیوانی بو ٹکرائی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ یہی وہ حیوانی بو تھی جو کسی وقت تنہائی میں خوف کا لبادہ پہن کر میرے حواس پر چھا جاتی تھی۔ ہاں یہی وہ تھی۔ میں نے دہشت کے عالم میں آنکھیں پھاڑ کر اپنے سامنے کھڑے بھیڑیا نما انسان کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہرناک مسکراہٹ ابھری۔ وہ مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا

واپس چلا گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بھیڑیا نما گرانڈیل شخص کے عقب میں ایک سچ کا بھیڑیا بھی موجود ہے۔ اس بھیڑیئے کے گلے میں پالتو کتوں کی طرح پٹا ڈالا گیا تھا۔ بادی النظر میں وہ بھی السیشن نسل کا کوئی کتا نظر آتا' لیکن میں کتے اور بھیڑیئے کا فرق اچھی طرح جانتا تھا۔ گرانڈیل شخص کے عقب میں جو جانور چلا جا رہا تھا وہ سو فیصد بھیڑ تھا۔ مشعل بردار جلوس باہر نکل گیا۔ سجدے میں گرے ہوئے پہریدار اٹھ کھڑے ہوئے۔ فضا میں موجود خوفناک ٹھہراؤ اور سناٹا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔

"یہ کون تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد جرات سنگھ سے پوچھا۔

"اس جادو نگری کا سب سے بڑا جادوگر۔ یہی ہے جو یہاں کے سیاہ سفید کا ہے۔ اسے مقامی زبان میں شوراق کہا جاتا ہے۔ شوراق کا مطلب ہوتا ہے' آسمانی باپ اس جزیرے میں موجود لوگوں کا ان داتا اور آسمانی باپ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی حکم اور بے ادبی کی سزا دردناک موت ہے۔ اگر تم اس کی آمد پر کھڑے نہ ہوتے تو ممکن کہ وہ اتنی سی بات پر ناراض ہو جاتا اور کھڑے کھڑے تمہاری گردن مروا دیتا۔" پھر جرات سنگھ نے ذرا توقف کر کے پوچھا۔ "تم نے اس کی شکل دیکھی ہے؟"

"ہاں۔" لگتا ہے کہ انسان کے جسم پر بھیڑیئے کا سر رکھا ہے۔"

"وہ شکل کا ہی نہیں کردار کا بھی بھیڑیا ہے۔" جرات سنگھ نے سرگوشی کے میں کہا۔ "خون بہانا اور روتے سسکتے لوگوں کو دیکھنا اس کا دلچسپ مشغلہ ہے بلکہ جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ وہ انسانوں سے زیادہ جانوروں کے قریب ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گے پیارے...... شوراق خفیہ صلاحیتوں کا ہے۔" جرات سنگھ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ کچھ دیر میری آنکھوں میں دیکھتا رہا "خفیہ صلاحیتوں اور انجانی شکتیوں پر وشواس رکھتے ہو تم؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کچھ عرصہ پہلے تک کم رکھتا تھا مگر اب رکھتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "اگر رکھتے ہو تو پھر شاید تم میری بات کا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں اس وقت میں نہیں ہوں۔ کیا میں تمہیں نشے میں نظر آتا ہوں۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بھیڑیئے کو دیکھنے کے بعد تمہارا نشہ ہرن ہو چکا ہے۔"

"ہاں...... تو میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں پورے ہوش و حواس میں بتا رہا ہوں...... یہ شخص جو ابھی تمہیں نظر آیا تھا اور جس کا نام میں نے تمہیں شوراق بتایا ہے...... جانوروں کا حکمران ہے۔"

"جانوروں کا حکمران؟"

"ہاں...... وہ اپنی اندر کی شکتی کے زور پر جانوروں پر حکم چلا سکتا ہے۔ جانور اس کی بات مانتے ہیں اور وہی کچھ کرتے ہیں جو وہ کہتا ہے۔"

میں جرات سنگھ کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ کئی واقعات اچانک ماضی کے دھندلکے سے ابھر کر حال کی چمکتی دھوپ میں آ گئے تھے۔ سب سے پہلے ایک کالا کتا میرے پردہ تصور پر ابھرا۔ وہ منحوس جانور جو لاہور اور ایبٹ آباد کی گلیوں میں مجھے اپنی جھلک دکھاتا رہا تھا۔ پھر ایک چھپکلی اچھل کر ماضی کی دھند سے نکلی اور تڑپ کر نگاہوں کے سامنے سے گزر گئی۔ یہی وہ ننھی سی چھپکلی تھی جو آرزو کے والد انوار صاحب کی عجیب و غریب موت کا سبب بنی تھی' پھر میں نے خیالوں ہی خیالوں میں خود کو ایبٹ آباد کی ایک پولیس چوکی میں موجود پایا اور ایک آوارہ بلی اچانک خونخوار روپ میں میرے اور آرزو کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ اس طرح کے کئی بکھرے بکھرے واقعات نگاہوں کے سامنے آئے اور میرے ذہن سے یہ سوال گونج بن کر ابھرا کہ کیا ان واقعات میں اور تھوڑی دیر پہلے جرات سنگھ کی کہی ہوئی بات میں کوئی تعلق ہے؟

دل کی گہرائیوں میں خودبخود یہ گواہی ابھری کہ ہاں کوئی تعلق ہے' کوئی بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ سب ایک طویل زنجیر کی کڑیاں ہیں' یہ سب ایک وسیع جال کے حلقے ہیں۔ کوئی ایک ہی سحر ہے جس کی یہ ساری فسوں کاریاں ہیں۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو پیارے؟"

"تمہاری بات کی تہہ تک جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے...... تمہاری بات میں کچھ وزن لگ رہا ہے۔"

پھر اچانک میرا دھیان ماضی قریب کے واقعات کی طرف چلا گیا...... یہاں آکر

ہمیں جو ایک دو سنگین حادثے پیش آئے تھے ان کا تعلق بھی تو جانوروں سے ہی تھا۔ مقامی نسل کے کوؤں کا ہمارے دسترخوان پر خوفناک حملہ' سمندر میں کھڑی لانچ پر مگرمچھوں کی خونی یلغار اور ہنس مکھ سورن عرف پہلوان کی المناک موت......... یہ سب ایک دو دن پہلے ہی کے واقعات تھے۔ ایک عجیب سا رونگٹے کھڑے کرنے والا احساس دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ غالباً کھانے میں کوئی خواب آور دوا تھی مگر یہ دوا ایسی تیز نہیں تھی کہ آناً فاناً مجھے اور جرأت سنگھ کو لمبا لٹا دیتی۔ یہ تو ایک سرور آمیز کیفیت تھی جو دھیرے دھیرے شدت اختیار کر رہی تھی اس قید خانے سے باہر کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ بانسری کی لے میں جزیروں کے بھیگے ہوئے جنگلوں کی خوشبو تھی اور طلسمی آنکھوں والی الہڑ دوشیزاؤں کی ہنسی کی کھنک تھی......... میں نے لڑکھڑاتی آواز میں جرأت سنگھ سے پوچھا۔ "کیا تمہیں بھی بے تحاشہ نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں۔ آج کی رات بڑے مزے سے گزرے گی۔ کبھی تاڑی پی ہے تم نے؟ نہیں پی ناں۔ اسی لئے تمہیں پتہ نہیں چلا۔ دودھ میں پکا ہوا جو دلیہ تم نے کھایا ہے اس میں تاڑی کا "ست" تھا۔

جرأت سنگھ کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سویا تو پھر اگلے دن سہ پہر کے وقت ہی اٹھا۔ طبیعت خاصی ہشاش بشاش محسوس ہو رہی تھی۔ کنپٹی سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی اب کم تھیں۔ ہماری کوٹھری کے ساتھ ہی ایک غسل خانہ بھی موجود تھا۔ یہاں مقامی طرز کی ایک پاجامہ نما پتلون اور بنیان لٹک رہی تھی۔

جرأت سنگھ بولا۔ "چل شہزادے' ذرا نہا دھو لے اور یہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا لباس بھی اتار۔ لگتا ہے کہ کیچڑ کے تالاب میں نہاتا رہا ہے تو۔"

جرأت سنگھ خود بھی نہایا دھویا نظر آتا تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے لٹوں کا جوڑا بنایا تھا اور کوئی عطر وغیرہ بھی لگایا تھا۔ جرأت سنگھ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں بھی نہانے کے لئے چلا گیا۔ نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے تو خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔ شیو کا سامان نہیں تھا اس لئے داڑھی تھوڑی بڑھی ہوئی تھی۔ جرأت سنگھ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "پتہ نہیں کیسے پھنس گیا ہے تو یہاں

تیرے تو ابھی کھیلنے کھانے کے دن تھے۔"

"تم بھی ایسے بڈھے تو نہیں ہو۔"

"یارا' ہم کو تو بس ایک جرأت مار گئی۔"

اس سے پہلے کہ میں اس سے اس جرأت کے بارے میں کچھ پوچھتا ہماری کوٹھری کا آہنی دروازہ حرکت میں آ گیا۔ ایک رائفل بردار پہریدار نے ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پہلی بار ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اے کلاس کی وہ ساری کوٹھریاں خالی ہیں جہاں کل قیدی نظر آ رہے تھے۔

جونہی ہم باہر نکلے دو سینٹ برنارڈ کتے ہمارے دائیں بائیں چلنے لگے۔ کتوں کی آنکھیں اور ان کی حرکات دیکھ کر عجیب سے خوف کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کتے جانوروں کی نظر سے نہیں انسانوں کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر بات کو بڑی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ قریباً سو ڈیڑھ سو قدم چل کر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے لوگوں کا شور بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ پھر ایک بڑے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے جرأت سنگھ سے پوچھا۔

"اسٹیڈیم۔ ویسا ہی اسٹیڈیم جیسے ہمارے چندی گڑھ اور تمہارے لاہور میں ہوتے ہیں۔"

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"ہو نہیں رہا' ہونے والا ہے۔ تم نے کل انسانوں کی طرح باتیں کرنے والا بگیاڑ (بھیڑیا) دیکھا تھا آج اس کی خونخواری اور سفاکی دیکھو گے۔ واہگرو ہر آنکھ کو ایسے نظاروں سے بچائے۔"

جلد ہی ہم اس پیالہ نما اسٹیڈیم کے اندر تھے۔ اسٹیڈیم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں کم و بیش تین ہزار افراد موجود تھے۔ یہ سب کے مقامی لوگ تھے۔ ان میں سے نوے فیصد مردوں کے بال ان کے شانوں پر جھول رہے تھے۔ عقب سے پہچاننا مشکل ہوتا تھا کہ عورت بیٹھی ہے یا مرد۔ جن مردوں کے بال نہیں تھے ان کے بالکل ہی نہیں تھے وہ صفاچٹ سروں والے تھے۔ ایسے تیز استرے پھیرے گئے تھے کہ کھوپڑیاں شیشے کی طرح

چمک رہی تھیں۔ ہمیں ایک راہداری سے گزار کر ایک بیرک نما انکلوژر میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں سامنے کی طرف آہنی سلاخیں لگی تھیں اور ان سلاخوں سے باہر رکھوالی کے کتے گردش کر رہے تھے۔ سامنے ایک جگہ زرق برق لباسوں والے کچھ معززین بیٹھے تھے اور مزید بھی آ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ "وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے سرگوشی میں جرأت سنگھ سے پوچھا۔

"جادوگر کے رشتے دار۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ شوراق کی فیملی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس جزیرے کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں۔ وہ موٹی عورت دیکھ رہے ہو جو بائیں طرف نقش ونگار والی کرسی پر بیٹھی ہے۔ وہ شوراق کی بیوی ہے۔ اس کا نام قاروبا ہے۔ قاروبا کی حیثیت یہاں وہی ہے جو کسی ملک میں ملکہ کی ہوتی ہے......... اور وہ دیکھ وہ لڑکی جو پچھلی قطار میں بیٹھی ہے۔ یہ شوراق کی محبوبہ ہے۔ شوراق اس پر ہزار جان سے مرتا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہاں کا حاکم اور مختار کل ہونے کے باوجود وہ مجبور ہے۔ ملکہ کی رضامندی کے بغیر وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس شادی کے لئے ملکہ کو رضامند ہونا ہوگا یا پھر قدرتی موت مرنا ہوگا۔ اگر ملکہ کی رضامندی کے بغیر یا اس کے مرنے سے پہلے شوراق اپنی محبوبہ سے شادی رچائے گا تو اسے ایک بہت بڑی قیمت چکانا ہوگی۔ اسے اپنی مہان شکتی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے جو اس کی حکمرانی کا اصل ستون ہے۔ یہ مہان شکتی وہی ہے' جس کا ذکر میں نے کل تم سے کیا تھا۔ شوراق کی وہ عجوبہ روزگار شخصیت جاتی رہے گی جس کے ذریعہ وہ حیوانات کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیتا ہے......... پتہ ہے کہ شوراق کو یہ وارننگ کس کی طرف سے ملی ہوئی ہے؟"

میں جرأت سنگھ کا سوال سن رہا تھا' اس کی ساری باتیں بھی میں نے سنی تھیں' مگر میری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ میری پتھرائی ہوئی آنکھیں ایک خاص سمت میں لگی تھیں اور کائنات کی گردش میرے لئے جیسے تھم چکی تھی۔ میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جسے جرأت سنگھ نے شوراق کی محبوبہ بتایا تھا......... اس لڑکی سے میرا فاصلہ کافی زیادہ تھا' میں اس کے خدوخال ٹھیک طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا' مگر اس کا سراپا اور اس کا مجموعی حلیہ تو

بری نگاہ میں تھا......... میرے دل کے اندر سینکڑوں نقارے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ نقارے سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ "آرزو۔"

بے شک وہ آرزو تھی۔ وہ خیزہ کن حسن' وہ بیٹھنے کا انداز' وہ رنگت وہ سراپا' کسی رکا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نیند میں چلنے والے کسی معمول کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا ر آہنی سلاخوں کی طرف بڑھا۔ اتفاقاً عین اس وقت ایک اور قیدی کو انکلوژر میں داخل رنے کے لئے دروازہ کھولا گیا۔ میں پہریدار کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا اور اس سمت بڑھتا گیا جدھر وہ لڑکی بیٹھی تھی جس پر مجھے آرزو کا شبہ ہو رہا تھا۔ پہریدار میرے پیچھے لپکا۔ لے وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتا رہا' پھر اس نے مجھے باقاعدہ پکڑ لیا۔ مجھ پر تو ایک بے دی سی طاری تھی۔ ایک جنون سا تھا جو مجھے کشاں کشاں اس لڑکی کی طرف لئے چلا رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے پہریدار کو جھٹک دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک آہنی جنگلے ے جا ٹکرایا۔ میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ میں جس چہرے طرف بڑھ رہا ہوں وہ میری آرزو ہی کا چہرہ ہے۔ خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے' راپا اجاگر ہونے لگا تھا۔

ایکا ایکی دو تین پہریدار مجھ سے لپٹ گئے۔ اس وقت میری حالت بیان سے باہر ا۔ پہریدار دس بیس بھی ہوتے تو شاید مجھے روک نہ سکتے۔ مجھے سب کچھ بھول گیا تھا۔ صلحت ذہن سے نکل گئی تھی' بس یہ بات یاد رہ گئی تھی' مجھے آرزو تک پہنچنا ہے۔ ے قریب سے دیکھ کر یقین کرنا ہے کہ وہ میری آرزو ہی ہے۔ پھر اسے آواز دینی ہے اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ میں نے پہریداروں کو جھٹکنا چاہا' وہ مجھ سے الجھ گئے۔ میں جنون کے عالم میں انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ ایک سینہ پکڑ کر گر اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ شاید مجھے گولی مارنے کا حکم نہیں تھا ورنہ وہ مجھے ٹ کر دیتے۔ اسٹیڈیم نما تماشا گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے سینکڑوں تماشائی کھڑے ہو تھے اور اس الگ طرز کے تماشے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

پہریداروں کو جھٹک کر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ میری نگاہ اب بھی منزل مقصود پر جمی ہاں وہ آرزو ہی تھی۔ سو فیصد آرزو مجھے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ ایبٹ کی اس خطرناک کھائی سے اس تماشا گاہ کی نشست تک کیسے پہنچی۔ نہ ہی اس حوالے

سے بے شمار دیگر باتیں سوچنے کی فرصت تھی۔ میں صرف آرزو کو دیکھ رہا تھا اور آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر عالم وحشت میں میں نے اسے پکارنا شروع کردیا۔ "آرزو........ آرزو۔" وہ ایک دم بری طرح چونک گئی۔ اس کے حسین چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔

میں لوگوں کو پھلانگتا ہوا اس کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی اور سکتے کی سی کیفیت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک رکھوالی کے خونخوار کتوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ تربیت یافتہ محافظوں کی طرح میری چاروں جانب کھڑے ہوگئے تھے اور جیسے آنکھوں آنکھوں میں مجھے وارننگ دے رہے تھے کہ میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو وہ مجھے چیر پھاڑ دیں گے لیکن رک جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں آگے بڑھا۔ دو کتے مجھ پر پل پڑے' میں نے ایک کو ٹانگ سے پکڑ کر گھما دیا۔ دوسرے کی پسلیوں میں میرے پاؤں کی شدید ٹھوکر لگی' وہ چیختا ہوا تماشائیوں پر گرا اور انہیں بھی چیخنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ یکایک درجنوں پہریدار مجھ سے لپٹ گئے۔ میرے سر پر کسی وزنی شے کی ضرب لگی اور میں آرزو سے قریباً تین قدم کی دوری پر لڑکھڑا کر گر گیا۔ مجھے ہر طرف سے دبوچ لیا گیا اور فرش پر اوندھے منہ گرا کر میرے ہاتھ پشت پر بے رحمی سے باندھ دیئے گئے۔

میں ابھی تک مچل رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی سعی کر رہا تھا۔ میری نگاہ نازک کومل آرزو پر تھی جسے بھاری بھرکم لباس پہنایا گیا تھا اور قسم قسم کے زیورات سے لاد دیا گیا تھا۔ وہ جیسے اس ناقابل برداشت بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے چاند چہرے پر درد اور کرب کی بدلیاں دیکھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے مگر نارمل رہ نہیں پا رہی۔ پہریدار مجھے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے واپس قیدیوں کے انکلوژر میں لے آئے۔ میرا نیا لباس پھٹ چکا تھا اور ناک منہ سے خون جاری تھا۔ تماشائی اٹھ اٹھ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دلچسپی اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں۔ شاید وہ مجھے فاترالعقل سمجھ رہے تھے۔ ایک ایسا جنونی جو اپنے پنجرے سے نکل بھاگا تھا اور شاہی فیملی کے معزز اور اراکین کے سامنے جاکر واویلا شروع کردیا تھا۔

پہریداروں نے مجھے انکلوژر یعنی نظارہ گاہ کے اندر ایک کرسی کے ساتھ باندھ دیا اور زبردستی میرا منہ کھلوا کر اس میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ حالانکہ میں اب چیخنے چلانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ میں اپنے حواس میں نہیں ہوں اور میرا تصور مجھے ڈراؤنے ہیولے دکھا رہا ہے۔ اب مجھے جس جگہ باندھا گیا تھا وہاں سے مجھے جزیرے کے معززین نظر آتے تھے اور نہ ہی آرزو۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک وسیع تماشا گاہ میں لوگوں کی آوازوں سے ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ میں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ تماشا گاہ میں موجود ہزاروں مرد و زن ایک ساتھ سجدے میں گر گئے۔ ایک سجے سجائے شاندار ہاتھی پر ایک شخص تماشا گاہ میں داخل ہوا۔ وہ شوراق تھا کسی بہت بڑے مہاراجہ کے انداز میں وہ لوگوں کے سامنے سے گزرا اور پھر ایک چمکدار سیڑھی کے ذریعے ہاتھی پر سے اتر گیا۔ اس کے اترنے کے بعد لوگوں نے سجدے سے سر اٹھالیا۔ شوراق کے ساتھ اس کا بھیڑیا بھی تھا۔ دونوں محافظوں کے جلو میں پہلو بہ پہلو چلتے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ شوراق اپنی زرنگار نشست پر بیٹھ گیا اور اس کا پالتو بھیڑیا بڑی متانت سے اپنے آقا کے قدموں میں بیٹھ کر کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ یہ منظر مجھ سے کافی دور ہونے کے باوجود صاف دکھائی دے رہا تھا۔

جرأت سنگھ ایک بار پھر میرے قریب آبیٹھا۔ "تم تو نرے سڑی ہو۔ یہ کیا کیا تم نے۔ تمہاری اس حرکت کی جانکاری شوراق کو ضرور ہوگی اور وہ اس بدتمیزی پر تمہیں لوہے کے چنے چبوا دے گا۔"

شاید وہ میری طرف سے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر پھر اسے یاد آیا کہ میرے منہ میں تو کپڑا ٹھسا ہوا ہے۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "میں تمہارے منہ سے کپڑا نکال دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تم پھر شور نہیں مچاؤ گے۔"

میں نے سر ہلا کر اس سے وعدہ کیا کہ شور نہیں مچاؤں گا۔

اس نے پہریداروں کی نگاہ بچا کر میرے منہ میں ٹھسا ہوا کپڑا کھینچ دیا۔

"اب ہاتھ بھی کھول دے یار۔" میں نے کہا۔

"میرا بھیجہ ابھی ٹھیک ہے' بس اب چپکا بیٹھا رہ۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "یہ تجھے ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ کیا کوئی بیماری ہے تجھے؟"

"ہاں بیماری ہی سمجھ۔ بہت بڑی بیماری۔"

"تو جا کس طرف رہا تھا اور شاید تو کسی کا نام بھی پکار رہا تھا۔"

"شاید ایسا ہوا ہو گا' لیکن یہ ایسی بیماری ہے کہ جو کچھ میں نے کیا ہوتا ہے وہ بھول جاتا ہے۔"

"مجھے اُلو کا پٹھا مت سمجھ۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے کسی کو دیکھا ہے اور اس کو پہچان کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے ہو.........."

"تجھے وہم ہوا ہے جرأت سنگھا۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ جرأت سنگھ جواب میں کچھ کہتا' تماشا گاہ میں ہلچل نظر آئی۔ نہایت مختصر لباس میں کچھ مقامی لڑکیاں تماشا گاہ میں داخل ہوئیں اور ہیجان خیز رقص کرنے لگیں یہ رقص ٹیبلو کی طرف کا تھا۔ لڑکیوں کو مختلف چرندوں سے تشبیہہ دی گئی تھی۔ جیسی تشبیہہ تھی ویسا ہی ماسک لڑکی کے چہرے پر تھا۔ کوئی ہرنی تھی کوئی نیل گائے کوئی بکری.......... یہ لڑکیاں ایک رائفل بردار شکاری سے بچنے کے لئے چھپتی پھرتی تھیں۔ شکاری انہیں چن چن کر مارتا تھا۔ زندہ رہ جانے والے جانور اپنے ساتھیوں کی موت پر آنسو بہاتے تھے اور واویلا کرتے تھے۔

اس رقص کے بعد سدھائے ہوئے جانوروں نے کچھ حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ یہ مظاہرے دیکھنے کے قابل تھے لیکن میرا ذہن تو کہیں اور بھٹک رہا تھا' صرف آنکھیں تھیں جو میدان پر جمی ہوئی تھیں۔ بدن کے ہر رگ ریشے میں ایک خوشبو مہک اٹھی تھی اور ایک ایسی آندھی چل رہی تھی جس نے اردگرد سے بیگانہ کر دیا تھا.......... میری آرزو زندہ تھی.......... میں نے اسے دیکھا تھا اور اس نے مجھے دیکھا تھا' ان دو حقیقتوں کے علاوہ باقی جو کچھ تھا بے کار تھا' محض افسانہ تھا۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں میری آنکھوں کے سامنے وہی عید کارڈ گھومنے لگا جو ایبٹ آباد کی پولیس چوکی میں انسپکٹر پایہ مغلی نے بطور الزام مجھے پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ عید کارڈ' میرے ساتھ آرزو کا غائبانہ اظہار محبت تھا۔ وہ باتیں جو شاید وہ زندگی بھر نہ کہہ سکتی اس نے عید کارڈ میں لکھی تھیں اور یہ باتیں کہاں

ہاں سے ہوتی بالآخر مجھ تک پہنچ گئی تھیں۔ عید کارڈ کی تحریر کا علم ہونے کے بعد میرے ندر جو یادگار جوش وجذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا.......... آج پھر بیدار ہو رہا تھا۔ ایک یب سی سرشاری تھی۔ آرزو کی خاطر ہر مشکل سے ٹکرانے اور ہر قیامت کو جھیلنے کی نگ تھی.......... ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک عجیب سا خیال بھی پیدا ہو ہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کاشف جو اب تک ہمیں جگہ جگہ سیاحت ی خاطر لئے پھرتا رہا ہے تو یہ سب کسی مقصد کے تحت تھا۔ وہ ہمیں جزیرہ جزیرہ گھماتا رہا اور اسی جزیرہ گردی کے دوران میں ہم اس جزیرے پر آپہنچے تھے.......... یوں محسوس تا تھا کہ آج کئی ماہ بعد آرزو سے ہونے والی میری یہ حیرت انگیز ملاقات اتفاقیہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی پلاننگ تھی اور اگر واقعی پلاننگ تھی تو پھر اس پلاننگ کا ماسٹر مائنڈ شف ہو سکتا تھا۔

میرے سامنے تماشا گاہ کے اندر مختلف کھیل تماشے ہو رہے تھے لیکن میرا ذہن ہے ہی تند و تیز خیالوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک کھلبلی سی تھی جو پورے بدن میں پھیلی ہوئی ی۔ تماشا گاہ میں پہلوانوں کے مقابلے ہوئے۔ پھر بلڈ ہاؤنڈز کتوں اور ریچھ کی لڑائی ئی۔ اس کے بعد چھوٹے کتوں کی ریس ہوئی جس میں شرط بازوں نے بڑھ چڑھ کر لیں لگائیں۔ اس کے بعد اس تماشے کا کلائمکس آگیا۔ پورے اسٹیڈیم میں اس خاص س تماشے کا دھڑکتے دل کے ساتھ انتظار ہونے لگا' ہر آنکھ مجسم انتظار بن گئی۔ اسٹیڈیم ایک طرف چالیس پچاس فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ اونچی ایک پتھریلی دیوار تھی۔ اس ر میں لوہے کے چار دروازے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ یہ دروازے تماشا گاہ کے رونی حصے میں کھلتے تھے جس کی چاروں طرف لوہے کا ناقابل عبور جنگلہ لگا ہوا تھا۔ اس ے کی اونچائی بھی پندرہ فٹ کے لگ بھگ تھی' جنگلے کے بالائی کنارے پر نوک دار نیں تھیں۔

"وہ دیکھو کون لوگ ہیں۔" جرأت سنگھ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹی میں کہا۔

میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ جنگلے سے باہر دس پندرہ کشتیاں موجود تھیں اور کشتیوں پر وہی قیدی بیٹھے تھے جنہیں میں نے کل "اے کلاس" کوٹھڑیوں میں دیکھا

تھا۔ ان قیدیوں کے گرد رکھوالی کے کتے چوکس ہو کر منڈلا رہے تھے‘ اس کے علاوہ رائفل بردار محافظ بھی تھے۔ قیدیوں کا رخ دوسری طرف تھا پھر بھی ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد پریشان اور غمزدہ بیٹھے ہیں۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے جرأت سنگھ سے پوچھا۔

”بس دیکھتے جاؤ۔“ اس نے لرزاں لہجے میں کہا۔

”یہ سامنے دیوار میں چار دروازے کیسے ہیں؟“

”یہ سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہے۔ وہ پرانی کہانی تو پڑھی ہو گی تم نے جس میں قیدی کو دو دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولنا ہوتا تھا۔ ایک دروازے کے پیچھے سندر ناری ہوتی تھی دوسرے کے پیچھے آدم خور شیر۔ سمجھو کہ آج تم اس کہانی سے ملتا جلتا ایک منظر اس تماشاگاہ میں دیکھو گے۔ بلکہ یہ منظر اس سے بھی زیادہ خوفناک ہو گا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ان قیدیوں کو یہ دروازے کھولنے کے لئے کہا جائے گا۔“

”ہاں۔ باری باری ایک ایک قیدی جائے گا۔“

”لیکن یہ تو چار دروازے ہیں۔“

”یہ بھی شوراق کی سفاکی ہے۔ اس نے موت کے لئے کم اور زندگی کے لئے زیادہ چانس رکھا ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سارے قیدی آج ہی غلط دروازے کھول کر اپنا کام تمام کروالیں۔ وہ انہیں کئی ماہ تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکائے رکھے گا۔ زندگی ان بدقسمتوں میں سے شاید ایک آدھ کے حصے میں ہی آئے گی۔“

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔“ میں نے کہا۔

جرأت سنگھ نے سرگوشیاں جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ”جو کہانی ہم تم پڑھتے رہے ہیں‘ اس میں دو دروازے تھے۔ زندگی اور موت کا چانس آدھا آدھا تھا۔ اس تماشے میں چار دروازے ہیں۔ تین زندگی کے اور ایک موت کا‘ لیکن قیدی کی جان ایک ہی آزمائش کے بعد چھوٹ نہیں جائے گی۔ یہ تماشا ہر ماہ انہی تاریخوں میں باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ قیدی کو کم از کم چار بار اس آزمائش میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پورے چار ماہ تک موت اور زندگی کے درمیان لٹکتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی کڑی سزا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پچھلے آٹھ ماہ کی قید کے دوران میں میں سات مرتبہ یہ

تماشا دیکھ چکا ہوں‘ اور ہر مرتبہ مجھے دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہا ہے۔“

میں سخت تعجب کے عالم میں جرأت سنگھ کے انکشاف سن رہا تھا۔ ایک دو پہریداروں نے دیکھ لیا تھا کہ میرے منہ سے کپڑا نکل گیا ہے اور میں باتیں کر رہا ہوں لیکن اب چونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا اس لئے انہوں نے مجھے نظرانداز کیا اور سنسنی خیز تماشے کی طرف متوجہ رہے۔

میں نے جرأت سنگھ سے کہا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان چار دروازوں میں سے ایک کے پیچھے کوئی درندہ ہے؟“

”درندہ نہیں ہے۔ ایک معصوم سا جانور ہے۔“

”معصوم سا جانور؟“

”یہی تو سب سے حیرت انگیز بات ہے۔ ان دروازوں میں سے جو دروازہ موت کا ہے‘ اس کے پیچھے کوئی درندہ نہیں ہے......... ایک بارہ سنگا ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ بارہ سنگا ایک بے ضرر جانور ہے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بارہ سنگا قیدی کو ہلاک کرے گا۔“

”ہلاک نہیں کرے گا۔ اس کے چیتھڑے اڑا دے گا۔ اس کی شہ رگ چبا ڈالے گا۔ آدم خور شیر کی سی درندگی سے اس کا لہو پی جائے گا۔“

مجھے جرأت سنگھ کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ ”تم نے کچھ پی تو نہیں رکھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ ”تھوڑی دیر بعد تمہیں خود پر بھی شبہ ہو گا کہ تم نے کچھ پی تو نہیں رکھا۔“

”کیا وہ کوئی خاص بارہ سنگھا ہے؟“

”نہیں عام ہے اور وہ ایک نہیں ہے‘ اس جیسے کئی ہیں جو شوراق نے اسی مقصد کے لئے تیار کر رکھے ہیں......... شوراق چاہتا تو کسی بھی درندے سے یہ کام لے سکتا تھا مگر پھر اسے شوراق کون کہتا۔ وہ جانوروں کو اپنی منشا کے مطابق چلاتا ہے اور کبھی کبھی جانوروں کو ان کی فطرت کے الٹ چلا کر دکھا دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ایک شیر کو گھاس کھانے پر مجبور کر دے اور ایک ہرن کو آدم خور بنا ڈالے۔ میں جانتا ہوں کہ تم وشواس

نہیں کر پا رہے ہو' ابھی تم اس کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔"

کچھ دیر بعد یہ عجیب و غریب اور لرزہ خیز مظاہرہ شروع ہو گیا۔ میرے دل و دماغ میں آرزو کے خیالات نے تہلکہ مچا رکھا تھا اس کے باوجود کچھ لمحے کے لئے اس مظاہرے نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ قیدیوں میں سے ایک تھائی نوجوان کو میدان میں داخل کیا گیا۔ تھائی نوجوان کا زردی مائل رنگ بالکل ہی ہلدی نظر آنے لگا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چار آہنی دروازوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک کیم شحیم مقامی شخص نے تھائی نوجوان سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی قسمت کا ایک دروازہ کھول لے۔

ایک نقارہ بڑی گونج دار آواز میں بج رہا تھا اور اس کی لے کے ساتھ ہی تماشائیوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ جرأت سنگھ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ تھائی لڑکا ایک بار آزمائش سے گزر چکا ہے۔ تین بار مزید گزر گیا تو اس کی زندگی بچ سکتی ہے۔"

تھائی نوجوان چند لمحے تذبذب کے عالم میں دروازوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی۔ چند لمحے بعد اندر سے ایک شخص دوڑتا ہوا برآمد ہوا۔ اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی اور ہاتھ میں چمکدار کپڑے کی تھیلی تھی۔ اس نے تھیلی نوجوان کے حوالے کر دی۔ نوجوان گھٹنوں کے بل گر گیا اور اپنے انداز میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

"جرأت سنگھ' اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

وہ بولا۔ "لڑکے کی جان ایک بار پھر بچ گئی ہے۔ یہ سونے چاندی کے سکوں کی تھیلی ہے۔ ڈالروں میں اس کی قدر و قیمت لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ یہ اب اس لڑکے کی ملکیت ہے' اگر یہ باقی دو آزمائشوں میں بھی زندہ رہ گیا تو پھر یہ اپنے اس مال کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے' دوسری صورت میں یہ سونا چاندی جزیرے کی انتظامیہ کے پاس واپس چلا جائے گا۔"

"باقی کے دروازوں کے پیچھے کیا ہے؟"

"یہ ذرا سسپنس ہی رہنے دو۔ تمہیں بتایا ہے ناں کہ تین دروازوں کے پیچھے انعامات کی صورت میں زندگی ہے اور ایک دروازے کے پیچھے سزا کی صورت میں

موت۔"

تماشائی بے پناہ دلچسپی سے زندگی موت کا یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ ایک ماہ کے لئے ہی سہی لیکن تھائی نوجوان کو زندگی کی ضمانت مل گئی تھی' وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ انسان بھی اپنی فطرت میں کتنا سادہ ہے' اس کے لئے غم اور خوشی کا معیار اس کی اندرونی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب موت صرف ایک ماہ کے لئے ٹل جاتی ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو جاتا ہے۔

تھائی نوجوان کے بعد ایک درمیانی عمر کا تامل باشندہ جو غالباً سری لنکا کا شہری تھا' اس کٹھن آزمائش سے گزرنے کے لئے میدان میں داخل ہوا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا وہ دروازوں کی طرف بڑھا اور پھر خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا رنگ بالکل مردے کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ کیم شحیم شخص کی طرف گھوم گیا۔ اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے اور پہریدار کی منت سماجت کر رہا ہے۔ پہریدار بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا اور آہنی دروازوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مطلب یقیناً یہی تھا کہ اس کی بات مانی نہیں جا سکتی' اسے ہر صورت ایک دروازہ کھولنا پڑے گا۔ کچھ دیر تک تامل قیدی اور پہریدار میں کشمکش رہی' پھر قیدی نے بے بسی سے دروازوں کی طرف قدم بڑھائے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے ایک دروازہ کھولا اور ڈرے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس دروازے کے اندر سے بھی زرق برق لباس والا ایک شخص دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں سیب رکھے تھے۔ زرق برق لباس والے نے ٹرے قیدی کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ غالباً خوشی کے عالم میں رونے لگا تھا۔

جرأت سنگھ نے کہا۔ "یہ شخص یہاں ایک ماہ کے لئے بہترین من پسند خوراک کا مستحق ٹھہرا ہے۔ جو بھوجن یہاں اہم ترین لوگوں کو ملتا ہے وہ اس قیدی کو بھی ملے گا۔ اس کے علاوہ ایک ماہ کے لئے یہ کھانے کی جو فرمائش بھی کرے گا وہ پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"سیبوں کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیب دراصل یہاں اچھے کھانے کی نشانی (علامت) کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ اے کلاس کوٹھڑیوں میں کچھ قیدیوں کو شاہانہ کھانا دیا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ اس آزمائش کے انعام یافتہ لوگ تھے۔

تامل قیدی خوشی خوشی باہر چلا گیا تو ایک اور تامل قیدی اندر داخل ہوا۔ یہ کچھ فربہ تھا اور ناک بھی کافی چپٹی لگتی تھی۔ اس کی عمر بمشکل چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ قدرے بااعتماد نظر آتا تھا۔ اس نے دروازوں کے قریب پہنچ کر ذرا توقف کیا' چند گہرے سانس لئے اور پھر ایک دروازہ کھول دیا۔ نتیجے کے انتظار میں لوگوں نے اپنے سانس روک لئے تاریکی میں سے حرکت نظر آئی۔ سبز چمکیلے لباس والی ایک خوبرو لڑکی برآمد ہوئی اور اس نے بڑی ادا سے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ بے ڈول تامل کے ہاتھ میں دے دیئے۔ تامل کا چہرہ خون کے دباؤ سے اور بھی سیاہ نظر آنے لگا۔ خوبرو سرخ وسپید لڑکی کا تامل کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا' وہ اب ایک خاصی مدت کے لئے لڑکی کا مالک اور مختار تھا۔ حاضرین نے شور مچا کر اور تالیاں بجا کر اس تماشے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

تامل نوجوان' سروقد لڑکی کے ساتھ تماشاگاہ سے باہر چلا گیا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ رہی تھی کہ کل مجھے قید خانے کی کوٹھڑیوں میں کچھ قیدیوں کے ساتھ لڑکیاں کیوں نظر آئی تھیں۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا غالباً دو یا تین قیدیوں کے ساتھ میں نے لڑکیاں دیکھی تھیں.........

اگلا قیدی شکل و صورت سے جنوبی بھارت کا باشندہ لگتا تھا......... اس نے بھی بڑی مشکل سے اپنی باری بھگتائی۔ اس کے چہرے پر پسینے کی چمک بہت فاصلے سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ بہت تذبذب اور سسپنس کے بعد اس نے جو دروازہ کھولا' اس میں سے زرق برق لباس والا ایک خادم ہی برآمد ہوا۔ چمکدار کپڑے والی چھوٹی سی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ سونے اور چاندی کے سکوں کی یہ تھیلی قیدی کے حوالے کر دی گئی۔

"مزا آ رہا ہے اس تماشے کا؟" جرأت سنگھ نے پوچھا۔

"خدا غرق کرے ان لوگوں کو۔ بندے کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہے پیارے' لیکن اب مجھے بھی اس کھیل میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے۔ اگر واہگرو کی کرپا سے میں یہاں سے زندہ بچ کر نکل گیا تو ایک

شت فلم کی کہانی لکھوں گا اس واقعے پر۔"

اب اگلے قیدی کو بھیجنے کی تیاری ہو رہی تھی......... اس کھیل کے سارے قواعد سمجھ میں آ چکے تھے۔ ان چار دروازوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر چار کمرے موجود تھے۔ کمروں یا کوٹھڑیوں میں جو کچھ بھی موجود تھا اس کی جگہ ہر بار تبدیل کر دی جاتی تھی۔ یا قیدی اپنی قسمت آزمانے کے لئے دروازہ کھولتا تھا تو اسے کچھ خبر نہیں ہوتی تھی اس مرتبہ اس دروازے کے عقب میں کیا ہے۔

اگلا قیدی میدان میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک نوجوان جاپانی تھا۔ سر کے بال چھوٹے ٹے تھے۔ اس نے نیکر اور شرٹ پہن رکھی تھی' وہ بھی خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ جرأت نے کہا۔ "دیکھیں اس لڑکے کی قسمت زور مارتی ہے کہ نہیں۔ یہ دو آزمائشوں میں ب ہو چکا ہے آج اس کی تیسری آزمائش ہے۔"

جاپانی نوجوان نروس بریک ڈاؤن کا شکار نظر آتا تھا۔ وہ بار بار انگلی کی مدد سے اپنی ے پسینہ پونچھتا تھا اور رحم طلب نظروں سے ان نشستوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا شوراق اپنی معزز فیملی کے ساتھ بیٹھا یہ ہولناک کھیل دیکھ رہا تھا۔ اب بہت تماشائی راستے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے تھے لہٰذا شوراق اور اس کی معزز فیملی مجھے نظر آ رہی تھی اور نہ ہی وہ چہرہ نظر آ رہا تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے میرے دل و دماغ کو ئے طوفان کے حوالے کر دیا تھا۔ جاپانی نوجوان نے دروازوں کے قریب پہنچ کر بے ے ساتھ دائیں بائیں دیکھا' پھر دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ باندھے ھ پڑھا۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر اس نے ایک دروازہ کھول دیا۔ نگاہیں ساکت اور لوگوں نے سانس تک روک رکھے تھے......... تاریکی میں حرکت پیدا ہوئی اور رہ سنگھا نکل کر باہر آ گیا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ ضبوط اور چربیلے جسم کا مالک تھا۔ تماشائیوں میں ایک شور بلند ہوا۔ کچھ چیخیں بھی ں' ان چیخوں میں خوف آمیز دلچسپی کی جھلک تھی۔ بارہ سنگھے کو دیکھتے ہی جاپانی کو اپنی موت نظر آ گئی تھی۔ وہ دہشت زدہ انداز میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ پیچھے پندرہ فٹ اونچا آہنی جنگلہ تھا جس پر نوک دار برچھیاں لگی ئی' اور پھر میری نگاہوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا' بارہ سنگھا بعین کسی

درندے کی طرح بد قسمت نوجوان کی طرف بڑھا۔ اس نے حلق سے ایک بھاری بھ
ناقابل فہم آواز نکالی اور نوجوان پر جھپٹا۔ جان بچانے کے فطری عمل کے تحت نوجوان
دوڑ لگا دی۔ مگر بارہ سنگھے کی رفتار اس سے کہیں تیز تھی۔ اس نے بھاگتے نوجوان
سینگوں کی مدد سے دھکیلا' وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا' اس کے حلق سے ڈری ڈری چیخ
بلند ہوئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے بپھرا ہوا جانور اس کے سر پر تھا۔ اس سے اگلا منظر نا
یقین تھا۔ بارہ سنگھے نے کسی گوشت خور درندے کی طرح نوجوان کی گردن پر حملہ کیا
عقب سے اس کی گردن کا گوشت دانتوں سے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ نوجوان اٹھ کر پھر ب
اس مرتبہ بارہ سنگھے نے اس کی ٹانگ پر منہ مارا اور گرا دیا۔ جاپانی نوجوان صحت مند ج
مالک تھا۔ اس نے جان بچانے کے لئے بہت زور مارا اور ایک بار پھر درندہ صفت
سنگھے کے نیچے سے نکل گیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جسم لہولہان ہو گیا
تماشائی بڑے جوش و خروش کے عالم میں یہ خوفناک کشمکش دیکھ رہے تھے۔ ان کی ن
بے رحم تھیں اور دل پتھر کے ہو چکے تھے۔

نوجوان نے دوسری مرتبہ خود کو آزاد کرایا تو سیدھا جنگلے کی طرف آیا اور ا
چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس پندرہ فٹ اونچے جنگل
وسط میں ایک اور رکاوٹ موجود ہے۔ تقریباً سات فٹ کی بلندی پر نوکدار برچھیوں کی
اور قطار بھی موجود تھی۔ یہ برچھیاں اندر کی طرف بڑھی ہوئی تھیں اور ان سے آ
قیدی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ جان بچانے کی خاطر آخری حد تک گیا' اور برچھیوں
کر اس طرح لٹک گیا کہ اس کی ٹانگیں بھی سمٹ کر اوپر چلی گئیں۔ وہ مضحکہ خیز اندا
خم دار برچھیوں کے ساتھ جھول رہا تھا اور رحم کے لئے چیخ رہا تھا لیکن نقار خانے میں
کی آواز سننے والا کون تھا؟ نوجوان کی بلندی اتنی ہرگز نہیں تھی کہ وہ درندہ صف
سنگھے کے جبڑے کی زد سے نکل جاتا۔ خونی جانور نے نوجوان کی پشت پر دانت گاڑ
غیر معمولی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زمین پر لا پٹخا۔ اس سے آگے ک
دیکھنے کے لئے فولاد کا دل درکار تھا۔ خونی جانور نے حلق سے عجیب و غریب آوازیں
ہوئے نوجوان پر پے در پے حملے کئے اور اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنے پاؤں ک
نو پنجوں کی طرح استعمال کر رہا تھا اور اس کے دانت رگ پٹھوں کو ادھیڑتے چلے

تھے۔ ایک دو منٹ کے اندر نوجوان تڑپ پھڑک کر ساکت ہو گیا اور خاک و خون میں
لتھڑا ہوا اس کا جسم پھٹے پرانے کپڑے کی طرح نظر آنے لگا۔ بارہ سنگھے کی وحشت کا یہ عالم
تھا کہ وہ بعینہٖ کسی درندے کی طرح مردہ نوجوان کی گردن کو بھنبھوڑتا اور چباتا چلا جا رہا
تھا۔ اس کی تھوتھنی خون سے سرخ تھی اور دم افقی رخ پر بالکل سیدھی نظر آ رہی تھی۔
وہ لمبا تڑنگا پہریدار بھی جنگلے کے اندر ہی موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ
خونی جانور کی طرف سے چوکس نظر آتا تھا۔

دو چار منٹ بعد خونی جانور کٹی پھٹی لاش کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا' کھلے ہوئے
آہنی دروازے کے اندر گم ہو گیا۔ پہریدار نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

"اب وشواس ہوا میری بات پر؟" جرأت سنگھ نے پوچھا۔

"تم نے اسے جادو نگری کہا تھا' شاید ٹھیک ہی کہا تھا۔ تین دن پہلے میں ایسا ہی
ایک اور انوکھا منظر دیکھ چکا ہوں۔ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر ایسے پرندوں نے خطرناک
حملہ کیا جو ہرگز انسانوں پر حملہ نہیں کرتے۔ جانتے ہو وہ پرندے کون تھے؟"

"کون تھے؟"

"ویسے ہی کوے جیسے وہ ان سامنے کے درختوں پر بیٹھے ہیں۔" میں نے ایک
طرف اشارہ کیا۔

"یہاں تم اس سے بھی انوکھے مناظر دیکھ سکتے ہو۔" جرأت سنگھ نے سر ہلایا..........

"اور اس ساری طلسم کاری کا مرکزی کردار یہی شوراق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے یہ
طاقت اس جزیرے کے بزرگ ترین باشندے اباد سے حاصل ہوئی تھی۔ اباد کی عمر اس کی
موت کے وقت ایک سو بیس سال بتائی جاتی تھی۔ اباد کے پاس کچھ پُراسرار صلاحیتیں
تھیں' ان میں سے سب سے اہم صلاحیت جانوروں سے اس کا ذہنی رابطہ تھا۔ وہ جانوروں
کو اپنی منشا کے مطابق چلانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس جزیرے کے باسیوں نے بے شمار مرتبہ
دیکھا تھا کہ بوڑھے اباد کے ایک اشارے پر بہت سے جانور جنگل اور پانی سے نکل کر اس
کے روبرو آ جاتے تھے' مگر اباد گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی
یہ شکتی دکھانے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا' مگر پھر ایک وقت آیا کہ اسے اپنی یہ مہان شکتی
دکھانا پڑی۔ اس نے اپنی یہ مہان شکتی شوراق کی مدد سے دکھائی اور یہی وہ دن تھا جب

شوراق جو ایک عام سا شخص تھا اس جزیرے کا حکمران بنا.........."

"تمہارا مطلب ہے کہ شوراق کو یہ پُراسرار صلاحیت اس معمر شخص کی طرف سے حاصل ہوئی ہے۔"

"ہاں.......... لیکن یہ صلاحیت یا شکتی کچھ شرطوں کے ساتھ شوراق کو ملی تھی۔ اگر وہ ان شرطوں کی خلاف ورزی کرے گا تو یہ شکتی اس سے چھن جائے گی اور یہی شکتی شوراق کی حکمرانی کی اصل وجہ ہے' ورنہ جزیرے کے عام لوگ شوراق کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

"تم ایک پڑھے لکھے شخص ہو جرأت سنگھ' تمہارا کیا خیال ہے یہ شکتی مسمریزم یا ہپناٹزم وغیرہ کی کوئی شکل ہے؟"

"یہی کھوجنے کے لئے تو میں یہاں پہنچا تھا سجن پیارے۔" جرأت سنگھ نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے.......... پھر کسی وقت سناؤں گا ابھی تم تماشا دیکھو۔"

اس دوران میں ایک گھڑیال زور زور سے بجنے لگا۔ جرأت سنگھ چونک گیا۔ جم کر بیٹھے ہوئے تماشائی بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آگئے اور اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "جیسے ہمارے ہاں فلم کے دوران میں ہاف ٹائم ہوتا ہے' یہ بھی ہاف ٹائم ہے بیس تیس منٹ کا وقفہ ہوگا۔"

میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا' واقعات اتنی سرعت سے رونما ہو رہے تھے کہ دماغ چیخ کر رہ گیا تھا۔ میری نگاہوں میں ابھی تک آرزو کی شکل گھوم رہی تھی۔ بھاری بھرکم کامدار لباس اور جڑاؤ زیورات سے لدی پھندی وہ جیسے ایک بھاری بھرکم بوجھ تلے کراہ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ہوش وحواس کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک جرأت سنگھ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بولا۔ "اچھا اس ہاف ٹائم کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں تمہیں مختصراً بتاتا ہوں کہ میں یہاں کیسے پہنچا۔ دراصل نو دس مہینے پہلے میری نظر سے ایک امریکن رسالے کا آرٹیکل گزرا۔ اس آرٹیکل میں جیمز نامی

ایک جہازراں نے سری لنکا کے نواحی سمندر کا احوال بڑی تفصیل سے بیان کیا تھا اور ایک ایسے جزیرے کا ذکر بھی کیا تھا جس پر آج تک بہت کم لوگ پہنچے ہیں۔ اس جزیرے کو جیمز نے ایکس فور کا نام دیا تھا اور بتایا تھا کہ اس نہایت دشوار گزار اور الگ تھلگ جزیرے میں کچھ ایسے لوگ آباد ہیں جو باہر کی دنیا سے بالکل کٹے ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ ایک سنسان سمندر میں رہتے ہیں' اس لئے بہت کم لوگوں کا اس جزیرے تک جانا ہوتا ہے۔ کچھ لانچوں اور کشتیوں وغیرہ کے غائب ہو جانے کے بعد اس سارے سمندر کو منحوس اور خطرناک قرار دیا جانے لگا ہے' لہٰذا لوگ اس طرف رخ ہی نہیں کرتے۔ اپنے اس آرٹیکل میں جیمز نے ایک تیس سال پرانی ڈائری کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ ڈائری تیس سال پہلے ایک راہ بھٹکے ہوئے اسٹیمر کو سمندر سے ملی تھی۔ اس ڈائری کے ساتھ کچھ دیگر کاغذات بھی تھے۔ یہ سب کچھ پولتھین کے دہرے لفافے میں بند تھا اور نہ جانے سمندر میں کہاں سے تیرتا ہوا آیا تھا۔ اس ڈائری کا تعلق ایک مہم جو سے تھا۔ اس مہم جو نے بتایا تھا کہ وہ ایک ایسے جزیرے پر قید ہے جہاں بالوں والے نہایت بدبودار اور سفاک لوگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بوگال قرار دیتے ہیں۔ مقامی زبان میں بوگال کا مطلب 'انوکھا' ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر ایک ایسا شخص حکومت کرتا ہے جو ہپناٹزم کا ماہر ہے۔ اس شخص کی یہ صلاحیت بہت خاص قسم کی ہے' وہ انسانوں کو نہیں جانوروں کو اپنا معمول بناتا ہے۔ جانور غیر مشروط طور پر اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے لئے خود کو بلا دریغ قربان کر دیتے ہیں۔ اس جزیرے کی حفاظت بھی جانور ہی کرتے ہیں۔ جو بدقسمت ایک مرتبہ اس جزیرے پر آجاتا ہے پھر اس کے لئے زندہ سلامت نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ جو فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے وہ جزیرے پر ہی خونخوار کتوں یا بھیڑیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے یا نواحی سمندر میں کوئی آبی جانور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے..........

"اس ڈائری کے کچھ اہم مندرجات شائع کرنے کے بعد جیمز نے لکھا تھا کہ چند ماہ پہلے اس نے خود بھی اس جزیرے کی تلاش میں کھلے سمندر کے اندر کئی ہفتے سفر کیا۔ اس علاقے میں چھوٹے بڑے بے شمار جزیرے ہیں۔ جیمز اپنے ایک ساتھی فوٹوگرافر کے ہمراہ کئی ایک جزیروں پر اترا اس سلسلے میں اس نے تیس سال پرانی ڈائری کی معلومات سے کا مدد لی۔ ڈائری لکھنے والے نے جو چند ایک اشارے جزیرے کے متعلق دیئے تھے' ان

میں ایک اشارہ یہ بھی تھا کہ مشرق کی طرف سے آئیں تو جزیرہ دور سے گھوڑے کے منہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جیمز قریباً ڈھائی ماہ کی تلاش کے بعد ناکام واپس چلا گیا تھا۔“

”اس کے بعد تم نے اس پاگل جیمز کی جگہ سنبھال لی؟“ میں نے جرأت سنگھ سے پوچھا۔

”بس یہی سمجھ لو۔ میں فطری طور پر ایک مہم جو سردار ہوں۔ واہگرو کی کرپا سے بہت دور دور تک گیا ہوں۔ سندر بن، نانگا پربت، ہمالیہ، راجستھان پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھان چکا ہوں۔ بس یہاں بھی خاک چھاننے چلا آیا۔ میرے ساتھ تین اور بھی بندے تھے۔ ان میں سے دو تو چار چھ ہفتے بعد واپس چلے گئے لیکن میں اور میرا ایک پرانا یار کرنل راکیش اپنی جستجو میں لگے رہے۔ بس پھر ایک دن ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ہماری تلاش ختم ہو گئی بلکہ کرنل راکیش کی تو ساتھ میں زندگی بھی ختم ہو گئی۔ وہ مارا گیا۔“

”کیسے؟“

”بس یار! اب پرانے زخم تازہ مت کر۔“

”پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔“

”اچھا پھر کسی وقت بتاؤں گا.......... اب ذرا آگے دیکھ تماشا پھر شروع ہونے والا ہے۔“

جرأت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تماشائی پھر اپنی نشستوں پر براجمان ہو رہے تھے اور گھڑیال بجنا شروع ہو گیا تھا۔ قیدی ہماری جانب پشت کئے بیٹھے تھے ان کی صورتیں نظر نہیں آتی تھیں مگر جب اپنی باری آنے پر وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے اعصاب بری طرح کشیدہ ہیں۔ رائفل بردار محافظ انہیں دھکیل کر اکھاڑے میں داخل کرتے تھے۔ اس مرتبہ جو قیدی اندر داخل ہوا اس کی تقدیر دیکھنے کے لئے لوگ بڑے مضطرب تھے۔ جرأت سنگھ نے مجھے بتایا کہ یہ شخص تین آزمائشوں سے گزر چکا ہے اور یہ اس کی آخری آزمائش ہے۔ جب وہ شخص دروازوں کی طرف بڑھا تو بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ تماشائیوں کے دل بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسی خاموشی تھی کہ سانسوں کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ یہ جواں سال شخص پہلے ایک دروازے کے پاس گیا۔ پھر

دوسرے کے پاس، پھر مڑ کر پہلے دروازے کے پاس آیا۔ اس کا ہاتھ دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے رک جاتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اس جاں گسل کشمکش کا شکار رہا، پھر اس نے آگے بڑھ کر تیزی سے ایک دروازہ کھول دیا اور چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی کھڑکی سے ایک سروقد لڑکی لہراتی بل کھاتی نکلی اور اس نے اپنے ہاتھ قیدی کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ تماشائیوں کی طرف سے شور بلند ہوا۔ کتنی ہی دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔ خوش قسمت قیدی کو ایک خوبرو مقامی لڑکی کے ساتھ ساتھ زندگی بھی مل گئی تھی۔ وہ شاید خوشی سے رونے لگا تھا، کئی افراد اس کے گرد اکٹھے ہو گئے پھر اسے لڑکی سمیت میدان سے باہر لے گئے۔

زندگی اور موت کا یہ کھیل جتنا عجیب تھا اتنا ہی حیرت انگیز بھی تھا۔ کہیں غم کی انتہا دیکھنے میں آ رہی تھی کہیں خوشی کی انتہا۔ میں نے جرأت سنگھ سے پوچھا۔ ”کیا اس بندے کو آزاد کر دیا جائے گا۔“

اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ بولا۔ ”سمجھدار بندے ہو لیکن سوال احمقانہ کیا ہے۔ یہاں سے جانا ہماری قسمت میں نہیں ہے، جان ہی بچ جائے تو بڑی بات ہے۔ یہ شخص اب آزاد ہے لیکن رہے گا اس جزیرے میں ہی، بھاگنے کی کوشش کرے گا تو پھر آزمائش سے گزرنے کی نوبت نہیں آئے گی فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ تم نے کل ایک بھیڑیا دیکھا تھا ناں شوراق کے ساتھ؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”وہ بھیڑیا اکثر جلاد کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اسے ایک دو روز بھوکا رکھ کر مجرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی خونخوار پالتو کتوں کی دعوت بھی ہوتی ہے۔“

اگلا قیدی شکل و صورت سے کوئی سری لنکن ماہی گیر نظر آتا تھا۔ اس کا جسم کمزور اور رنگ سنہالی لوگوں کی طرح زردی مائل سانولا تھا۔ وہ بے چارہ شاید راستہ بھٹک کر یا کسی سمندری طوفان کی زد میں آ کر اس قاتل جزیرے تک آ پہنچا تھا۔ جرأت سنگھ نے بتایا کہ اس شخص کی دوسری آزمائش ہے۔ اس لرزتے کانپتے سنہالی نے غلط دروازہ کھولا۔ خوفناک شکل والا ایک طاقتور بارہ سنگھا دروازے سے برآمد ہوا اور موت بن کر دہشت

زدہ سنہالی پر جھپٹ پڑا۔ دو تین منٹ کے اندر سنہالی کی جگہ اس کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔

اگلا قیدی بھی بدقسمت نکلا۔ اس نے جنگلے کے اندر سخت بھاگ دوڑ کی۔ کئی منٹ تک اس کی چیخیں اور فریادیں تماشا گاہ میں گونجتی رہیں۔ اس کا لباس خونی جانور کے ساتھ جدوجہد میں تار تار ہوگیا اور وہ مادر زاد برہنہ ہوگیا۔ اس حالت میں بارہ سنگھے نے ناف کے قریب سے بدقسمت قیدی کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور پھر اس کی گردن دبوچ کر بالکل درندے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر یہ شخص بھی ہلاک ہوگیا۔

اوپر تلے دو افراد کی لرزہ خیز موت کے بعد تماشا گاہ میں سنسنی کی بلند لہر دوڑ گئی تھی۔ اذیت پسند تماشائیوں کو ان نظاروں نے جوش و خروش سے بھر دیا تھا۔ شاید ان میں سے تھوڑے بہت ایسے بھی ہوں جو خوش نہ ہوئے ہوں مگر زیادہ کے چہرے اس دلچسپ تماشے سے کھلے ہوئے تھے۔ ان تماشائیوں میں بچے تو نہیں تھے مگر چودہ پندرہ سال تک کے لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ لڑکوں کے بال بھی لڑکیوں کی طرح شانوں پر لٹک رہے تھے۔ ان کے میلے کچیلے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں جھول رہی تھیں۔ دانت میلے اور گندے تھے۔ اکثر لوگوں کی ناک چپٹی اور رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔

جس اگلے قیدی کو میدان میں لایا گیا وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ اسے پہریداروں نے باقاعدہ اٹھا کر اکھاڑے میں داخل کیا۔ قیدی کی صورت دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ چند لمحوں کے لئے تو نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ پراتھا تھا۔ عظیم پراتھا۔ ہماری لانچ کا ڈرائیور...... جو کئی ہفتے ہمارے ساتھ ہی سمندر میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ پرسوں جس وقت ہم نے اپنی لانچ پر مگرمچھوں کی خونریزی دیکھی اور ہمارے پُراسرار ہمدردوں نے ہمیں بتایا کہ گھڑسوار ہم پر حملہ کرنے کے لئے آرہے ہیں تو ہم کیمپ کی طرف بھاگے تھے۔ کاشف اور میں آگے تھے جب کہ پراتھا پیچھے تھا۔ کیمپ میں پہنچ کر ہم نے دیکھا تھا تو پراتھا غائب تھا...... آج وہ بھی اس قتل گاہ میں نظر آرہا تھا۔ جرأت سنگھ نے بھانپ لیا۔ سرگوشی میں بولا "کہیں یہ بندہ تمہارے ساتھیوں میں سے تو نہیں۔"

"نہیں ساتھی تو نہیں۔ مگر اجنبی بھی نہیں۔ یہ اس لانچ کا ڈرائیور ہے جس پر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔"

پراتھا اکھاڑے میں داخل ہوتے ہی جنگلے سے چمٹ گیا تھا اور چیخ و پکار کر رہا تھا۔ اکھاڑے یعنی Ring کے اندر موجود لحیم شحیم پہریدار پراتھا کو کھینچ کر جنگلے سے دور لے گیا' وہ اسے سمجھانے لگا کہ اسے چاروں دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولنا ہے اور ہر صورت کھولنا ہے۔ پراتھا مسلسل انکار میں سر ہلا رہا تھا اور پہریدار سے بحث کر رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک دونوں میں زوردار تکرار ہوتی رہی' پھر پہریدار پراتھا کو تقریباً گھسیٹ کر دروازوں کے پاس لے گیا' فربہ اندام پراتھا' اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ وہ کبھی پہریدار کی منت سماجت کرنے لگتا' کبھی اس سے جھگڑنے لگتا۔ آخر وہ زمین پر لیٹ گیا اور واویلا شروع کردیا اس کی حالت قابل رحم نظر آرہی تھی۔ دراصل اس سے پہلے کی دو دردناک موتیں دیکھنے کے بعد پراتھا میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دروازہ کھول سکتا۔

جب وہ کسی طرح بھی دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں ہوا تو تین چار مزید پہریدار اندر اخل ہوگئے۔ وہ سب پراتھا کو اٹھا کر دروازے کے پاس لے گئے اور اسے مجبور کرنے ئے کہ وہ ایک دروازہ کھولے۔ ایک دم پراتھا پر دورہ سا پڑ گیا۔ اس نے ایک پہریدار کو ور دار دھکا دے کر دیوار سے ٹکرا دیا اور دوسرے کی رائفل چھیننے کی ناکام کوشش رنے کے بعد جنگلے کی طرف بھاگا۔ فربہ جسم کی وجہ سے کچھ آگے جا کر وہ گر گیا۔ اس کی م ہمتی اس کے لئے زیادہ مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ پرسوں بھی اگر وہ ہمارے ساتھ رہتا شاید اس جان لیوا مصیبت کا شکار نہ ہوتا۔ اب پھر وہ پہریداروں سے الجھ کر صورت حال خراب تر کر رہا تھا۔ اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کی کم از کم مجھے تو ہرگز توقع نہیں تھی۔ یدار اکھاڑے سے باہر نکل گئے۔ صرف لحیم شحیم پہریدار رہ گیا۔ اس نے پراتھا کو اس حال پر چھوڑا اور آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھول دیا۔ اس دروازے میں سے جو چیز وہ پراتھا کی موت تھی۔ ایک قد آور بارہ سنگھا غراتا ہوا خوفناک انداز میں پراتھا پر ...... پراتھا کی فلک شگاف چیخیں تماشائیوں کے لذت آمیز شور میں دب کر رہ گئیں۔ پانچ منٹ کے لئے زندگی اور موت کے درمیان ہولناک کشمکش ہوئی' پھر حسب توقع ت غالب آگئی اور زندگی لہولہان ہو کر اور ٹکڑوں میں بٹ کر میدان میں بکھر گئی۔ وہ باجود دو روز پہلے تک ہمارے ساتھ تھا اب "وجود" سے عدم میں جا چکا تھا۔ اپنی بیوقوفی

اور کم ہمتی کے سبب اس نے موت کے پچیس فیصد امکان کو سو فیصد میں بدل دیا تھا' اس کی بدقسمتی پر میرا دل اندر سے رونے لگا تھا..........

☆==========☆==========☆

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آج سرشام تماشا گاہ میں جو ناقابل فراموش خونی مناظر میں نے دیکھے تھے وہ آٹھ دس گھنٹے گذرنے کے باوجود ابھی تک ذہن میں تازہ تھے اور میری سوچوں کو زخمی کر رہے تھے۔ پراتھا کی آخری چیخیں جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور زمین پر بکھری ہوئی اس کی نیلی نیلی آنتیں.......... اف خدایا۔ تو نے انسانی آنکھ کے لئے کیسے کیسے عذاب رکھے ہوئے ہیں۔

میں بہت دیر تک یہ عذاب جھیلتا رہا اور ان خونی بارہ سنگھوں کے بارے میں سوچتا رہا جو یہاں کے پُراسرار حکمران نے ایک خوفناک شوق کے لئے پال رکھے تھے.......... پھر ان زخمی سوچوں پر بتدریج ایک چہرہ غالب آگیا۔ یہ آرزو کا چہرہ تھا۔ آج شام میں نے جہاں آنکھوں کا عذاب جھیلا تھا وہاں نگاہ کی معراج بھی پائی تھی۔ میں نے آرزو کو دیکھا تھا اور جب سے دیکھا تھا دل و دماغ کے ایک حصے پر صرف اور صرف وہی حاوی تھی۔ میرا دل واشگاف اعلان کر رہا تھا کہ میں آرزو سے ملا ہوں تو یہ کسی اتفاق کے تحت نہیں ہوا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی ہے' اور یہ منصوبہ بندی کرنے والا صرف اور صرف کاشف ہے۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ کاشف کو بہت پہلے آرزو کے متعلق کوئی سراغ مل چکا تھا اور اس سراغ کے پیچھے چلتے ہوئے شاید.......... وہ ہم کو جزیرہ جزیرہ بھٹکا رہا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر سوچنے کی بات تھی کہ اس نے مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟ کیا وہ مجھے کوئی زبردست سرپرائز دینا چاہتا تھا یا پھر.......... یا پھر.......... اس سے آگے میرے لئے سوچنا بھی محال تھا۔ کاشف میرا ایک ایسا دوست تھا جس پر میں نے بچپن سے لے کر اب تک آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا تھا۔ میں اس کے بارے میں منفی سوچ بھی ذہن میں لاتا تو یہ میرے نزدیک بہت بڑا گناہ ہوتا۔

پھر میرے ذہن میں وہ گفتگو آنے لگی جو میں نے کچھ دن پہلے کاشف اور راجا کے درمیان سنی تھی۔ اس گفتگو سے مجھ پر عیاں ہوا تھا کہ ہمارے ایبٹ آباد اور حویلیاں چھوڑنے سے دو تین دن پہلے کاشف کی ملاقات پیر شاہ جی سے ہوئی تھی۔ کاشف نے

اہم بات بھی مجھ سے چھپائے رکھی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پیر شاہ جی نے ہی کاشف کو آرزو کے بارے میں کوئی اشارہ دیا ہو۔

میں اس بارے میں جتنا سوچ رہا تھا میرا دماغ الجھتا چلا جا رہا تھا.......... آج شام جرأت سنگھ نے مجھ پر یہ تہلکہ خیز انکشاف کیا تھا کہ آرزو شوراق کی محبوبہ ہے۔ بعد ازاں جب میں چیختا چلاتا آرزو کے قریب گیا تھا تو میں نے آرزو کو بھاری بھرکم کپڑوں اور زیورات میں دبا ہوا پایا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر نظر آنے والی حیرت اور بے چارگی ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھی۔ تماشا گاہ سے واپس آنے کے بعد میں نے چاہا تھا کہ جرأت سنگھ سے آرزو اور شوراق وغیرہ کے بارے میں کچھ مزید معلوم کر سکوں مگر واپس آتے ہی جرأت سنگھ نے شراب کی نصف بوتل بغیر پانی ملائے غٹاغٹ چڑھالی تھی اور ٹاغفیل ہو کر لیٹ گیا تھا' اب رات کے دو بج چکے تھے اور اس کا نشہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

صبح تین چار بجے کے لگ بھگ میں نے پانی کے چھینٹے دے دے کر اسے جگایا.......... دس پندرہ منٹ بعد ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہوا جہاں سے تماشے کی وجہ سے منقطع ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "جرأت' تم نے شام کو تماشا گاہ میں ایک خوبرو لڑکی دکھائی تھی اور بتایا تھا کہ وہ شوراق کی محبوبہ ہے۔ اگر وہ شوراق کی محبوبہ ہے تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ وہ یہاں کا حکمران ہے اور سیاہ سفید کا مالک ہے۔"

جرأت بولا۔ "مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ شادی کیوں نہیں کرتا' لیکن ایک بات مجھے بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ شوراق اپنی پہلی بیوی کو ناراض کرنے کا رسک بہت سوچ سمجھ کر ہی لے گا۔ اس کی بیوی جس کا نام قاروبا ہے اس محترم بزرگ کی بیٹی ہے جس نے آج سے کوئی تیس سال پہلے شوراق کو اس شکتی سے نوازا تھا جس نے اسے اب تک جزیرے کا حکمران بنا رکھا ہے۔ مجھے ٹھیک سے جانکاری نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ شوراق اپنی پہلی پتنی ہی کے ڈر سے دوسری شادی نہ کر رہا ہو۔"

"اس کی محبوبہ کون ہے۔ یہ لڑکی مقامی تو ہرگز نہیں لگتی۔" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن وہ ہے بڑی سندر۔ اگر تم اس کو قریب سے دیکھ لو تو مدہوش ہوئے بغیر نہ رہ سکو۔ پتہ نہیں کہ وہ اس جادو نگری میں کیوں اور کیسے پہنچی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہو۔"

"تم اس لڑکی کو کب سے یہاں دیکھ رہے ہو؟"

"میں نے تو کوئی چار پانچ ماہ پہلے ہی دیکھا تھا' پتہ نہیں وہ کب سے یہاں ہے لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ویسے ہی ذہن میں آ رہا تھا کہ طاقتور ترین اور بااختیار ترین لوگوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"ہاں بھئی۔ ہے تو واقعی مجبوری۔ اتنی سندر چھوکری اس کے قبضے میں ہے اور وہ اس سے دور رہنے پر مجبور ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے کل شام اپنے ایک ساتھی کرنل راکیش کا ذکر کیا تھا جو اس جزیرے پر آنے کے بعد موت کے گھاٹ اتر گیا۔"

"ہاں۔ میں تو اس کو بھی اپنی جرأت بلکہ جرأت سنگھ کا شکار کہوں گا۔ نہ میں جیمز کی کہانی کی کھوج میں نکلتا نہ اس جزیرے پر پہنچتا اور نہ کرنل کی جان جاتی۔"

"کرنل کے ساتھ ہوا کیا تھا؟"

"ہم جزیرے پر رات کے وقت پہنچے تھے۔ ہم نے اپنی موٹر بوٹ جزیرے کے ساحل سے لگا دی۔ اس کی روشنیاں بجھا دیں اور فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں جزیرے پر اتریں گے۔ ہمیں ہرگز خبر نہیں تھی کہ ہم جزیرہ جزیرہ بھٹکتے آخر اس پُراسرار جزیرے پر آ پہنچے ہیں۔ جس کی ہمیں تلاش تھی......... ہم اپنی موٹر بوٹ کے اندر ہی کیبن کو مقفل کر کے سو گئے۔ رات کسی وقت خوفناک مگرمچھوں کے جم غفیر نے ہم پر یلغار کر دی۔ موٹر بوٹ ٹوٹ گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کرنل راکیش کو ایک مگرمچھ کے جبڑوں میں تڑپتے دیکھا......... میری ٹارچ کی روشنی کرنل کے چہرے پر تھی۔ اس نے آخری بار جن حسرت ناک نظروں سے میری طرف دیکھا تھا شاید میں جیون بھر ان نظروں کو بھول نہ پاؤں۔ میں نے اس خونی جانور پر اپنی چھوٹی نال کی چینی رائفل سے فائر کئے تھے' مگر وہ بڑی موٹی کھال کا درندہ تھا۔ کرنل کو دو ٹکڑے کر کے ہی رہا تھا۔ پھر چند لمحے بعد میں خو

ھی ایک مگرمچھ کے جبڑوں میں چلا گیا تھا۔ میں اسے اپنی بہادری نہیں کہوں گا' بس یہ ابرو کی کرپا تھی یا کچھ اور تھا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں نے اپنی رائفل بالکل آخری وقت یں خونی درندے کے جبڑوں میں اس طرح پھنسا دی کہ وہ جبڑے کو پوری طرح بند نہ کر کا۔"

جرأت سنگھ نے اپنی پاجامہ نما پتلون ران تک اٹھائی اور مجھے کچھ گہرے زخموں کے نشان دکھائے۔ ایسے ہی کچھ نشان اس کے کندھے پر بھی تھے۔

وہ بولا۔ "یہ نشان اسی واقعہ کی نشانی ہیں۔ میں مگرمچھ کے منہ میں پھنسا ہوا تھا' مگر حرامی اپنا منہ پوری طرح بند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی مجبور تھا میں بھی مجبور تھا۔ وہ مجھے نہیں سکتا تھا' میں اس کے منہ سے نکل نہیں سکتا تھا۔ پتہ نہیں کہ تم وشواس کرو گے یا یں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں پورے تین گھنٹے اس درندے کے ساتھ زندگی موت کی لڑتا رہا۔ میرے لیکھ اچھے تھے' کہ دن کی روشنی پھیل گئی اور پہریداروں کی ایک ٹولی مجھے دیکھ لیا۔ انہوں نے گولیاں چلا کر مگرمچھ کو ختم کیا اور مجھے اس کے منہ سے نکال ۔ اس وقت تک میں نیم بے ہوش ہو چکا تھا......... شاید تمہارے دماغ میں یہ سوال آیا کہ میں بھی تو اس جزیرے پر گرفتار ہونے والا ایک قیدی ہوں پھر مجھے ار دروازوں" والی خوفناک آزمائش سے کیوں نہیں گذارا گیا' تو اس کا جواب یہی ہے مجھ سے ان لوگوں نے خاص رعایت کی ہے اور اس رعایت کی وجہ یہی ہے کہ میں تین گھنٹے تک اپنی زندگی بچانے کے لئے ایک درندے کے ساتھ جدوجہد کی' اور اس منہ میں جا کر بھی زندہ واپس آ گیا۔ اب مجھے اس کوٹھری میں پھینک دیا گیا ہے۔ شاید ار مہینے مجھے مزید سزا بھگتنا ہو گی اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ مجھے جزیرے پر آزادی گھومنے پھرنے کی اجازت مل جائے۔"

جرأت سنگھ کی جرأت مندانہ روئیداد سننے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ تین دن جزیرے کے ساحل پر ہمارے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہو چکا ہے۔ میں جرأت سنگھ کو سورن عرف پہلوان کی دردناک ہلاکت کا واقعہ بتایا۔ جرأت سنگھ اپنا سر میں ہلاتا رہا۔ وہ میرے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں کن حالات میں اس منحوس جزیرے تک پہنچا ہوں۔ میں نے اسے

کچھ باتیں بتا دیں اور جو نہیں بتانا تھیں وہ صفائی سے چھپالیں.......... وہ بولا۔ ”تمہارا نام جلال ہے۔ چندی گڑھ میں میرے ایک کرکٹر یار کا نام بھی جلال تھا۔ مگر وہ بڑا صاف گو بندہ تھا۔ تمہاری طرح ادھوری باتیں نہیں کرتا تھا۔ اور نہ ہی کچھ چھپاتا تھا مجھ سے۔“

”میں نے کیا چھپایا ہے یار۔“

”تھوڑا تھوڑا بتایا ہے‘ تھوڑا تھوڑا چھپایا ہے۔“

”تم بھی تو اس طرح آدھی باتیں ہی کرتے ہو.......... کل شام تم مجھے شوراق کے بارے میں بتا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس جزیرے کے معمر ترین شخص کی طرف سے شوراق کو جو شکتی ملی ہے اور جس سے وہ جانوروں کو تابع بناتا ہے وہ مسمریزم ہی کی کوئی شکل ہے۔“

”یہ میں نہیں کہہ رہا تھا‘ تم کہہ رہے تھے۔ بہرحال یہ بات ایسی بے وزن بھی نہیں ہے۔ تم نے شوراق کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ کیا وہ عام انسان کی آنکھیں لگتی ہیں؟ ان کی چمک کم از کم میرے لئے تو ایک بالکل انوکھی شے ہے۔“

”تم درست کہہ رہے ہو۔ شوراق کی آنکھیں بہت بڑی ہیں اور بہت غیر معمولی بھی۔“

”میں نے کئی بار جرأت کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے اور ہر بار بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوتی ہے.......... ہمیں ماننا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ انوکھا ہے اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے میں۔“

”یعنی تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ ایک خاص قسم کا ہپناٹسٹ ہے جو صرف حیوانات کو ہپناٹائز کرتا ہے۔“

”ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے یار.........“ جرأت سنگھ نے کہا۔ ”اس سنسار میں اس کائنات میں بہت کچھ ایسا ہے جو ابھی انسان کی عقل سمجھ سے باہر ہے۔ جو چیز سائنس کی رُو سے ثابت نہیں کر سکتے اسے جھٹلا دینا بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ سائنس ابھی خود اپنا آپ کھوجنے میں مصروف ہے.......... میں پچھلے آٹھ ماہ سے یہاں رہ رہا ہوں میں نے اگر اس جزیرے کو جادو نگری کہا ہے تو یونہی نہیں کہہ دیا۔ میں نے یہاں بہت کچھ ایسا دیکھا ہے کہ اگر میں باہر کی دنیا میں جا کر اس کے بارے میں بتاؤں تو لوگ مجھے

سمجھ کر پتھر مارنے لگیں۔ اس کی ایک مثال کل شام تمہارے سامنے بھی آ چکی ہے۔ تم نے کل جو بارہ سنگھے دیکھے ہیں کیا تم انہیں آدم خور درندوں سے کم رتبہ دے سکتے ہو؟“

میں نے بے ساختہ نفی میں سر ہلادیا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے‘ اور اس جادو نگری کے اسراروں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف رہے لیکن یہ گتھی ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے سلجھ جاتی.......... میرے ذہن میں رہ رہ کر اکبر خان جولیا اور راجا کا خیال آ رہا تھا۔ کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کاشف کی گمشدگی بھی ایک معمہ تھی۔ وہ پیشاب کے لئے کھوہ سے نکلا تھا اور یوں اوجھل ہوا تھا جیسے کبھی میرے آس پاس تھا ہی نہیں۔

دوپہر کو بادل گھر کر آئے اور جزیرے پر بارش شروع ہوگئی۔ سلاخ دار کھڑکی سے باہر وسیع احاطے میں پام کے دو بلند درخت بارش اور ہوا سے جھوم رہے تھے۔ دو پُرجوش پریمیوں کی طرح وہ بار بار لہرا کر ایک دوجے کے قریب آتے۔ ایک دوسرے کا بوسہ لیتے اور پھر دور ہٹ جاتے۔ پھر بارش اور ہوا کے کچھ جھونکے ایسے آئے کہ انہوں نے دونوں درختوں کو بغل گیر کردیا۔ میرے ذہن میں آرزو کا لچکیلی شاخ کا سا سراپا اجاگر ہونے لگا۔ اس کی جھیل آنکھیں‘ اس کے نازک ہونٹ اس کے لمبے ریشمی بال.......... وہ میرے حواس میں سمائی ہوئی تھی۔ ہر اچھی خوشبو‘ ہر اچھا منظر‘ ہر ریشمی لمس اور ہر رسیلی آواز مجھے اس کی یاد دلا دیتی تھی۔

جزیرے کے سرسبز طول و عرض پر سارا دن موسلا دھار بارش برستی رہی اور میں سارا دن آرزو کو یاد کرتا رہا۔ میں اسے پھر دیکھنا چاہتا تھا‘ اس سے بات کرنا چاہتا تھا میں چاہتا تھا کہ اس کے حالات جانوں اور حالات کے اس شکنجے سے اسے نکالنے کے لئے جان کی بازی لگادوں.......... مگر وہ کہاں تھی۔ کسی چھت کے نیچے کن دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ آہ میں اس کے پاس پہنچ کر بھی اس سے دور تھا۔ بارش شام کے بعد بھی جاری رہی۔ جرأت سنگھ بڑے موڈ میں تھا۔ وہ پانی کی طرح شراب پی رہا تھا۔ نشے میں مدہوش ہو کر وہ کبھی گانے لگتا تھا کبھی رونے لگتا تھا۔ رات کے دس گیارہ بجے کا عمل تھا۔ تین چار مقامی پہریدار کوٹھڑی سے باہر نظر آئے۔ انہوں نے اپنے لباس کو بارش سے بچانے کے لئے برساتی ٹائپ کے چغے پہن رکھے تھے۔ یہ چغے انہیں سر سے لے کر پاؤں تک ڈھانپے

ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اشارے سے کہا کہ میں جوتا پہن لوں۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ مجھے کوٹھری سے باہر نکالا گیا اور برساتی نما چغہ مجھے بھی پہنا دیا گیا۔

یہ پہریدار کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ صرف ایک پہریدار کے پاس ریوالور تھا۔ ان لوگوں نے مجھے چلنے کا حکم دیا۔ میں اے کلاس کوٹھڑیوں کے سامنے سے گذرا۔ اکثر کوٹھڑیوں کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھڑی کا مکیں شراب کے نشے میں چُور ہو کر بھدی آواز میں گا رہا تھا اس کی بغل میں ایک لڑکی دبی ہوئی تھی۔

پہریدار مجھے قید خانے سے باہر لائے اور پھر درختوں کے درمیان ڈیڑھ دو سو گز فاصلہ طے کر کے ایک باغیچہ نما مقام پر لے آئے۔ یہاں ناریل اور کیلے کے درخت بھی کثرت سے نظر آ رہے تھے۔ بون بیلیں درختوں کے تنوں سے لپٹی ہوئی تھیں' یہ سب کچھ مسلسل برستی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ اچانک مجھے ایک درخت کے نیچے ایک نسوانی ہیولا نظر آیا۔ یہ ہیولا بھی سر تا پا براتی نما لباس میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں غور سے دیکھا اور میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ آرزو تھی' اس کے پنکھڑیوں سے ہونٹ لرز رہے تھے اور رخساروں پر موتی تھے' پتہ نہیں کہ یہ آنسو تھے یا بارش کے قطرے۔

آرزو نے پہریداروں کو اشارہ کیا۔ وہ الٹے قدم چلتے پیچھے ہٹے اور پھر درختوں میں اوجھل ہو گئے۔ "آرزو!" میں نے بے اختیار ہو کر اس کے ہاتھ تھامنا چاہے۔

وہ تڑپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں جلال۔" اس کے حسین ہونٹوں سے جانی پہچانی آواز نکلی۔ "مجھے مت چھوئیں۔ میں اس قابل نہیں کہ آپ مجھے چھو سکیں......... میں آپ سے بہت دور جا چکی ہوں جلال۔ آپ سمجھیں کہ میری دنیا اور ہے' آپ کی دنیا اور۔ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں آرزو۔ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کہاں ایبٹ آباد کی وہ پولیس چوکی اور کہاں بحر ہند کا یہ دور دراز جزیرہ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا آرزو۔ میں اس طرح سوچتا رہا تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں جلال۔ خود مجھے بھی کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کیسے پہنچی

ہوں......... بس یوں لگتا ہے کہ ایک طویل نیند تھی جس کے بعد جاگی ہوں تو خود کو یہاں پایا ہے......... پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ اس واقعے کو کئی برس گذر چکے ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں۔"

"پہلے آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ آ......... آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

"بس یوں سمجھیں آرزو! کہ میں بھی ایک طویل نیند سویا ہوا تھا۔ بڑی اذیت ناک نیند تھی۔ ہر پل ایک خنجر کی طرح میرے سینے میں اتر رہا تھا۔ اب آنکھ کھلی ہے تو خود کو یہاں پا رہا ہوں۔"

آرزو نے عجیب سی بے بس نظروں سے مجھے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ "جلال! میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔ اپنے شہر کے بارے میں پوچھوں گی' نہ اپنے لوگوں کے بارے میں' نہ اپنی امی کے بارے میں۔ کسی کے بارے میں مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے جلال۔ جس راستے پر چلنا ہی نہیں اس کا پتہ پوچھنے سے کیا فائدہ......... تم سب جس جگہ ہو خوش رہو۔ جن گلی کوچوں میں رہتے ہو وہ ہمیشہ سلامت رہیں۔ مجھے......... تم سب......... ایک کہانی سمجھ کر بھول جاؤ......... ہاں جلال بھول جائیں مجھے۔ آپ کو میری قسم ہے جلال یہاں سے چلے جائیں' اور پھر کبھی ادھر آنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ یہاں آ کر بہت کم......... بہت ہی کم لوگ واپس جاتے ہیں اور ان بہت کم لوگوں میں آج کی رات آپ بھی شامل ہو رہے ہیں۔"

"آرزو! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جلال۔ آپ کو مجھے چھوڑ کر جانا ہو گا' ہمیشہ کے لئے اور اس کے ساتھ ہی آپ کو......... میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک وعدہ بھی کرنا ہو گا؟"

"کک......... کیا وعدہ؟"

"آپ کو......... میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرنا ہو گا کہ یہاں سے جانے کے بعد آپ اس جزیرے کے بارے میں اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ راز ہمیشہ کے لئے آپ کے سینے میں دفن ہو جائے گا......... بولیں جلال' آپ ایسا کریں گے ناں......... پلیز جلال بولیں۔"

میں شدید تذبذب کے عالم میں آرزو کی طرف دیکھ رہا تھا' پھر میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ وعدہ تو میں تب کروں آرزو' جب مجھے یہاں سے جانا ہو۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جا رہا' اور اگر فرض محال مجھے جانا ہی پڑتا ہے تو پھر آپ میرے ساتھ ہوں گی........"

"ایسا ناممکن ہے جلال۔ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن میں یہاں سے جا نہیں سکتی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کو تفصیل سے سمجھا بھی نہیں سکتی۔"

"سمجھانے سے کوئی فائدہ بھی نہیں آرزو۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ مرنا اور آپ کے ساتھ جینا ہے۔"

"دیکھیں جلال۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میں ایک غیر معمولی اثر کے سائے میں ہوں۔ میں نے سچ کہا تھا جلال۔ میں آسیب زدہ ہوں.......... میں ایک عام انسان نہیں رہی ہوں۔ میرا آسیب.......... میرا آسیب اس جزیرے کا فرماں رواں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ان کا نام شوراق ہے۔ وہ ایسی صلاحیتوں کے مالک ہیں جن کا آپ تصور نہیں کر سکتے اور نہ کوئی دوسرا کر سکتا ہے۔ وہ ناقابل مزاحمت ہیں جلال۔ ان سے ٹکرانے کی سوچ بھی آپ کے ذہن سے نہیں گذرنی چاہئے۔ میں پھر کہہ رہی ہوں جلال' ان کی مخالفت مول لینے کی سوچ بھی آپ کے ذہن سے نہیں گذرنی چاہئے۔ وہ ذہنوں کو پڑھ لیتے ہیں اور ان سوچوں کو بھی جان لیتے ہیں جو ابھی ہمارے دماغ میں آئی نہیں ہوتیں۔ یہ ان کی بہت بڑی مہربانی ہے جلال' کہ آپ کے بارے میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انہوں نے میری التجا قبول کی اور ایک دو شرطوں کے ساتھ آپ کو اس جزیرے سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ اس لئے میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے۔ میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آپ اس موقع کو کھونا مت۔ پلیز۔"

وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور سرتاپا قابل رحم نظر آتی تھی۔

میں نے دل میں حوصلہ جمع کیا اور دل کڑا کر کے پوچھا۔ "کیا آپ شوراق سے وابستہ ہو چکی ہیں؟"

"بس وابستہ ہی سمجھیں۔ ان کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے جسے دور کئے بغیر وہ مجھے اپنا نہیں سکتے لیکن رسمی طور پر میں ان سے وابستہ ہو چکی ہوں۔ آپ نے کل میرے جسم پر جو لباس دیکھا تھا اور جو بھاری زیورات دیکھے تھے' وہ صرف وہی عورت پہن سکتی ہے جو بوگالوں کے فرماں روا کی شریک حیات ہو۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں۔ وہ لباس اور وہ منحوس زیورات آپ کو مجھ سے جدا کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں آرزو۔ میں قسم کھاتا ہوں........"

اس نے تڑپ کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں جلال کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالیں جسے آپ پورا نہ کر سکیں۔ آپ کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے ہم دونوں کے لئے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے جلال۔ اگر آپ کے دل میں مجھ بدنصیب کے لئے تھوڑا بہت بھی "کچھ" ہے تو میری بات آپ کو ماننا ہو گی۔ میں بڑے مان کے ساتھ آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں جلال۔"

میں چند سیکنڈ تک برستی بارش کے اندر سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر میں آپ کی بات نہ مانوں تو پھر کیا ہو گا؟"

"میں آپ کو کیا بتاؤں کیا ہو گا۔ آپ نے کل جو سنگین تماشا دیکھا تھا' اس کی اذیت کو دس گنا بڑھا لیں تو شاید پھر بھی وہ عقوبتیں آپ کے تصور میں نہ آ سکیں جو بوگالی اپنے قیدیوں کو دے سکتے ہیں۔ کیا' میں یہ سب کچھ دیکھ سکوں گی۔ اور پھر یہ سب کچھ سوچنے سے فائدہ بھی کیا۔ میں اچھی طرح جان چکی ہوں جلال' کہ میں اپنے آسیب سے بھاگ نہیں سکتی ہوں' میں زمین کی ساتویں تہہ میں بھی چھپ جاؤں تو شوراق مجھے وہاں سے ڈھونڈ نکالیں گے.........."

بجلی زور سے چمکی۔ چند ساعتوں کے لئے آرزو کا حسن بے مثال میری نگاہوں کو خیرہ کر کے پُرنم تیرگی میں ڈوب گیا۔ میں یک ٹک اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "جلال' یہ چاروں پہریدار آپ کو کھاڑی تک لے جائیں گے۔ وہاں ایک موٹر بوٹ آپ کے لئے موجود ہے۔ موٹر بوٹ کے اندر دو تین روز کا راشن اور دیگر ضروری سامان موجود ہے۔ موٹر بوٹ چلانے والا بھی بوٹ کے اندر ہی موجود ہے۔ وہ آپ کو کسی آباد جزیرے میں اتار کر واپس آ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ آگے سفر کے لئے آپ

کو کرنسی کی ضرورت ہوگی۔ وہ کرنسی بھی میں نے آپ کے لئے بوٹ میں رکھوا دی ہے۔"

"بہت خیال ہے میرا۔ اتنی اہمیت دینے کے لئے بہت شکریہ۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس آپ کو ایک وعدہ کرنا ہو گا مجھ سے۔" وہ اشکبار آواز میں بولی۔ "آپ......... سب کچھ......... آپ کچھ بھول جائیں گے اور زندگی میں کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ میں آپ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ مایوس نہیں کریں گے۔" اس نے اچانک میرا ہاتھ تھاما اور اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح بہہ رہے تھے۔ ایک دل فگار آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

"میں جانتی ہوں جلال' آپ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں جلال........." اس کی آواز بیٹھ گئی۔

میرے بدن میں سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک ایک سرد لہر دوڑ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک بھیگی بھیگی زمین کی طرف دیکھتا رہا' بارش مسلسل میری گردن کے پچھلے حصے پر اور کندھوں پر گر رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے سر اٹھایا۔ میرا ہاتھ بدستور آرزو کے سر پر تھا۔ میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی......... اگر کسی نے میرا اور تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے گا' میں اسے اپنے راستے سے ہٹاؤں گا یا مار ڈالوں گا......... یا پھر وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

میری آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ خود مجھے بھی اپنا لہجہ اجنبی محسوس ہوا۔ اس لہجے میں بھوری چٹانوں کی سختی اور بحری طوفان کی سی سرکشی تھی۔

آرزو نے تڑپ کر میرا ہاتھ اپنے سر پر سے ہٹا دیا۔ وہ خوفزدہ صورت کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے حسین سراپے پر ایکا ایکی کپکپی سی طاری ہوگئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ "پلیز جلال' ایسا مت کہیں۔ آپ مجھے زندہ درگور کرنے والی بات کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں' وہ نہیں ہو سکتا کسی صورت نہیں ہو سکتا۔

شوراق مجھے اور آپ کو زندگی موت کے درمیان لٹکا دیں گے۔ ہمارا کچھ نہیں ہو سکتا جلال......... کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ چھوڑ دیں میرا پیچھا۔"

"میں زندگی چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر تمہیں نہیں آرزو۔" میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا اور میرے لہجے میں عجیب سی جنونی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے دلیری سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو آرزو' تم میرے ساتھ چلو۔ اگر ہمارے جذبے سچے ہیں اور ارادہ مضبوط ہے تو کوئی ہمیں روک نہیں سکتا۔"

"خدا کے لئے جلال! آپ کچھ نہیں جانتے۔ مجھے چھوڑ دیں۔ یہاں قیامت برپا ہو جائے گی۔"

"اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا تو میرے لئے قیامت پھر بھی برپا ہو جائے گی ساری زندگی تمہاری جدائی کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ میں یہیں پر فیصلہ کر لوں۔ میری زندگی ختم ہو جائے یا میں تمہیں حاصل کر لوں۔ میں نے تمہیں کھو کر پایا ہے آرزو' اب پھر کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا......... آؤ آرزو میرے ساتھ' مجھے یقین ہے کہ دیواریں ہمیں راستہ دیں گی اور زنجیریں ہمارے لئے پگھل جائیں گی۔ مجھ پر بھروسا کرو میری جان' ہم کامیاب ہوں گے۔"

"نہیں جلال' میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اپنی نہیں آپ کی زندگی کی پرواہ ہے۔"

"مت کرو کوئی پرواہ۔ بس یہ یاد رکھو کہ ہم ایک دوجے کو چاہتے ہیں' ایک دوجے کے لئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے متذبذب نظر آئی مگر اگلے ہی لمحے بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی میں نے پہریداروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا' آرزو نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے دھکیلنے لگی۔ "چلے جائیں جلال۔ وہ دیکھیں وہ آ رہے ہیں۔"

"میں اسی صورت جاؤں گا۔ جب تم میرے ساتھ چلو گی۔" میں نے اس کا بازو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

نیم تاریکی کے باوجود پہریداروں نے ہماری کھینچا تانی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ لپکتے

ہوئے ہماری طرف آئے۔ آرزو کا بازو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ریوالور بردار پہریدار نے ایک ساعت ضائع کیے بغیر اپنا ریوالور نکال لیا۔ میں نے بھی ایک ساعت ضائع کئے بغیر ٹانگ چلائی۔ بھرپور ضرب نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھڑا دیا' وہ اڑتا ہوا نہ جانے کہاں تاریکی میں گم ہو گیا۔ آرزو چیخ کر ایک درخت سے جا لگی تھی۔

دو کلہاڑی برداروں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ میرے جسم میں جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے ان پر حملہ کیا' ایک حملہ آور کے سینے پر سامنے کی طرف میرے پاؤں کی ایڑی لگی۔ وہ زمین پر گرا اور ذبح ہونے والے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ دوسرے کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ میری پے در پے ٹھوکروں کی زد میں آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد کنپٹی پر لگنے والی ایک طوفانی ضرب نے اسے زمین دکھا دی۔ ریوالور بردار حملہ آور تو میرے تیور دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا تاہم تیسرے شخص نے تھوڑی سی مزاحمت دکھائی۔ اس مزاحمت کے نتیجے میں اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی اور میرے ایک راؤنڈ پنچ نے اس کے تین چار دانت حلق میں گرا دے۔

میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈری سہمی آرزو کا بازو کھینچا۔ "میرے ساتھ آؤ آرزو۔"

وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ "نہیں جلال۔ میں نہیں جا سکتی۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"پلیز آرزو۔" میں نے اسے جھنجھوڑا۔

وہ باقاعدہ میری مزاحمت کرنے لگی۔ یہی وقت تھا جب میں نے اردگرد کے درختوں میں چند جگنوں سے اڑتے دیکھے۔ جلد ہی ان کی حقیقت کھل گئی۔ یہ سینٹ برنارڈ کتوں کی چمکیلی آنکھیں تھیں۔ وہی کتے جن کی آنکھوں میں انسانوں کی سی ذہانت نظر آتی تھی اور جو اس جزیرے میں اکثر جگہوں پر نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ تاریکی سے ایکا ایکی بیس پچیس کتے برآمد ہوئے اور حلق سے غراہٹ برآمد کرتے ہوئے ہمارے اردگرد چکرانے لگے۔ ان کے سانسوں کی بدبودار پھنکار ہمارے حواس کو مختل کر رہی تھی۔ میں نے آرزو کو دیکھا وہ ایک دم جیسے سکڑ سمٹ گئی تھی۔ اس کی پشت درخت سے

لگی ہوئی تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں سے ڈری ڈری آواز نکل رہی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ وہ زو فوبیا (Zoo Fobia) کا شکار تھی۔ چوہا بلی دیکھ کر بھی اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ یہاں تو خوفناک صورتوں والے دیوہیکل کتے اس کے گرد چکرا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگر چند لمحے مزید یہ کیفیت رہی تو وہ نازک مزاج بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

میں نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ "آرزو......... حوصلہ کرو......... آرزو۔" مگر اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے خود کو میرے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑانے کی کمزور سی کوشش کی' پھر بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ اگر میں نے اسے تھام نہ رکھا ہوتا تو یقیناً وہ اوندھے منہ گرتی اور زخمی ہو جاتی۔ خونخوار کتے ہمارے چاروں طرف موجود تھے۔ ان کا گھیرا ہر لحظہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر میں نے انہیں چھیڑنے کی یا یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مجھے پھاڑ کھائیں گے۔

چند سیکنڈ بعد درجنوں روشنیاں درختوں کی اوٹ سے نکلیں اور ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ یہ شوراق کے مسلح محافظ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں اور تیور خطرناک ہو رہے تھے۔ آرزو مکمل طور پر بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ ایک محافظ نے ایم جی رائفل کی بھیگی ہوئی نال میری کنپٹی سے لگائی اور انگلی سے اشارہ کیا کہ میں آرزو کو اپنی گرفت سے نکال کر گھاس پر لیٹا دوں......... میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ جونہی میں نے آرزو کو خود سے جدا کیا' کوئی ایک درجن افراد وحشی درندوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ان کا بھرپور مقابلہ کیا مگر پھر کسی وزنی چیز کی ضرب میری گردن پر لگی اور میں گر گیا۔ ٹھوکریں اور گھونسے آہنی ہتھوڑوں کی طرح میرے جسم پر برسنے لگے' موسلادھار بارش کے نتیجے میں کیچڑ میں لت پت ہو رہا تھا۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی اور میں نے حملہ آوروں کے چہروں پر درندوں کی سی وحشت دیکھی۔ جس بے دردی سے مجھے مارا جا رہا تھا' کوئی اور ہوتا تو چکنا چور ہو جاتا۔ یہ میری سخت جانی تھی اور مارشل آرٹ کی سخت ریاضت تھی جس نے مجھے اس بے رحم مار پیٹ کو برداشت کرنے کی ہمت دی۔

میرے ہونٹ پھٹ گئے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں چیخ گئیں' اور پشت پر بھی گہری

ضربیں آئیں۔ میں نیم جان ہو گیا تو وہ لوگ مجھے کیچڑ میں کسی لاش کی طرح گھسیٹتے ہوئے ایک کوٹھری میں لے آئے۔ اس تاریکی کوٹھری کا دروازہ دھماکے سے بند کر دیا گیا۔

☆========☆========☆

میں پورے 72 گھنٹے بھوکا پیاسا قید تنہائی میں رہا۔ یہ ایک ایسی کال کوٹھڑی تھی جس میں روشنی کی کرن تک داخل نہیں ہوتی تھی۔ میں سیلن زدہ فرش پر پڑا رہتا تھا۔ کیڑے مکوڑے میرے جسم پر رینگنے لگتے تھے۔ ان دنوں جس شدت سے میں نے آرزو کو یاد کیا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کی سندر صورت ہر گھڑی میری نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب اذیت انتہا کو پہنچ جاتی تھی تو اس کے مسکراتے ہونٹ میرے تصور میں آتے تھے۔ یہ ہونٹ بہ زبان خاموشی مجھے بشارت دیتے تھے کہ ان تکلیفوں اور آزمائشوں کے اندھیرے سے ہی وہ کرن پھوٹے گی جو صبح صادق کہلائے گی' اور جس کے بعد ایک بیکراں اجالے کی چادر ہماری زندگی کے آسمان پر تن جائے گی۔ میں خیالوں میں اسے پکارتا تھا' اس سے التجا کرتا تھا کہ وہ میرا انتظار کرے' اور مجھے بھی اپنے انتظار سے آزاد نہ ہونے دے۔ میں بڑی مصیبت میں تھا مگر پتہ نہیں کیا بات تھی کہ یہ مصیبت بھی مجھے مزا دے رہی تھی' اور میں آرزو کی خاطر اس سے بھی بڑی آزمائشوں سے گذرنے کا خواہش مند تھا۔ ایک ایسی خود فراموشی مجھ پر طاری تھی جسے میں لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو شاید نہ کر سکوں۔

چوتھے دن شام کے وقت مسلح پہریداروں نے مجھے اس جہنمی کوٹھڑی سے نکالا میرے زخموں میں پیپ پڑی ہوئی تھی' جسم بخار میں پھنک رہا تھا اور روشنی میں آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ مجھے حمام میں داخل کیا گیا۔ میں نہایا دھویا۔ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کپڑے اتار کر نسبتاً بہتر کپڑے پہنے۔ اس کے بعد مجھے زخموں وغیرہ پر لگانے کے لئے ایک مرہم جیسی دوا دی گئی اور ایک دوسری کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ میں نے پریشان ہو کر دائیں بائیں دیکھا۔ تاہم میرا یہ شک غلط ثابت ہوا کہ یہ ان "اے کلاس" کوٹھڑیوں میں سے ہے جن کے قیدی چار ماہ تک ہر مہینے کے اختتام پر ایک جان گسل آزمائش سے گذرتے تھے....... یہ کوٹھڑی مستطیل تھی' اس کی تین دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ موٹے تختوں وغیرہ کو جوڑ کر پارٹیشن سی بنا دی گئی تھیں۔ فرش پر ایک چٹائی بچھی

دی گئی تھی۔ اٹیچ باتھ روم بھی یہاں موجود تھا۔ کال کوٹھڑی میں تین روز تک بند رہنے کے بعد یہ باتھ روم مجھے ایک بہت بڑی نعمت محسوس ہوا۔ اس کوٹھڑی میں سلاخ دار کھڑکی نہیں تھی۔ آمدورفت کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا۔ جس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا روشندان بھی تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو روز میں اس کوٹھڑی کے اندر مجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ یہاں جرأت سنگھ نہیں تھا۔ میں خود کو قید تنہائی کاٹنے والا مجرم محسوس کر رہا تھا۔ کھڑکی نما مختصر سے روشن دان کے ذریعے مجھے دن میں تین مرتبہ کھانا پہنچا دیا جاتا تھا۔ کھانے پہنچانے والے وہی لمبے بالوں والے بدبودار پہریدار ہوتے تھے۔ وہ میری زبان جانتے تھے نہ میں ان کی۔ میں اشاروں کنایوں میں کچھ پوچھتا تھا تو وہ لال لال آنکھوں سے گھور کر رہ جاتے تھے۔ غالباً ان کے جن ساتھیوں کی ہڈیاں پسلیاں پانچ روز پہلے کی لڑائی میں میرے ہاتھ سے ٹوٹی تھیں۔ وہ میرے بارے میں کچھ زیادہ نیک خیالات نہیں رکھتے تھے۔

میں جس کوٹھڑی میں قید تھا' اس کے دائیں بائیں بھی نامعلوم قیدی پائے جاتے تھے' بائیں طرف والی کوٹھڑی میں کوئی بڈھا کھوسٹ بند تھا۔ وہ رات بھر کھانستا تھا اور اگر سوتا تھا تو بھیانک خراٹے لینے لگتا تھا۔ یہ خراٹے اگر وہ میری کوٹھڑی میں لیتا تو شاید میں رات بھر کانوں میں انگلیاں ٹھونسے رہنے پر مجبور ہو جاتا۔

دائیں جانب والی کوٹھڑی میں کوئی جواں سال عورت تھی۔ وہ برطانوی لہجے میں انگلش بولتی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے قید تنہائی میں تھی۔ جب پہریدار اسے کھانا دینے آتا تھا تو وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے انگریزی نہیں آتی' بے تکان اس کے سامنے بولتی چلی جاتی تھی۔ اس کی مدھم سی آواز ہی مجھ تک پہنچتی تھی' اکثر فقرے میری سمجھ میں نہ آتے تھے' بس اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ اس سے ریڈیو مانگتی ہے یا پھر پڑھنے کے لئے کچھ طلب کرتی ہے۔

یہ تیسری چوتھی رات کی بات ہے' بارہ ایک بجے کا عمل تھا' جواں سال عورت دیر تک خود کلامی کرتی رہی۔ (قید تنہائی کا شکار اکثر لوگ خود کلامی کا شکار ہو جاتے ہیں) پھر اس نے میری جانب والی دیوار کے ساتھ منہ لگایا اور زور زور سے چیخنے لگی۔ "کوئی ہے؟ کوئی

ہے میری بات کیوں نہیں سنتا کوئی؟ کیا سب مر گئے ہیں' یہ دنیا خالی ہو گئی ہے لوگوں سے بولو میرے ساتھ......... میں کہتی ہوں بولو۔"

وہ لکڑی کی موٹی دیوار پر دو ہتڑ رسید کرنے لگی۔ مکے برسانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ چیختی جا رہی تھی۔

میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی خاموش ہو گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور غور سے لکڑی کی دیوار کا جائزہ لیا۔ مجھے ایک شک سا گزرا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں غور سے دیکھا تو یہ شک درست نکلا۔ لکڑی کی دیوار پر عورت کے مکے برسانے کے دوران مجھے "کھچ" کی سی آواز آئی۔ دراصل لکڑی کا ایک موٹا تختہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا اکھڑ گیا تھا۔ شاید جس دوسری لکڑی میں کیل لگے ہوئے تھے وہ دیمک زدہ ہو گئی تھی۔

میں نے لکڑی کو احتیاط اور آہستگی کے ساتھ کھینچا تو وہ دوسری لکڑی سے جدا ہونے لگی۔ کھٹکا سن کر وہ جواں سال عورت تیزی کے ساتھ اس مختصر خلا کے قریب آ گئی۔ لیمپ کی مدہم روشنی میں مجھے فقط اس کی آنکھیں نظر آئیں۔ اس کی آنکھیں معصوم تھیں' ان میں مجھے خوشی کی چمک نظر آئی۔

"کون ہو تم؟" میں نے انگلش میں اس سے پوچھا۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو۔" وہ بولی۔

"میرے خیال میں ہم دونوں کا اتنا تعارف ہی کافی ہے کہ ہم قیدی ہیں۔"

"میں نے آٹھ دس مہینے بعد......... آج پہلی بار اپنے جیسے کسی انسان سے بات کی ہے میں......... تو ترس گئی تھی۔"

"تنہائی کی قید میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں بالکل خلا کے ساتھ لگا دیں۔ بولی۔ "کیا یہ سوراخ ذرا بڑا نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے' میرا خیال ہے کہ یہ تختہ اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے' مگر پھر اسے دوبارہ اسی جگہ لگانا پڑے گا۔ اگر نہ لگ سکا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"لگ جائے گا۔ ضرور لگ جائے گا......... پلیز اسے ہٹاؤ۔ کہو تو میں زور لگاؤں۔"

"نہیں تم کچھ مت کرنا۔" میں نے کہا۔

میں نے بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ تختے کو اس طرح کھینچنا شروع کیا کہ اس کے ل بھی زیادہ ٹیڑھے نہ ہوں۔ آٹھ دس منٹ کی کوشش سے میں قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا ر چار فٹ لمبا تختہ دیوار سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خلا میں' میں نے اپنی ری قیدی کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ جسے میں آواز کی وجہ سے جواں سال عورت سمجھتا تھا ایک بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس نے صرف ایک نیکر اور مہین سی ٹی شرٹ پہن رکھی ۔ یہ ٹی شرٹ اس کا جسم چھپانے کی بجائے مزید نمایاں کر رہی تھی۔ لڑکی کے سنہرے ڈیانا کٹ تھے۔ شاید اسی ہیئر اسٹائل کی وجہ سے وہ ڈیانا کی طرح لگنے لگی تھی۔ اس کے خال بھی برطانوی تھے۔

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا یا روکنے کی کوشش کرتا' وہ خلا میں سے گزر کر ی کوٹھڑی میں آ گئی۔ میں نے بوکھلا کر اپنی کوٹھڑی کی روشنی بجھا دی۔ روشن کمرے اس بات کا اندیشہ بہرحال موجود رہتا تھا کہ کوئی روشن دان میں سے ہمیں دیکھ نہ لے ی کوٹھڑی کی روشنی پہلے ہی بجھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ وہ بولی ا نام کیرن ہے' اور تمہارا نام؟"

"میں جلال ہوں۔ جلال فرام پاکستان۔"

اس نے باقاعدہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ "تم شاید دو چار دن پہلے ہی اس کوٹھڑی آئے ہو' اس سے پہلے یہاں مکمل خاموشی رہتی تھی۔ میرے دوسری جانب والی ڑی میں ایک سری لنکن عورت اپنے بچے سمیت بند ہے۔ اس کو تھوڑی بہت انگلش ہے۔ مگر اس کو کسی سے بات کرنا ہی گوارا نہیں۔ ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ۔"

اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں دس پندرہ منٹ میں نے بات کی ہو گی' باقی عرصہ کیرن لتی رہی۔ وہ جتنی پرکشش تھی اس سے زیادہ پرکشش باتیں کرتی تھی۔ میں نے اس ی احتیاط کے ساتھ مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔ جواب میں اس نے بھی اپنی کتھا اس کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ اسمتھ کے ساتھ ایک غبارے ریعے سری لنکا سے "بمبئی" تک کے سفر پر نکلی تھی۔ راستے میں شدید طوفان باد و

باراں نے انہیں آلیا۔ وہ بری طرح بھٹک گئے اور اس جزیرے میں آگرے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس حادثے میں اسمتھ کی ایک پسلی ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑے میں جا گھسی تھی' وہ قریباً ایک ماہ تک اس جزیرے میں رہا۔ علاج معالجہ ہوا مگر وہ بچ نہ سکا۔ اس کے بعد سے کیرن یہاں پر تھی۔ ایک مقامی شخص نے کچھ رقم کے بدلے میں اسے اپنے گھر رکھ لیا۔ وہ ایک شرابی اور بدبودار بوگال تھا۔ کہنے کو تو وہ جزیرے کی انتظامیہ کا ایک معزز شخص تھا مگر بداخلاقی میں حد سے گذرا ہوا تھا۔ وہ اسے مارنے پیٹنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ ایک روز کیرن نے اس کے سر پر شراب کی بوتل مار کر اسے شدید زخمی کر دیا اور اس کے گھر سے بھاگ گئی۔ اس جرم کی پاداش میں کیرن کو سزائے موت بھی ہو سکتی تھی مگر بستی کے فرماں روا شوراق کی بیوی آڑے آئی اور اس کی مداخلت پر شوراق نے کیرن کی جان بخشی کر کے اسے غیر معینہ مدت کے لئے جیل میں ڈال دیا.........

کیرن کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب اپنے حالات کے حوالے سے مطمئن ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ اس نے اس جزیرے کو ہی کل کائنات سمجھ لیا ہے اور سوچ لیا ہے کہ زندگی کے باقی دن اسے یہیں پر گذارنے ہیں۔ شاید اس جزیرے کے سارے قیدی دھیرے دھیرے اس انداز سے سوچنے لگتے تھے۔ رات کے آخری پہر میں نے کیرن سے کہا۔ "اب صبح ہونے والی ہے' تم اپنی کوٹھڑی میں جاؤ' تاکہ میں تختہ پھر سے جوڑ سکوں۔"

"ایک شرط پر۔" وہ بڑی ادا سے میرا ہاتھ تھامے ہوئی بولی۔ "کل رات بارہ بجے کے بعد ہم پھر ملیں گے۔"

معمولی تذبذب کے بعد میں نے وعدہ کر لیا۔

اگلے تین چار دن تک ہم بڑی رازداری اور خاموشی سے ملتے رہے۔ کیرن ایک دلکش لڑکی تھی۔ وہ ایک ایسے پھول کی طرح لگی جس پر شباب ٹوٹ کر برسا تھا لیکن اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ خود پھول کو بھی جیسے احساس تھا کہ اس کی زندگی کا حسین ترین حصہ ضائع ہو رہا ہے۔ ان تین چار دنوں میں وہ مجھ سے کافی بے تکلف بھی ہو گئی تھی۔ تاریکی میں میرے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتی۔ میں اس کے جسم کو محسوس کرتا' یقیناً وہ بھی محسوس کرتی' کوئی اور ہوتا تو شاید اس حسین ر

ائی کے بہاؤ میں بہہ جاتا۔ مگر میرا تو معاملہ ہی اور تھا۔ میں کیرن کے اس چیختے چنگھاڑتے ب کو کیسے محسوس کرتا' میرے جسم میں تو انگارے دہک رہے تھے' آرزو کے غم کی آگ جو خون کی جگہ میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ مجھے اس جانکاہ اذیت سے ایک ے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اسے دوسری مرتبہ کھونے جا رہا ہوں' اگر اس مرتبہ وہ کھو گئی تو شاید میں کبھی اسے دیکھ نہ سکوں۔ احمد فراز کا وہی پراندیش رہ۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

اس رات آرزو کی باتیں سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شوراق میرے اور زو کے ذہنی تعلق سے پوری طرح آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے کسی ناک انجام سے دوچار نہیں کیا' تاکہ میں ایک پھانس بن کر ہمیشہ کے لئے آرزو کے ن میں نہ چبھ جاؤں.......... اس نے آرزو کی رحم کی درخواست منظور کرتے ہوئے مجھے زت دی کہ میں دم دبا کر جزیرے سے بھاگ جاؤں.......... اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسی زندگیوں کے بدلے بھی میں آرزو کو کھونا پسند نہیں کروں گا..........

یہ پانچویں چھٹی رات کا واقعہ ہے۔ حسب معمول رات گئے میں نے تختہ ہٹایا اور ن میری کوٹھڑی میں چلی آئی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوا' اس نے آتے ساتھ ہی اپنا سر ی گود میں رکھا اور چٹائی پر لیٹ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ "ان پانچ دنوں میں ہم کتنے قریب آ گئے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "سوچتی ہوں کہ خدا ے اگر مجھے یا تمہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تو میں کیا کروں گی؟"

"اگر میں چلا گیا تو شاید میرے جیسا کوئی اور آجائے۔ اس کو بتا دینا کہ ان سنسان وں کو کس طرح قابل برداشت بنایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں جلال' ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ ذرا بدلے ئے لہجے میں بولی۔ "میں جب اسمتھ کے ساتھ فرانس میں تھی تو وہاں میں نے کچھ عرصہ اری فلموں میں بھی کام کیا تھا' ہر کوئی میری صورت اور جسم کی تعریف کرتا تھا۔ پتہ ہ کہ میں اب بھی ویسی ہوں یا بدل گئی ہوں۔"

"اپنی تعریف کرانا چاہتی ہوں؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ مسکراتی آواز میں بولی۔
"تم واقعی خوبصورت ہو......... لیکن سیانے کہتے ہیں کہ زیادہ دیر جاگنے سے اور
کم سونے سے خوبصورتی کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اب جاکر سو جاؤ۔"
"بھئی، ابھی تو آئی ہوں۔" اس نے ٹھنک کر کہا۔
دفعتاً مجھ پر ایک حیرت ناک انکشاف ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کیرن کے بالائی جسم پر
کوئی لباس نہیں ہے۔
میں نے اسے سر سے پکڑ کر جلدی سے پیچھے ہٹا دیا۔ "اوہ گاڈ کیا ہوا؟" وہ ایک بار
پھر ٹھنک کر بولی۔
تاریکی اتنی تھی کہ ہم ایک دوجے کے نہایت مدہم ہیولے ہی دیکھ سکتے تھے۔ میں
نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیرن! تم نے......... شرٹ نہیں پہن رکھی؟"
چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر اس نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ "نہیں......... دراصل
وہ گیلی ہو گئی تھی، میں نے دھو کر پھیلا رکھی ہے۔"
میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ چند سیکنڈ کے لئے میں جیسے زمین آسمان
کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا تھا، مگر ایسا فقط چند سیکنڈ کے لئے ہوا۔ اس کے بعد میں نے
ایک گہری سانس لی اور اسپاٹ لہجے میں کہا۔ "کیرن، تم اپنی کوٹھڑی میں واپس جاؤ۔"
"مگر........."
"مگر کچھ نہیں کیرن۔" میرا لہجہ مزید خشک ہو گیا۔ "میں تمہیں صرف دوست سمجھ
رہا تھا۔ مجھے تم سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی پلیز تم واپس چلی جاؤ۔"
"میں......... میں شرٹ پہن لیتی ہوں۔"
"تم جو دل چاہے پہنو، لیکن میری طرف آنے کا مت سوچنا۔"
وہ چند لمحے کے توقف سے بولی۔ "ابھی تم غصے میں ہو، پھر بات کروں گی تم سے۔
گڈ نائٹ۔"
وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔
اگلی رات بارہ بجے کے بعد وہ دیر تک دیوار کے تختے کو مخصوص انداز میں ہولے
ہولے کھٹکھٹاتی رہی۔ مگر میں کان لپیٹ کر لیٹا رہا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس

ت نہیں کروں گا۔ میرے لئے یہ تصور بھی محال تھا کہ میں آرزو کی طرف سے دھیان
ٹا کر کسی اور کا دھیان کروں۔ کیرن بڑی دلکش لڑکی تھی مگر اس کی دلکشی میں سو گنا اضافہ
ی ہوتا تو میرے لئے وہ آرزو کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھی، میرے لئے اب ممکن ہی
یں تھا کہ میں کسی اور خوبصورتی کی طرف دیکھ بھی سکوں۔

☆==========☆==========☆

دوسرے تیسرے دن کی بات ہے۔ ایک پہریدار نے میری کوٹھڑی کے اس تختے کو
یکھ لیا جو دیوار سے تھوڑا سا ابھرا ہوا تھا۔ اندر آکر اس نے تختے کو ہلایا جلایا تو وہ اپنی جگہ
ے ہٹ گیا۔ اس روز دوپہر کے بعد ایک مقامی کارپینٹر تختے کو فکس کرنے کے لئے میری
وٹھڑی میں داخل ہوا۔ کارپینٹر کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر
برے چودہ طبق روشن ہو گئے......... مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اس شخص کو یوں
پانک یہاں دیکھ پاؤں گا۔ وہ اکبر خاں تھا۔ اس کی داڑھی تھوڑی بڑھ گئی تھی۔ وہ
لوار قمیض اور پشاوری چپل کی بجائے مقامی لباس میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں
ی لکڑی تراشنے کے اوزار تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھے آنکھ ماری یہ ایک
رح سے خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔
میرا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اب تک میں اکبر خاں اور جولیا کے
ملق سینکڑوں بار سوچ چکا تھا۔ آج بالکل اتفاقیہ طور پر اکبر خان سے ملاقات ہو گئی تھی۔
ای کارپینٹر نے اکھڑے ہوئے تختے کے نیچے والی لکڑی بدل دی اور تختے میں اچھی طرح
یل ٹھونک دیئے پھر اس نے دیواروں کے باقی تختوں کو بھی چیک کیا۔ ان میں سے بھی
ایک کو مرمت اور ٹھوکا ٹھاکی کی ضرورت تھی۔ اس کام میں کافی وقت صرف ہونا تھا۔
ر خان اور مقامی کارپینٹر اس کام میں لگ گئے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ مقامی کارپینٹر
ا اکبر خاں رازداں ہیں اکبر خان اب تک صرف پہریداروں کی وجہ سے احتیاط کر رہا

کچھ دیر بعد اکبر خان نے روشن دان سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر میرے قریب
بیٹھا اس نے بڑی گرمجوشی سے میرے دونوں ہاتھ دبائے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر
"ام کو تو بالکل یقین نہیں تھا کہ تم کو دوبارہ دیکھ سکے گا۔ یہ تو خدا کا ام پر خاص مہربانی

ہوا ہے۔ ام کو تین چار دن پہلے ہی پتہ چلا ہے کہ تم فلاں جگہ بند ہے۔"

"لیکن تم اب تک کہاں تھے اکبر بھائی؟"

"نہیں پہلے تم ام کو اپنے بارے میں بتاؤ پھر ام بتائے گا۔"

میں نے مختصر لفظوں میں اپنی روئیداد بیان کردی۔ پراتھا کی موت کا ذکر سن کر اکبر خان کو دھچکہ لگا۔ وہ ابھی اس واقعے سے بے خبر تھا۔ میرے بعد اکبر خان نے اپنے بارے میں مختصراً بتایا......... جس وقت بوگالی گھڑسواروں نے ساحل کے قریب ہم پر حملہ کیا اکبر جولیا اور راجا کیمپ میں تھے۔ ماسک والے دو افراد نے اکبر خان اور راجا کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا......... یہ تینوں کیمپ سے نکل کر بھاگے۔ راجا سے بھاگا نہیں جا رہا تھا کیونکہ ایک ہی دن پہلے وہ کوؤں کے پُراسرار حملے سے زخمی ہو گیا تھا۔ اکبر خان نے دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے راجا کو کندھے پر اٹھالیا۔ مگر راجا کے بوجھ کی وجہ سے اکبر خاں اور جولیا تیزی سے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک چھوٹے سے قدرتی گڑھے کے اندر چھپنے کی بڑی محفوظ سی جگہ تھی مگر یہاں صرف ایک بندہ ہی سما سکتا تھا۔ اکبر خان نے راجا کو اس گھڑے میں چھپا کر اوپر جھاڑ جھنکاڑ ڈال دیا۔ اکبر اور جولیا اس کے بعد بھی بھاگتے رہے۔ آخر انہیں پناہ کے لئے وہ کھوہ نظر آگئی جہاں اتفاقاً بعد میں کاشف اور میں بھی رکے تھے۔ اکبر اور جولیا اس کھوہ میں چار پانچ گھنٹے مقیم رہے مگر پھر خطرہ محسوس کر کے وہاں سے نکل گئے یہاں ان دونوں کو ایک ناقابل فہم واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کو میرے سامنے بیان کرتے ہوئے اکبر خان کے چہرے پر ایک بار پھر الجھن اور خوف کے سائے لہرا گئے۔ اس نے بتایا کہ غالباً ایک سدھایا ہوا عقاب (شکرا) ان دونوں کے سروں پر اڑتا رہا اور بلند آواز میں چیختا رہا۔ اس کی چیخیں سن کر ہی بوگالی گھڑسوار ان تک پہنچ گئے اور انہیں پکڑ لیا۔

میں نے اکبر سے پوچھا۔ "پھر تمہاری جان کیسے بچی؟"

وہ بولا۔ "یہ لمبا کہانی ہے برادر۔ تسلی سے سناؤں گا۔ بس یہ سمجھو کہ اللہ نے ام پر اور جولیا بی بی پر اپنا خاص کرم فرمایا۔ یہاں جزیرے پر ان بوگالی لوگوں نے افغانستان کا کچھ پشتون پکڑ رکھا ہے۔ یہ بیس پچیس لوگ لانچ کے ذریعے ملائشیا جا رہا تھا کہ راستہ بھٹک کر دربدر خراب ہوتا اس جزیرے پر پہنچ گیا۔ یہ سارا لوگ اسلحہ سازی کا ایک نمبر ماہر ہے۔

لی اوزاروں سے ایسا بندوق بناتا ہے کہ بندہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ ہنر ان کام آیا اور وہ بوگالیوں کے ہاتھوں چیونٹی کے مافق مسلے جانے سے بچ گیا۔ اب یہ لوگ پانچ ماہ سے اسی جزیرے پر تھے اور یہاں پر بندوق وغیرہ بناتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ے سے گڑبڑی والا مسئلہ یہ تھا کہ یہ صرف ٹھیٹ پشتو جانتا تھا۔ یہاں پورے جزیرے پشتو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ شاید اب امارا بات آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا؟"

"تھوڑا تھوڑا آگیا ہے۔ تم پشتو جانتے ہو۔ اس لئے تمہارا جان بھی بچ گیا۔ تم ان نوں کے ترجمان بن گئے۔"

"ام ہی نہیں......... جولیا بی بی بھی بن گیا۔ ام ان پشتونوں کا پشتو سمجھ کر اس کا ہ اردو میں کرتا ہے۔ اماری اردو سے جولیا بی بی انگلش میں ترجمہ کر دیتا ہے۔ ان یوں میں کچھ لوگ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں کا کام بن گیا۔"

"ایسا ویسا کام بنا ہے برادر......... بس کمال ہی ہو گیا ہے۔ جہاں جی چاہے جاتا ہے متا پھرتا ہے۔ ایک دو بڑا اچھا دوست بھی بنایا ہے ام نے......... خو یہ جو کارپینٹر ے ساتھ ہے یہ بھی اپنا یار ہے۔" اکبر نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"میرا پتہ کیسے چلا تم کو؟"

"سمجھو پل پل کا خبر ہے ام کو۔ بلکہ جس بات کا تم کو خبر نہیں اس کا بھی ام کو ہے۔ تو یہ بھی پتا ہے کہ تمہارا جان جگر تمہاری آنکھوں کا سرور آرزو بی بی یہاں موجود یہ سب کچھ بڑا عجیب ہے۔ کبھی کبھی تو جادو کا گمان ہوتا ہے، مگر آنکھوں دیکھی ت کو بھلا کون جھٹلا سکتا ہے۔ ام کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"

"تمہیں......... آرزو کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"آرزو بی بی کا ایک بڑا پکا سہیلی ہے۔ اس نے بتایا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ پکا کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"جولیا بی بی۔" اکبر خان نے انکشاف کیا۔ پھر میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ "ام کو پتہ تم کو زبردست حیرانی ہوگا لیکن حقیقت یہی ہے جو ام نے آپ کو بتایا ہے۔"

"جولیا اس کی سہیلی کیسے بن گئی؟"

"جو جگہ ام کو رہنے کے واسطے دیا گیا ہے وہ ایک باغیچے کے ساتھ ہے۔ یہ بہت بڑ
باغیچہ ہے۔ یہاں شام کے وقت آرزو صاحبہ سیر کے لئے آتا تھا۔ جولیا بی بی اس کو گھر
کھڑکی سے دیکھتا تھا۔ ایک دن جولیا بی بی بھی باغیچے میں چلا گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگ
بس پھر دونوں سہیلی بن گیا۔"

"کیا بتایا ہے اس نے؟"

"عورتیں جب آپس میں بات کرتا ہے تو ایک دوجے کو پتہ نہیں کیا کیا بتاتا ہے۔
ام کو تو بس یہی پتہ چلا ہے کہ یہ بہت پیارا سا اچھا سا لڑکی وہی آرزو ہے جس کی خاط
تمہارا زندگی حرام ہو رہا ہے۔ واقعی برادر جلال ام تم سے پورا اتفاق کرتا ہے۔ آرز
صاحبہ واقعی ایسا لڑکی ہے جس کے لئے بندہ پوری دنیا سے منہ موڑ سکتا ہے۔"

"راجا کا کچھ پتہ چلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں برادر' ابھی تک تو نہیں۔ ام نے کافی کوشش کیا ہے۔ جولیا بی بی نے آرز
صاحبہ سے بھی پوچھا۔"

"تم نے مجھ سے کاشف کے بارے میں نہیں پوچھا ہے؟"

"ام کو پتہ ہے وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب۔ تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے برادر۔ اس کی طرف سے فکر مند ہونے کا بالکل
ضرورت نہیں۔ تم نے ابھی اپنی روئیداد میں یہ ذکر کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس سے اچانک
غائب ہو گیا تھا۔ ام کو اس بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔"

"لیکن وہ اب ہے کہاں؟"

"یہ بات ذرا لمبا ہو جائے گا برادر۔ اور امارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ام تم
بس ایک دو ضروری باتیں بتانا چاہتا ہے۔ پہلا بات تو یہ کہ آرزو صاحبہ تم سے بہت بہ
محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت کی طرف سے تم کو کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہ
چاہئے۔ دوسرا بات یہ کہ آرزو صاحبہ اس وقت سخت مصیبت میں ہے۔ اس کے خیا
میں شوراق عام انسان نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کا ایک جادوگر ہے جیسے پہلے قصے کہانیو

پائے جاتے تھے۔ اس نے اپنے علم کی طاقت سے آرزو صاحبہ کو بری طرح جکڑ رکھا
۔ آرزو صاحبہ اتنا خوفزدہ رہتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم کو پتہ ہی ہو گا کہ وہ
روں سے بہت ڈرتا ہے' اور یہاں شوراق کا پالا ہوا طرح طرح کا ہیبت ناک جانور ہر
اس کے آس پاس رہتا ہے۔ آرزو صاحبہ یہاں ایک علیحدہ گھر میں نوکروں نوکرانیوں
ساتھ رہتا ہے۔ گدھے کے سائز کا بڑا بڑا کتا ہر وقت اس گھر کا پہرہ دیتا ہے۔ شوراق
بھی کبھار آرزو صاحبہ سے ملنے کے لئے آتا ہے۔ اس کا پالا ہوا خوفناک بھیڑیا سائے
طرح اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس بھیڑیئے کو دیکھ کر کمزور دل آرزو کا روح فنا ہو
ئے گا۔ ایک دفعہ ام خود بھی یہ منظر ذرا فاصلے سے دیکھ چکا ہے۔ شوراق سے بات کرتے
ئے آرزو صاحب کا رنگ بالکل ہلدی کے مافق ہو چکا تھا۔"

"اگر وہ اتنی مصیبت میں ہے تو پھر اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا کیوں نہیں
تی؟"

"ام نے بتایا ہے ناں کہ وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا ہے۔ شوراق نے اس طرح اپنے
ب میں لیا ہے کہ اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا ہے۔ شاید تم حیران ہو گے لیکن ام کو وہ
ا بات معلوم ہے جو تم نے اپنی کہانی میں نہیں بتایا۔ ام کو پتہ ہے کہ پندرہ بیس دن
، آرزو صاحبہ سے تمہارا آخری ملاقات ہوا تھا۔ خو اس ملاقات میں تمہاری زبردست
شش کے باوجود اس نے تمہارے ساتھ بھاگ جانے سے انکار کر دیا تھا اور امارے
ل میں اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ بعد میں جب اس نے خوفناک کتوں کو تم پر جھپٹتے دیکھا
تو خوف سے بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ ام غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

"اب اور سنو.......... آرزو صاحب کو معلوم ہے کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو۔
تمہاری ہر پل کی خبر رکھ رہی ہے۔ جولیا کو وہ اپنی رازدار سہیلی سمجھتی ہے۔ اسے ہرگز
نہیں کہ ام دونوں تمہارے ساتھ ہی اس جزیرے پر پہنچا ہے اور تمہارا قریبی ساتھی
۔ جولیا بی بی نے جو کچھ بتایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تمہارے دل سے اپنے آپ
نکالنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اس کو بھول جاؤ۔ نہ صرف بھول جاؤ بلکہ اپنی
ئی کے ساتھ یہاں سے واپس بھی چلے جاؤ۔ ام کو پتہ چلا ہے کہ آرزو بی بی تمہارے

ساتھ کوئی کھیل کھیلنے والا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کھیل شروع بھی کر دیا ہو۔ وہ تمہیں کسی بہت خوبصورت لڑکی کی طرف متوجہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کوئی ایسا لڑکی جو اپنی اداؤں سے تمہارا دل اس طرح بہلائے کہ آرزو کا غم خود بخود تمہارے دل سے بھاپ بن کر اڑ جائے.......... کہیں کوئی ایسا لڑکی ان ایک دو ہفتوں میں تم سے ٹکرایا تو نہیں ہے؟"

"نن.......... نہیں تو۔"

"ہو سکتا ہے کہ ٹکرائے۔" اکبر خاں نے پورے یقین سے کہا۔ "ام سمجھتا ہے کہ یہ تمہارے سچے پیار کا ایک بڑا آزمائش ہو گا۔ اگر تم اس لڑکی کے حسن کے سامنے پگھل گیا تو ام سمجھتا ہے کہ تم آرزو صاحبہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دے گا۔ وہ آگ جو ہر وقت آرزو صاحبہ کے دل میں تمہارے لئے بھڑکتا رہتا ہے' مدھم پڑ جائے گا۔ تم امارا بات سمجھ رہے ہو ناں برادر؟ آرزو صاحبہ کو تمہارے غم کا پورا احساس ہے۔ اسی غم کے مداوے کے لئے وہ کسی لڑکی کو تمہاری زندگی میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ لڑکی تمہاری زندگی میں داخل ہو گیا تو آرزو صاحبہ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ خوبرو کیرن کے حوالے سے وہ سارے واقعات ذہن میں آ رہے تھے جو پہلے چند روز میں پیش آئے تھے۔ گناہ انگیز اندھیرے میں شعلہ بدن کیرن کا چپکے سے میری کوٹھڑی میں چلے آنا۔ ذو معنی باتیں' حوصلہ افزا انداز.......... ایک ایک نقش میرے ذہن میں ابھر آیا۔ میرے دل نے وہیں بیٹھے بیٹھے گواہی دے دی کہ یہ سب ایک ڈرامہ تھا۔ یہی تھی آرزو کی وہ پلاننگ جس کا ذکر اب مجھ سے اکبر خاں کر رہا تھا..........

"کس سوچ میں کھو گئے برادر۔"

"کچھ نہیں یونہی ایک بات ذہن میں آ گئی تھی۔"

"کاشف کے بارے میں تو نہیں سوچنے لگے ہو؟"

"ہاں یہ الجھن بھی تم مجھے دیئے جا رہے ہو۔"

"اس کے بارے میں تو ام خود بھی الجھن میں ہے۔ وہ امارا دوست ہے بلکہ وہ پہلے ہے تم بعد میں ہے لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے برادر۔ ام کو اس کا کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔"

آج کل اسی محل نما کوٹھی میں ہے جہاں شوراق خود رہتا ہے۔ امارے اندازے کے مطابق وہ اس محل کے ساتھ بنے ہوئے مہمان خانے میں رہتا ہے۔ ام نے ایک دو بار اس کو کافی فاصلے سے دیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ وہاں کافی آرام اور سکون میں ہے۔ بلکہ ام کو تو شک بھی ہو رہا ہے کہ راجا بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس بارے میں ام تفصیل پھر بتائے گا۔"

"اچھا ایک آخری بات بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم بھی اس جزیرے کو کئی دوسرے لوگوں کی طرح جادو نگری سمجھتے ہو؟ یا پھر یہ سب ہماری نظر کا دھوکا اور وہم ہے۔"

"نہیں برادر! وہم نہیں ہے یہ.......... اور امارے خیال میں تم کو بھی یقین ہے کہ یہ نظر کا فریب یا دھوکا وغیرہ نہیں ہے۔ جادو برحق ہے برادر.......... اب تو انگریزوں کا سائنس بھی اس بات کو مانتا ہے۔ کالا جادو۔ وہ جادو ہے جو برے کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شوراق کے پاس بھی کالے جادو ہی کی طرح کی کوئی چیز ہو۔"

"چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" میں نے اکبر کی بے چینی دیکھتے ہوئے کہا۔

اکبر نے اپنے ساتھی کارپینٹر کے ساتھ اشاروں کنائیوں میں کچھ بات کی' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم سے کہا تھا ناں کہ امارے ملنے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ نکل آئے گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یہ جو میرا ساتھی کارپینٹر ہے ناں' پتہ ہے کن لوگوں میں سے تھے..........؟ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے جزیرے پر اترنے کے کچھ دیر امارا مدد کیا تھا۔ اور پھر بعد میں جب ام پر دو دفعہ مصیبت پڑا تو انہوں نے ام سے ہمدردی کا اظہار کیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ ماسک والے لوگ؟"

"ہاں۔ ان کو یہاں شوش کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں شوش کا مطلب باغی ہے۔ یہ لوگ شوراق کے ظلم و جبر اور ناانصافیوں سے ناخوش ہیں۔ شوراق یقیناً انہیں بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیتا یا مست ہاتھیوں کے نیچے روندوا دیتا مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ

شوراق کا سسرالی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"شوراق کا بی بی جس کا نام قاروبا ہے کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ تم اس کو یہاں کا مہارانی کہہ سکتا ہے۔ یہ سارا شوش لوگ اس کے قبیلے کا ہے۔ ان سے سخت ناراض ہونے کے باوجود شوراق ان سے زیادہ سختی نہیں کر سکتا۔ اس نے انہیں بستی سے نکال دیا ہے۔ اب یہ لوگ جزیرے کے غاروں میں اور جنگلی ٹیلوں کے اندر رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ کھلے سمندر میں آگے تک چلا جاتا ہے اور شکار بھی کرتا ہے۔ شکار کا مطلب مچھلی وغیرہ کا شکار نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ ڈاکہ زنی کرتے ہیں۔"

"بالکل مگر یہ ایک ویران سمندر ہے' یہاں مہینوں بعد ہی کوئی ایسا موقع ان لوگوں کے ہاتھ آتا ہے۔"

"لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہمارے ساتھ تو ان کا سلوک بڑا اچھا رہا ہے۔"

"یہ بھی کوئی گہرا راز ہے برادر۔ ام کو تو یوں لگتا ہے جیسے شوراق کا بی بی صاحب یعنی "قاروبا" امارے یہاں آنے پر راضی تھا۔ اس کا خواہش تھا کہ ام نہ صرف یہاں پہنچے بلکہ خیر خیریت سے بھی رہے۔"

"تم کہنا چاہتے ہو کہ "قاروبا" کی ہدایت پر شوش افراد نے ہمارے ساتھ دوستانہ رویہ رکھا۔"

"ام کو تو ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ بات تو اب تم کو بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شوراق کا نیت آرزو صاحبہ کے بارے میں بہت خراب ہے۔ وہ ہر صورت اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف قاروبا اپنے شوہر کو دوسری شادی سے روکنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی طرح تمہارے اور آرزو کے پیار کے بارے میں بھی سن چکی ہو۔ جب اس کو معلوم ہوا ہو کہ تم اس جزیرے پر اتر آئے ہو تو وہ خوش ہوئی ہو اور اس نے شوش لوگوں کی مدد سے امارے راستے کے کانٹے چنے ہوں۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس جزیرے تک پہنچے کیسے۔ کیا کاشف کو معلوم تھا کہ یہ سارے حالات اس جزیرے پر ہمارا

ار کر رہے ہیں۔"

"بات پہلے ہی بہت لمبا ہو چکا ہے برادر۔ اب ام کو جانے دو۔ پھر ملاقات ہوگا۔ ام د یہ بتا رہا تھا کہ امارا یہ ساتھی ترکھان بھی اندر سے شوش ہے۔ اس کی مدد سے ام تم ، پہنچا ہے۔ اس نے میرے یہاں دوبارہ آنے کا راستہ بھی کھول دیا ہے۔ اس کا خیال کہ تمہاری اس کوٹھڑی کا کوئی ایک تختہ بالکل خراب ہو چکا ہے' اس کو بدلے جانے کا رت ہے۔ کیا خیال ہے؟" اکبر نے ایک آنکھ میچ کر کہا اور باہر نکل گیا۔

☆=========☆=========☆

کاشف کے بارے میں اکبر خاں جو کچھ بتا کر گیا تھا اس نے میرے ذہن میں ہلچل مچا تھی۔ کاشف میری طرح یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے موجود نہیں تھا۔ وہ جزیرے فرماں روا شوراق کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے یہاں رہ رہا تھا۔ اگر واقعی کسی ح اسے ایک معزز مہمان کی حیثیت مل گئی تھی تو کیا بات تھی کہ وہ ابھی تک ہمارے چھ نہیں کر سکا تھا۔ وہ مجھ سے ملا تھا اور نہ اکبر خاں یا جولیا وغیرہ سے۔ وہ اپنے ہی یں مست ہو گیا تھا۔

ذہن میں آیا کہ وہ یہ سب کچھ کسی پلاننگ کے تحت تو نہیں کر رہا تھا؟ مگر یہ کیسی ک تھی جو وہ پہلے دن سے ہم سے چھپا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے بھی کسی کی ہوا نہیں لگنے دی تھی' حالانکہ وہ کچھ بھی مجھ سے چھپایا نہیں کرتا تھا۔

پھر میرا دھیان آرزو کی طرف چلا گیا۔ آرزو کے حوالے سے اکبر خاں نے جو کچھ تھا اس پر مجھے ایک سو دس فیصد یقین آ گیا تھا۔ یقیناً اس کوٹھڑی میں میرے ساتھ پچھلی راتوں سے جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ذمے دار آرزو ہی تھی۔ میرے خیال میں اس نے طرح میرے اور اپنے پیار کی توہین کی تھی۔ اس نے ایک خوبرو لڑکی کو دھکیل کر ی زندگی میں داخل کرنا چاہا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ میں ایک روتا دھوتا بچہ ہوں جو ایک ے کھلونے سے بہل جاؤں گا۔ اس کی سوچ کے اس انداز نے مجھے اتنا دکھ پہنچایا تھا کہ ے سارے دکھ ہیچ نظر آنے لگے تھے' رات ہوئی تو ایک مرتبہ پھر کوٹھڑیوں کی درمیانی ر پر مدہم دستک سنائی دینے لگی۔ اس سے پہلے اس دستک کا جواب نہ دے کر مجھے دل ہر سا محسوس ہوتا تھا لیکن آج میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ میں جان چکا تھا

کہ یہ سب کچھ ایک ڈرامے کا حصہ ہے۔

میں رات دن آرزو کے غم میں جل رہا تھا۔ یہ غم ہر رات دوگنا اور ہر دن چوگنا ہو رہا تھا۔ تیسرے چوتھے روز پھر اکبر خاں سے ملاقات ہوگئی۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ کارپینٹر کے ساتھ کوٹھڑی کے کچھ تختے بدلنے آیا تھا۔

کہنے لگا۔ "جولیا تم سے ملنے کے لئے بڑا بے تاب تھا' ام نے بڑی مشکل سے اس کو سمجھایا کہ ابھی تک تم کو بہت صبر کرنا پڑے گا۔"

"ویسے جولیا کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دم ٹھیک۔ بس آپ لوگوں کا فکر نہ ہو تو وہ ایکدم صحت مند ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "اکبر بھائی' جولیا کے بارے میں تمہارے خیالات کچھ بدلے بدلے لگتے ہیں۔ پہلے تو تم اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ خیریت تو ہے؟" میں نے آخری الفاظ معنی خیز انداز میں کہے۔

نہ جانے کیوں اکبر خاں کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا' مگر پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ "برادر اس کا جو بات ام کو برا لگتا ہے' ام فوراً سے پہلے اس کے منہ پر کہہ دیتا ہے۔"

"تو گویا اب اس کی کچھ باتیں تمہیں اچھی بھی لگنے لگی ہیں؟"

"برادر! جو اچھی ہے وہ اچھی ہے۔ ویسے ام مذاق کے علاوہ تم کو بتاتا ہے کہ اس نے خود کو پہلے سے بہت بدلا ہے۔ ام اس کو کئی بار بری طرح جھڑک بھی دیتا ہے لیکن وہ بالکل برا نہیں مانتا۔ کل وہ ام سے کہہ رہا تھا کہ وہ اب کبھی نیکر نہیں پہنے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑا مزے کا بات ہوا ہے۔ وہ آٹا گوندھ کر امارے دیسی طریقے سے روٹی پکانا سیکھ رہا ہے۔ ام نے کہیں مذاق میں کہہ دیا کہ ام کو توے کا گرم گرم روٹی بڑا اچھا لگتا ہے بس وہ بے وقوف اس کام کے پیچھے پڑ گیا۔"

"مجھے تو لگتا ہے اکبر بھائی کہ وہ روٹی کے پیچھے نہیں پڑا کسی اور کے پیچھے پڑا ہے۔"

"خو کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"اچھا کسی فارغ وقت میں تم کو بتاؤں گا۔ فی الحال تم مجھے کاشف کی کوئی خیر خبر سناؤ۔"

ایک دم اکبر خاں کی چوڑی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھ گیا۔ وہ بولا۔ "ام سچ بتاتا ہے برادر' ام اس کے بارے میں پریشان ہے۔ وہ ایک دم بہت قیمتی کپڑے پہننے لگا ہے۔ کل وہ شوراق کے محل کے پاس ایک بڑے شاندار گھوڑے پر سواری کر رہا تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کا ہار دمک رہا تھا۔ آنکھوں پر کالے شیشے کا عینک تھا۔ پتہ نہیں اس نے ام کو دیکھا یا نہیں لیکن ام نے دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ تین چار محافظ اور ان کا بڑا بڑا کتا بھی تھا۔ ام اسے آواز دیتے دیتے رہ گیا۔ اس کے علاوہ ام نے ایک اور بات بھی سنا ہے۔ وہ محل کے زنان خانے کی طرف بھی بہت جاتا ہے۔ جب بھی ادھر جاتا ہے خوب بنا ٹھنا ہوتا ہے اور کافی دیر ادھر رہتا ہے۔ جولیا کو شک ہے کہ وہ ادھر کوئی چکر چلا رہا ہے۔"

اس روز اکبر خان کے ساتھ میری جو گفتگو ہوئی اس نے میری الجھنوں اور پریشانیوں کو کچھ اور گمبھیر کر دیا۔ آرزو کا غم میری جان کو ہلکان کر رہا تھا۔ اب کاشف کے بارے میں روح فرسا سوچیں گھیرنے لگی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ اگر میں کچھ دیر مزید آرزو سے مل نہ سکا تو میرا سینہ پھٹ جائے گا' اور آرزو کی جاں گسل جدائی ابدی جدائی میں بدل جائے گی۔

وہ ایک ابر آلود رات تھی' میری کوٹھڑی کے روزن سے باہر آسمان پر گاہے گاہے بجلی چمک جاتی تھی اور پام کے بلند و بالا درخت سمندری ہوا میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ ایک دم میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے قفس کی تیلیاں توڑ کر نکلوں گا اور آرزو کے پاس پہنچوں گا۔

کوٹھڑی سے نکلنے کی سینکڑوں تدبیریں میں سوچ چکا تھا' ان میں سے ایک تدبیر میں نے اس رات بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر ڈالی۔ میں نے باتھ روم کا نل کھول دیا پانی تیزی سے بہنے لگا۔ یہاں پینے کے پانی کی افراط نہیں تھی۔ پانی کا استعمال احتیاط سے کرنا ہوتا تھا۔ پہریدار نے روزن میں سے ایک منحوس صورت دکھائی اور اشاروں کنائیوں میں مجھے حکم دیا کہ میں نل بند کروں۔ میں نے اشاروں میں ہی اسے بتایا کہ وہ خراب ہو گیا ہے' بند نہیں ہو رہا۔

پہریدار نے کچھ دیر تو انتظار کیا' پھر مسلسل گرتے پانی کی آواز نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا' اس نے رائفل ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ اس کی آمد

اس کے لئے بڑا بُرا شگون ثابت ہوئی۔ میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس کی گردن پر عقبی جانب سے کراٹے کی مخصوص ضرب لگائی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین کی طرف بڑھا۔ میں نے گرنے سے پہلے ہی اسے تھام لیا اور گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا۔ واپس آکر میں نے کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پہریدار کا خاکی لباس اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ پانچ دس منٹ بعد میں پہریدار کے لباس میں کوٹھڑی سے باہر نکل رہا تھا۔ قدرت بھی مجھ سے تعاون پر آمادہ تھی۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ میں نے کھونٹی پر لٹکا ہوا برساتی نما چغہ پہن لیا۔ اس چغے نے مجھے سر سے پنڈلیوں تک ڈھانپ لیا۔

پہریدار کی رائفل بھی میں نے اس چغے کے اندر ہی چھپالی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جزیرے پر بارش بہت ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پلاسٹک کا بنا ہوا یہ برساتی نما چوغہ یہاں کثرت سے نظر آتا تھا۔ رم جھم برستی بارش میں میں ناریل کے بلند درختوں کے نیچے پہنچا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا' جلد ہی مجھے درختوں میں گھری ہوئی ایک بلند و بالا عمارت کی برجیاں نظر آ گئیں۔ مخصوص عمارتوں کے لئے یہاں جنریٹر وغیرہ کا انتظام موجود تھا۔ ان جنریٹرز اور ایسی ہی کچھ دیگر مشینوں کے لئے تیل جزیرے سے ہی حاصل کر لیا جاتا تھا......... میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں کئی مقامی افراد سے مڈبھیڑ ہوئی۔ برساتی کی ٹوپی مجھے بہترین آڑ فراہم کر رہی تھی' میں بحفاظت گزرتا چلا گیا۔ بستی کے مکانات نیم پختہ تھے۔ ایک دو جگہ چھوٹے چھوٹے بازار بھی نظر آئے جہاں رات کے اس پہر بھی ناریل کے تیل میں کھانے بنائے جا رہے تھے اور کیتلیوں میں چائے ابل رہی تھی۔ سامان سے لدی ہوئی ایک دو گھوڑا گاڑیاں بھی نظر آئیں۔

میں ایک طویل چکر کاٹ کر محل نما عمارت کے عقب میں پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا' مجھے اس محل کی بلند دیواریں پھاند کر اندر پہنچنا ہے اور پھر آرزو تک پہنچنا ہے۔ جب میں دیوار پھاندنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا' دو پہریداروں سے میرا سامنا ہو گیا۔ ایک نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور انگریزی میں پوچھا کہ میں کون ہوں۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر دونوں پر حملہ کر دیا۔ میرے جسم میں بجلی بھری ہوئی

تھی۔ دو چار سیکنڈ کے اندر ایک شخص کی گردن میرے آرم لاک میں پھنسی ہوئی تھی اور دوسرے کا سر میں بار بار محل کی بیرونی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ دو تین ضربوں کے بعد ہی وہ شخص نیم جان ہو کر کیچڑ میں گر پڑا۔ آرم لاک میں پھنسے ہوئے شخص کی کنپٹی پر میں نے اسی کا ریوالور رکھ دیا اور اسے انگلش میں حکم دیا کہ وہ دیوار پر چڑھنے میں میری مدد کرے۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی چوں چرا نہیں کی۔ میں اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر پہنچ گیا اور پھر اسے بھی اوپر کھینچ لیا۔ اب اس شخص کی حیثیت میرے یرغمالی کی سی تھی۔ پہلے میں نے ریوالور کے زور پر اس شخص کو احاطے میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا پھر خود بھی اتر آیا......... بارش کا زور ایک دم بڑھ گیا تھا۔ ساتھ میں تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ ایک طرح سے یہ طوفان باد و باراں بن گیا تھا' جس میں رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بادلوں کی مہیب گرج سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ایک موافق بات یہ ہوئی تھی کہ پہریدار کے اس ریوالور پر سائیلنسر بھی چڑھا ہوا تھا جو میں نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔

احاطے میں کودنے کے بعد ہم دس پندرہ سیکنڈ تک بے حرکت کھڑے رہے اور حالات کا جائزہ لیتے رہے' پھر آگے بڑھے' انگلش دان پہریدار بدستور ریوالور کی زد میں تھا۔ ایک دم غراہٹ کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اپنے یرغمالی سے پوچھا۔

"رکھوالی کے کتے ہیں۔ تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔" وہ طوفان کے شور کی وجہ سے میرے کان میں چیخ کر بولا۔

"آنے دو۔"

اور وہ واقعی پہنچ گئے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ وہ واقعی دیکھنے میں گدھے لگتے تھے۔ ان کی خوفناک آوازیں دل ہلا دینے والی تھیں۔ بجلی چمک چکی تھی اب اس کی زور دار کڑک سنائی دینے والی تھی۔ میں نے کڑک کا انتظار کیا' جونہی کڑک سنائی دی......... میں نے سائیلنسر لگے ریوالور سے یکے بعد دیگرے چار گولیاں چلائیں۔ تینوں کتے اپنی کھوپڑیوں اور گردن میں سوراخ لے کر زمین بوس ہو گئے۔

میں نے سفاک لہجے میں پہریدار سے پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے جسے پکڑ کر جزیرے

پر لایا گیا ہے اور جو تمہارے شوراق کی محبوبہ کہلاتی ہے؟"

پہریدار کی گھگی بندھ چکی تھی۔ اس نے دوسری منزل کی ایک محراب دار کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کی دوسری جانب سرخی مائل روشنی تھی۔

"جھوٹ تو نہیں؟" میں نے ریوالور کی نال اس کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

اس نے جان کنی کے عالم میں لرزتے ایک کتے کی طرف دیکھا اور جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ اگلے جہان میں جا کر تمہیں سچ کا انعام ضرور مل جائے گا۔" میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کیا۔

وہ جان بخشی کے لئے پاؤں میں گر گیا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں نے ریوالور کی طوفانی ضرب اس کی گردن کے خاص حصے پر لگائی اور ایک دو گھنٹوں کے لئے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر میں نے پھولدار جھاڑیوں کے عقب میں چھپایا' پھر تینوں جسیم کتوں کی لاشیں گھسیٹ کر بھی اس کے قریب ڈھیر کر دیں۔

صرف پانچ منٹ بعد میں ایک دو انچ چوڑے خطرناک کارنس پر ننگے پاؤں چلنے کے بعد اس کھڑکی میں پہنچ چکا تھا جو آرزو کے کمرے میں کھلتی تھی۔ اس طوفانی رات میں شاید قسمت میرا ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے دباؤ ڈالا تو کھڑکی کھل گئی۔ تیز ہوا فراٹے بھرتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ریشمی پردے لہرائے اور کمرے کے وسط میں کھڑی حسن کی دیوی کے لمبے بال دیوانہ وار جھوم گئے۔ اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اندر گھستے ہی میں نے کھڑکی اندر سے بند کر دی اور برساتی کی ٹوپی سر سے ہٹا کر کندھے پر پھینک دی۔

آرزو سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ یہ شاہانہ انداز میں سجا ہوا ایک خوبصورت کمرا تھا۔ شاندار منقش مسہری پر چھپر کٹ تھا' محرابی دروں سے سچے موتیوں کی جھالریں لٹ رہی تھیں۔ دبیز پردے' بیش قیمت غالیچے' گداز قالین...... کیا نہیں تھا' اس کمرے میں۔ آرزو نے شب خوابی کا مہین گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں زمرد یاقوت اور فیروزے سے پروئی ہوئی مالا تھی۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ میں کسی

حسین و جمیل عالی مرتبت شہزادی کے روبرو کھڑا ہوں...... سیاہ برقعہ پہن کر شاہراہ قائداعظم پر عید کی شاپنگ کرنے والی لڑکی اور اس محل میں رہنے والی شہزادی میں کتنا فرق تھا۔ اتنا فرق تھا کہ تصور ہی میں نہیں آ سکتا تھا۔

"آ...... آپ یہاں؟" اس کے ہونٹوں سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ہاں تم تو مجھے مار چکی ہو۔" اب میری لاش کو چلتا پھرتا دیکھ کر تمہارا حیران ہونا لازمی ہے۔"

"خدا کے لئے جلال آہستہ بولیں۔ آمرا اوپر والی گیلری میں ہے۔"

یہ خواب گاہ دو حصوں پر مشتمل تھی۔ خواب گاہ کے اندر سے ہی نہایت خوبصورت سیڑھیاں ایک گیلری نما پورشن میں پہنچتی تھیں۔ وہاں مسہری پر کوئی عورت محو خواب تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ وہ آرزو کی ذاتی خادمہ کہلاتی تھی اور اس کا نام آمرا تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے آرزو' کیونکہ میں ڈرنے کی حد سے گزر چکا ں۔"

"آپ...... کیوں آئے ہیں یہاں...... آپ تو......"

"ہاں مجھے تو تم نے قید میں ڈلوا رکھا تھا۔ گلنے سڑنے اور مرنے کے لئے۔"

"خدا کے لئے جلال' چپ ہو جائیں۔ آپ نہیں جانتے۔ میرے لئے آپ کیا ں۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں' زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"حالانکہ تم اپنے عمل سے ان دونوں باتوں کو غلط ثابت کر چکی ہو اور اب بھی کر ی ہو۔ تم مجھے مار رہی ہو اور تڑپا کر مار رہی ہو۔ تم میری طرف کیرن جیسی لڑکی بھیجتی ہو ر یہ سمجھتی ہو کہ میں اس کے حسن کے جال میں پھنس جاؤں گا۔ کیوں ایسے دل آزار بے استعمال کر رہی ہو تم؟"

"آہستہ بولیں جلال۔ اگر آمرا جاگ گئی تو قیامت برپا ہو جائے گی۔"

"میرے لئے تو بہت دیر سے برپا ہو چکی ہے آرزو...... آج تمہیں فیصلہ کرنا ہو آرزو' واقعی مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو یا یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں لیکن کوئی بھی جواب سے پہلے ایک بات ذہن میں اچھی طرح رکھ لو۔ میں تمہاری خاطر ہر بڑی سے بڑی

مصیبت کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن تمہاری جدائی کا چھوٹے سے چھوٹا غم بھی اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ پلیز آرزو مجھ پر رحم کرو۔ اب اور سکت نہیں ہے مجھ میں یہ غم سہنے کی۔ میری مثال ڈوبتے شخص کی ہے' میں تمہارے بے کراں غم میں ڈوب رہا ہوں۔ میرے ہاتھ اس آس میں تمہاری جانب اٹھے ہوئے ہیں کہ تم مجھے سہارا دے دو گی۔ یہ ایک ایسی آس ہے جو ٹوٹ کر بھی ٹوٹ نہیں پا رہی' یہ ایک ایسی امید ہے جو ہزار بار مر کر بھی زندہ ہو جاتی ہے۔"

وہ دھیمی اور کراہتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں کیا کروں جلال۔ ہم ایک ایسے صیاد کی قید میں ہیں جس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں' ہم دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جائیں میرا آسیب مجھے ڈھونڈ لے گا.......... وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ مجھے بھول جائیں جلال۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ میرا دل کہتا ہے وقت آپ کے زخموں کو بھی بھر دے گا۔ روتے روتے آپ کے آنسو بھی خشک ہو جائیں گے۔ پھر کوئی اور لڑکی آپ کی زندگی میں آئے گی۔ اس کے ساتھ وہ بلائیں نہیں ہوں گی جو میرے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو شاید مجھ سے بھی بڑھ کر پیار کرے۔ آپ کے آنگن کو جنت بنا دے۔ وہ سب کچھ آپ کو دے دے جو میں بدنصیب نہیں دے سکتی۔"

وہ رو رہی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں سے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔

میرے دل کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ اس طوفانی رات کے پس منظر میں ایک طوفان میرے اندر بھی برپا تھا۔ جو کچھ بھی دل کے اندر تھا آج زبان پر آنے کو مچل رہا تھا۔ جذبے آنسوؤں میں ڈھلنا چاہتے تھے اور خوبصورت الفاظ بن کر میری زبان کے راستے آرزو کی سماعت میں اتر جانا چاہتے تھے۔ میں نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ "تو پھر لا دو مجھے اپنے جیسی آرزو۔ ایسی ہی آنکھیں' ایسے ہی ہونٹ' ایسے ہی رخسار اور ایسا ہی دل۔ پوری دنیا بھی گھوم گی تو نہیں ڈھونڈ سکو گی.......... مجھے باتوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو آرزو۔ میرا ساتھ دو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہاری ہی قسم کھا کر تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں اپنے اور تمہارے راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکر سے اڑا دوں گا۔ ایک بار اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر دیکھو' تمہیں میرے اندر حوصلے کا ایک پہاڑ نظر آئے گا۔ ایک بار آزماؤ تو سہی مجھ کو.......... یہ مصیبتیں' یہ آفات سب ایک دھند کی طرح ہیں

جب ہم دونوں ایک دوجے کا سہارا بن کر آگے بڑھیں گے تو یہ دھند چھٹتی چلی جائے گی۔ یہ اتنی گمبھیر نہیں ہے جتنی دور سے نظر آتی ہے۔ ہمت کرو آرزو' مجھ پر بھروسا کرو' میں تمہیں اس دھند کے اندر سے اڑا کر لے جاؤں گا۔ آج میری التجا کو مت ٹھکرانا آرزو.......... وقت آگے بڑھ جائے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر کبھی ایسی رات نہ ہو' ایسی بات نہ ہو۔ قبولیت کی کوئی ایسی گھڑی نہ ہو۔ پھر ساری زندگی تم بھی ان لمحوں کو یاد کرتی رہو' اور میری روح بھی ان ناکام ساعتوں کے دکھ میں سسکتی رہے.......... آؤ آج ان گھڑیوں کو محبت کے وجدان سے یادگار بنا دیں۔ اپنے سچے جذبے کا ہاتھ تھام کر س جبر کے حصار سے نکل جائیں۔"

میرے ہاتھ بے اختیار آرزو کی طرف اٹھ گئے تھے۔ میں نے دیکھا آرزو کے سین چہرے پر ایک رنگ سا لہرا گیا۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں خود فراموشی کی ایک ند لہرا ابھری اور اوجھل ہو گئی۔ بس ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے گے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھامے گی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائے گی.......... مگر اگلے ا لمحے جیسے وہ پھر اپنے آپ میں قید ہو گئی۔ ایک ہچکی بے بسی کی آواز بن کر اس کے ونٹوں سے نکلی۔ اس نے بے قراری کے عالم میں اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایا تو ریشمی ل منتشر ہو گئے۔ وہ کراہ کر بولی۔ "یہاں سے کوئی آج تک اپنی مرضی سے نہیں نکل سکا ر مجھ پر تو اتنے پہرے ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ نہیں جلال' یہ نہیں ہو سکے ا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ خاموش ہو گئی مگر اس کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

میں کئی لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ لمحے.......... یہ کربناک لمحے مجھ صدیوں سے بھاری تھے۔ آنسوؤں کا ایک آبشار تھا جو اندر ہی اندر میرے دل پر گر رہا اور میری ہستی کو مسمار کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ایک بار پھر سوچ لو آرزو.........."

میری آواز کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ لانبی یں دو تین بار لرز کر جھک گئیں۔ انکار.......... بلیک وارنٹ کی تحریر کی طرح اس کے ے پر درج تھا۔ میرا پورا جسم غم و غصے کی شدت سے لرزنے لگا۔ میں نے کہا۔ "یہ کی محبت ہے آرزو' جو جدائی سے شروع ہو کر جدائی پر ختم ہوتی ہے۔ جس کا صلہ دکھ

ہی دکھ ہے، انکار ہی انکار ہے۔"

"میں بڑی بدقسمت ہوں جلال۔ جس کے نام کے ساتھ میرا نام آتا ہے وہ دکھ کے اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے۔ آپ مجھ سے دور چلے جائیں۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کریں، یا پھر اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔"

"تم.......... خود ترسی کا شکار ہو آرزو۔ اپنی قسمت کو الزام دے کر خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔"

"ہاں جلال! میں نے نہیں کی محبت.......... میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"آج شاید پہلی بار تم نے سچ کی زبان بولی ہے۔"

"ہاں یہ سچ ہے جلال، میرا آپ سے.......... کوئی تعلق نہیں.......... کوئی نہیں۔"

اچانک خوابگاہ کے باہر سے ایک مانوس غراہٹ ابھری۔ میں پہچان گیا۔ یہ گدھے کے سائز کے سینٹ برنارڈ کتے کی آواز تھی۔ لمبے لمبے بالوں والے یہ دہشت ناک کتے یہاں نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ آواز سنتے ہی آرزو کے حسین سراپے پر لرزہ طاری ہوگیا۔ غم میں ڈوبا ہوا چہرہ اب دو ہی لمحوں میں دہشت کا تاثر پیش کرنے لگا تھا۔ اس نے وحشی ہرنی کی طرح دائیں بائیں دیکھا پھر تیزی سے بولی۔ "آپ چلے جائیں یہاں سے.......... پلیز آپ چلے جائیں۔"

سینہ شق کر دینے والی رکھائی تھی اس کے لہجے میں۔

میں نے نمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے ساکت کھڑا رہا پھر تیزی سے گھوم کر خواب گاہ سے نکل گیا۔

دو انچ چوڑے نہایت خطرناک کارنس پر ننگے پاؤں چلتا ہوا میں واپس چھت پر پہنچ بارش کا سلسلہ جاری تھا، تاہم ہوا کا زور کچھ کم ہوگیا تھا۔ چھت سے میں نے اپنی جوتی پہنی.......... برساتی کی ٹوپی کو اپنے سر پر درست کیا اور محتاط قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ سیڑھیاں محل کے زنان خانے میں ہی واقع تھیں اور ان کے ذریعے میں محل کی عقبی دیوار تک پہنچ سکتا تھا۔ ابھی میں سیڑھیوں سے کچھ دور ہی تھا کہ میرا

ہ نیچے احاطے میں گئی۔ احاطے کی چاروں جانب ایک روشن برآمدہ تھا۔ اس خوبصورت آمدے میں منقش محرابی در تھے۔ نوجوان ملازمائیں تتلیوں کی طرح ان برآمدوں میں تی پھرتی نظر آتی تھیں، ان کے جسموں پر ساڑھی نما لباس تھے اور بالوں کے جوڑوں ں رجنی گندھا کے پھول تھے۔ رات کافی ہو چکی تھی، مگر لگتا تھا کہ موسم کا لطف لینے کے ے زنان خانے کے اکثر مکین ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ کسی جگہ سے موسیقی کی مدہم از بھی بلند ہو رہی تھی۔ میں برآمدے میں جس چیز کو دیکھ کر چونکا تھا وہ ایک نوجوان مرد ہیولا تھا۔ یہ ہیولا ایک راہداری سے برآمد ہوا تھا اور تیز قدموں سے برآمدے میں آگے ھنے لگا تھا۔ اس ہیولے کو دیکھتے ہی میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ ں نے بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنایا اور آنکھیں سکوڑ کر ری توجہ سے دیکھا مجھے صورت نظر نہیں آئی، مگر سراپا اور چال ڈھال چیخ چیخ کر گواہی ے رہے تھے کہ برآمدے میں خراماں خراماں جانے والا شخص میرے لئے اجنبی نہیں ۔ یہ وہ شخص تھا جس کو میں ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں سے ایک ادھوری جھلک سے ن سکتا تھا.......... یہ کاشف تھا۔ میرا دوست، میرا جگر، میرا سب سے پیارا اور قریبی م۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی تھی۔

☆=========☆=========☆

کاشف کے حوالے سے وہ ساری باتیں یاد آگئی تھیں جو کچھ دن پہلے مجھے اکبر خان نے بتائی تھیں۔ اکبر خان نے بتایا تھا کہ کاشف اسی محل نما عمارت میں رہ رہا ہے جہاں شوراق رہتا ہے۔ اکبر خان نے کاشف کے شاندار رہن سہن کا ذکر بھی کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اپنے حال میں بالکل مست نظر آتا ہے۔ آج اکبر خان کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں کاشف کو محل کے زنان خانے میں دیکھ رہا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ اتنی رات گئے کاشف کو محل کے زنان خانے میں کیا کچھ کام ہو سکتا ہے۔ میری نظر مسلسل کاشف کا تعاقب کر رہی تھی اور پھر یوں ہوا کہ میں خود بھی اسی جانب چلنے لگا جس طرف کاشف جا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ نیچے برآمدے میں جا رہا تھا جبکہ میں چھت پر تھا برآمدے ہی کی طرح چھت بھی بہت طویل تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کاشف کا رخ اس خاص عمارت کی طرف ہے جدھر سے کچھ دیر پہلے میں لوٹا ہوں یعنی وہ اسی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا جہاں آرزو مقیم تھی۔ میرا تجسس مزید بڑھ گیا اور انداز بھی پہلے سے محتاط ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر میں چھت پر اوندھا لیٹ گیا۔ میرا سر منڈیر کے قریب تھا اور میں وہاں سے کاشف کی حرکات و سکنات دیکھ سکتا تھا۔ ایک دو منٹ بعد میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ کاشف آرزو کی خواب گاہ کی طرف ہی

رہا ہے میرے جسم میں سنسنی کی ایک بلند لہر اٹھی اور دل و دماغ کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ میں چھت پر رکوع کے بل چلتا ہوا دوبارہ اس خطرناک کارنس پر پہنچ گیا جس پر چل کر میں اس سے پہلے آرزو کی خوابگاہ تک پہنچا تھا۔ میں نے جوتا اتارا اور ایک بار پھر اس پل صراط نما کارنس کو طے کرنے لگا۔ یہ بڑا عجیب سفر تھا دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں اور تجسس کا گہرا سیاہ دھواں سینے میں بھرتا چلا جا رہا تھا' آرزو کی خواب گاہ کی کھڑکی کے اوپر ایک چھجا سا تھا میں اس چھجے سے لٹک کر ایک روشندان کے قریب پہنچ گیا۔ یہ روشندان آرزو کی خوابگاہ میں کھلتا تھا۔ بارش اب بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہاں کسی وقت بجلی چمکتی تھی اور قرب وجوار ایک لحظے کے لئے روشن ہو جاتے تھے۔ یہ روشنی میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر کسی پہریدار کی نظر چالیس فٹ اونچی دیوار پر چپکے ہوئے ہیولے پر پڑ جاتی تو وہ چیخ وپکار کر کے بہت سے افراد کو اکٹھا کر سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ قسمت میرا ساتھ دے رہی ہے میں نے روشندان پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا تو وہ اندر کی طرف سرک گیا اتنی درز پیدا ہو گئی کہ میں خواب گاہ کے نصف سے زائد حصے کو دیکھ سکتا تھا۔

روشندان کے سرکنے سے مدھم سی آواز ضرور پیدا ہوئی لیکن یہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ خوابگاہ کا مقیم متوجہ ہو سکتا۔ آرزو بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کا چہرہ بازوؤں میں چھپا ہوا تھا اور سینے کا زیر و بم چغلی کھا رہا تھا کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ پھر وہ بستر پر اوندھی لیٹ گئی اور آمرہ کسمسانے لگی چند لمحوں کے لئے مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ شاید وہ جاگ جائے گی لیکن پھر وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور دوبارہ سو گئی۔ آرزو مسلسل رونے دھونے میں مصروف تھی اور میں اسے روشندان کی درز سے دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران خوابگاہ کے دروازے پر مدھم سی دستک ہوئی۔ آرزو پوری طرح چونک گئی اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو درست کیا سر پر اوڑھنی لی اور چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد دروازے کی طرف دھیمے قدموں سے گئی اس نے بڑی آہستگی سے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ میری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ میں خوابگاہ کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں کاشف کھڑا تھا کاشف نے آرزو سے کوئی بات کی اور پھر وہ اندر چلا آیا۔ آرزو نے آہستگی کے ساتھ

دروازہ بند کر دیا وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی اور کاشف سے دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی کاشف بھی سرگوشی کے انداز میں ہی بول رہا تھا۔ میں کبھی کاشف کا چہرہ دیکھتا تھا کبھی آرزو کا۔ یہ وہی کاشف تھا جس کے بارے میں چند دن پہلے میں بہت متفکر تھا۔ مجھے نہیں یقین تھا کہ میں اسے کبھی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ اس کی صورت ہر گھڑی میری نگاہوں میں گھومتی رہتی تھی لیکن آج میں اسے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ رہا تھا میری نظروں نے بار بار اس کے چہرے کا طواف کیا تاہم میرا ذہن کسی اور ہی سوچ میں کھویا رہا۔ کاشف کی یہاں موجودگی میرے لئے بے حد حیران کن تھی وہ بہت سے وسوسے جو میرے ذہن میں سر اٹھاتے رہے تھے لیکن اب گہری نیند سوئے ہوئے تھے' دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگے۔ مجھ سے بہت کچھ چھپایا تھا میں انتظار کرتا رہا تھا کہ اس نے جو کچھ چھپایا ہے وہ خود ہی ایک دن اس کی زبان پر آجائے گا لیکن میرا یہ جاں گسل انتظار رائیگاں گیا تھا اور آج اس تاریک رات میں ایک اور بھیانک سوال میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور وہ یہ تھا کہ کاشف یہاں کیا کر رہا ہے وہ آرزو کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کا قیمتی لباس ٹیوب لائیٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ انگلیوں میں ہیرے کی دو قیمتی انگوٹھیاں تھیں گلے میں موتیوں کی ایک مالا تھی۔ اس نے مونچھیں صاف کرا دیں تھیں بال کچھ بڑھا لئے تھے شاید وہ مقامی لوگوں کی طرح بالوں کو کندھے تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ حلیے کے اعتبار سے کافی بدلا ہوا لگتا تھا۔ آرزو کی پلکیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ کاشف سے بات تو کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے بے چینی صاف نظر آ رہی تھی جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔ ایک دو بار گیلری میں اس نے خوابیدہ فربہ اندام ملازمہ کی طرف اشارہ بھی کیا کاشف کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں وہ اسے والہانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ پھر میری نگاہوں نے ایک پتھرا دینے والا منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کاشف آرزو کی طرف جھکا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے آرزو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور چہرہ اپنی طرف کیا وہ دھیمے لہجے میں آرزو سے کچھ کہہ رہا تھا اچانک گیلری میں لیٹی ہوئی ملازمہ بری طرح کھانسنے لگی اور کھانستے کھانستے بڑبڑانے لگی بالکل یہی محسوس ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔ اس صورت حال سے آرزو ایک دم لرز اٹھی۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور حواس باختہ نظروں سے کبھی کاشف اور کبھی

گیلری کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے گھبرائے ہوئے لہجے میں تیز تیز کاشف سے کچھ کہا۔ کاشف کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد خوابگاہ سے باہر نکل گیا۔ میری آنکھوں میں جیسے دہکے ہوئے انگارے رکھے گئے تھے۔ یوں لگا کہ جیسے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ کاشف کے باہر نکلتے ہی میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سابقہ راستے سے ہوتا ہوا واپس چھت پر آگیا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے جوتا پہنا اور منڈھیر کے قریب اوندھا لیٹ کر انتظار کرنے لگا کہ کاشف مجھے نیچے برآمدے میں نظر آئے۔ میرا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا تھوڑی دیر بعد کاشف نظر آیا وہ واپس جا رہا تھا۔ میں اس کا رخ دیکھتا رہا اور تاریک چھت پر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ کاشف زنان خانے سے نکل گیا اور مردان خانے میں داخل ہو گیا۔ زنان خانے اور مردان خانے کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ میں مردان خانے کی چھت پر پہنچ گیا۔ کاشف مسلسل مجھے نظر آ رہا تھا وہ رم جھم برستی بارش میں برآمدے کے اندر چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک دو افراد سے مختصر بات بھی کی اور پھر اپنے راستے پر آگے بڑھتا ہوا محل کی اصل عمارت سے باہر نکل آیا۔ مہمان خانہ محل سے جدا تھا لیکن عمارت محل کی عمارت سے ملحق تھی۔ چھتیں بھی آپس میں ملی ہوئی تھیں میں کاشف کا تعاقب کرتا ہوا مہمان خانے کی چھت پر پہنچ گیا۔ اکبر خان نے مجھے بتایا تھا کہ کاشف آج کل مہمان خانے میں رہ رہا ہے۔ اگر وہ مہمان خانے میں رہ رہا تھا تو پھر یقینی بات تھی کہ اب وہ یہاں سونے کے لئے آیا ہے کیونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ میں چھت کے ایک تاریک گوشے میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کاشف اپنی خوابگاہ میں پہنچ جائے۔ میرا ذہن جیسے گھوڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جو دیکھا ہے کیا وہ سب کچھ حقیقت تھا یا پھر میرا وہم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نظریں دھوکا دیتی ہیں اور مناظر کے پس منظر میں بھی مناظر ہوتے ہیں۔ میں نے کاشف کو آرزو کے قریب دیکھا تھا لیکن اس قربت کو کوئی خاص معنی پہنانا مناسب نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ یہ قربت کسی اور رشتے کے حوالے سے ہو۔ کسی اور جذبے کے تحت ہو لیکن پھر یہ بھی ممکن تھا کہ میرے دل و دماغ میں جو بھیانک اندیشے ایک لشکر کی طرح اٹھے تھے وہ درست ہوں کاشف کا رویہ بہت عرصے سے عجیب و غریب تھا۔ پاکستان سے روانہ ہونے کے بعد یہ رویہ اور بھی ناقابل فہم ہو گیا تھا میں سوچ رہا تھا کہ ایسا

کیوں ہے۔ اس سوال کے ان گنت جواب ذہن میں آ رہے تھے۔ دنیا میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل اور جھگڑوں کی بنیاد عورت سمجھی جاتی ہے اور اگر عورت آرزو جیسی کوئی حسین دوشیزہ ہو تو پھر بڑی سے بڑی انہونی کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔ میرا دل مان نہیں رہا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس دنیا میں کچھ بھی بعید از امکان نہیں۔ عین ممکن تھا کہ کاشف پر آرزو کے بے پناہ حسن نے کسی اور انداز سے اثر کیا ہو۔ اور انسان تو پھر انسان ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ دل دریا سمندروں ڈونگے' کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ انسان کے اندر کس وقت کیا کایا پلٹ ہو جائے۔

میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پورے جسم میں ایک ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں گزر نہیں رہی تھیں۔ میں جلد سے جلد کاشف کے سامنے جانا چاہتا تھا اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس سے اور کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اس طرح تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کاشف اپنی خواب گاہ میں پہنچ چکا ہو گا۔ چھت پر گھوم پھر کر میں یہ اندازہ پہلے لگا چکا تھا کہ خوابگاہ کس جگہ واقع ہو گی۔ میں منڈھیر سے لٹک کر ایک چھجے پر پہنچا اور پھر ایک چھوٹے سے کارنس پر بمشکل چلتا ہوا پہلی منزل کی ایک بالکونی میں اتر گیا۔ کاشف کا بیڈ روم تلاش کرنے میں شاید مجھے کافی دشواری پیش آتی لیکن ایک چیز نے میری کافی مدد کی۔

مدد کرنے والی یہ چیز موسیقی تھی کاشف سونے سے پہلے میوزک سننے کا عادی تھا۔ میں نے اس کی ایک پسندیدہ غزل کی آواز دھیمے سُروں میں ابھرتی اور ڈوبتی سنی۔ یہ آواز تاریک سمندر میں ایک لائٹ ہاؤس کی طرح تھی جس نے مجھے کاشف کی خوابگاہ کا سراغ دیا۔ میں تاریک راہداری میں بڑی احتیاط سے چلتا اس خوابگاہ کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی میں نے کاشف کو نیکر پہنے کمرے میں گھومتے دیکھا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور بڑے خوشگوار موڈ میں دکھائی دیتا تھا میں نے ہاتھ کی پشت سے شیشے پر ہلکی سی دستک دی اندر کاشف بری طرح چونکا اس نے سگریٹ بجھایا اور اپنی شاندار مسہری کے تکیئے کو اٹھا کر ایک ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔

پھر اس نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر انگلش میں پوچھا "کون ہے؟" میں نے دوبارہ مدھم دستک دی۔ کاشف نے بڑے محتاط انداز میں کھڑکی کھول دی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر

کھڑکی ہی کی طرح کاشف کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑا تھا میں جلدی سے اندر آ گیا اور کھڑکی دوبارہ بند کر لی۔

"جل.......... جلال تم یہاں!" اس نے بے حد حیرت سے کہا۔

"کیوں مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے تو پتا چلا تھا تم یہاں کے بندی خانے میں بند ہو۔"

"شکر ہے یار تمہیں معلوم تو تھا ورنہ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں کچھ پتا ہی نہیں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔" میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔

"وہ تو.......... وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تم یہاں پہنچے کیسے۔ تمہارے جسم پر پہریدار کی وردی ہے۔ شاید تم وہاں سے بھاگ کر آئے ہو۔"

"صرف بھاگنے کی بات بتاؤں یا شروع سے روئیداد سناؤں؟"

"شروع سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے وہاں سے جب ہم کھوہ میں چھپے ہوئے تھے تم پیشاب کرنے کے لئے نکلے تھے اور واپس نہیں آئے تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے شوراق کے کارندوں نے آ کر پکڑ لیا تھا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے یار لیکن یہ تم نے بہت برا کیا ہے۔ تمہیں اس طرح بھاگ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ تو تم نے اپنے لئے اور مصیبتیں کھڑی کر لی ہیں۔" عجیب سی بیگانگی تھی کاشف کے لہجے میں۔ میں حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا کیا یہ وہی کاشف تھا جسے میں جانتا تھا یہ تو کوئی اور ہی شخص نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں پلنے والے وسوسے ایک بار پھر زہریلے سانپوں کی طرح میرے کاسۂ سر میں رینگنے لگے۔ میں نے کہا۔ "تم نے ابھی تک ریوالور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ کیا مجھے شوٹ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ نہیں۔ یہ تو یونہی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

ریوالور اس نے جیب میں ڈال لیا اور الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا میں نے کہا۔ "کاشف! میں تم سے کچھ بہت ضروری اور اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں.......... ہاں.......... کہو.........."

"کیا یہ جگہ ان باتوں کے لئے مناسب رہے گی؟"

"مناسب ہے بھی اور نہیں بھی لیکن.........."

"لیکن کیا؟"

"لیکن یار میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔ تم وہاں سے بھاگے کیوں ہو تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تمہیں پتا بھی ہوگا کہ محترم شوراق کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

"آج تک تو تم لمبے ہاتھوں سے نہیں ڈرتے تھے۔ آج خبر نہیں کیوں ڈر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ کاشف نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس نے قیمتی سگریٹ باکس سے نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر بولا۔ "جلال! میں سمجھتا ہوں تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تمہیں واپس جانا چاہئے اگر میرا مشورہ مانو تو خود کو محترم شوراق کے حوالے کر دو یہی تمہارے لئے بہتر رہے گا۔"

"مشورہ تو مناسب ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔" کاشف نے کہا۔

یہی وقت تھا جب اچانک دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو پہریدار تیزی سے اندر آ گئے۔ یہ پہریدار مسلح تھے اور ان کے چہروں پر خشونت برس رہی تھی ابھی میں اس اچانک جھٹکے سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک بغلی دروازے سے بھی دو مسلح افراد اندر داخل ہو گئے۔ میرے جسم میں برق دوڑ رہی تھی اور دماغ میں جیسے چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ جو پہریدار بغلی دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے ان میں سے اگلا پہریدار طویل قامت تھا۔

میں نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا یہ وہی شخص تھا جس سے پہلے بھی دو دفعہ میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ جب ہم کیمپ سے بھاگے تھے تو کچھ موگالیوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا یہ شخص انہی میں شامل تھا یہ کافی خطرناک ثابت ہوا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب بھی مجھے اس شخص سے زیادہ خطرہ لاحق ہے۔ میں نے ایک لحظہ ضائع کئے بغیر اس شخص کے سینے میں بھرپور ٹانگ رسید کی اسے اتنی جلدی میرے ردعمل کی توقع نہیں تھی وہ اپنے ساتھی پر گرا اور دونوں دیوار سے جا ٹکرائے۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر باقی دونوں افراد کی طرف متوجہ ہوتا وہ بلائے ناگہانی کی طرح مجھ سے لپٹ گئے۔ ان سے ایک سنگین غلطی

ہوئی تھی انہوں نے یہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میرے پاس آتشی ہتھیار ہے یا نہیں۔ وہ سائیلنسر لگا ریوالور ابھی تک میرے لباس میں موجود تھا۔ جس سے میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل تین دیوہیکل سینٹ برنارڈ کتوں کو شوٹ کیا تھا۔ جب دونوں افراد مجھ سے گتھم گتھا ہوئے میں نے مزاحمت کے دوران میں ہی ریوالور نکال لیا۔ پہلا فائر میں نے ایک حملہ آور کے سینے میں دل کے مقام پر کیا۔ ریوالور کے سائیلنسر سے "ٹھک" کی مخصوص آواز آئی اور حملہ آور جھٹکے سے زمین بوس ہوا۔ دوسرے حملہ آور نے میرا ریوالور پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف سے موڑ دیا یہ خود غرضی کی ایک بے ساختہ مثال تھی ریوالور کا رخ اس کی طرف سے تو مڑ گیا مگر سیدھا اس کے ایک ساتھی کی طرف ہو گیا میں نے ایک بار پھر ٹریگر دبادیا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ دوسری گولی بھی ایک حملہ آور کو ڈھیر کر گئی اڑتیس بور ریوالور کی طاقتور گولی اس کے حلق میں لگی تھی اور کھوپڑی کا پچھلا حصہ پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب مارشل آرٹ کا ماہر طویل قامت حملہ آور مجھ پر جھپٹا۔ اس نے کراٹے کے انداز میں راؤنڈ کک ماری۔ ایڑی کی ضرب میرے سر پر لگی بڑی شدید ضرب تھی میں چکرا کر رہ گیا۔ اچانک عقب سے کاشف نے اچھل کر مجھے دبوچ لیا اس کا ایک بازو شکنجے کی طرح میری گردن کو جکڑے ہوئے تھا۔ میرے دل پر جیسے ایک زور دار گھونسہ لگا میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کاشف یوں میرے مقابل کھڑا ہو جائے گا۔ یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ کچھ دیر کے لئے میں مزاحمت بھی نہ کر سکا۔ طویل قامت حملہ آور اور اس کے ساتھی نے مجھ پر ہلہ بولا اور مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس دوران میں کاشف نے بڑی مضبوطی کے ساتھ مجھے عقب سے جکڑ رکھا تھا۔ اس شدید مارا ماری میں ریوالور بھی میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ چند زور دار چوٹیں سہنے کے بعد اچانک میرا داؤ چل گیا۔

آفتاب میں نے نیچے جھکے جھکے سر کی ایک زور دار ضرب طویل حملہ آور کے سینے میں لگائی وہ درد سے بے تاب ہو کر دوہرا ہوا تو میں کاشف سمیت پیچھے کو ہٹنے لگا۔ کاشف کے بازو نے بدستور مجھے پوری قوت سے جکڑ رکھا تھا۔ اس سخت گرفت نے میرے اندر یہ آتش فشاں دہکا دیا تھا یہ میرے دوست کی گرفت تھی جو آج بدترین دشمنی پر اترا ہوا تھا۔ میں اتنی رفتار سے پیچھے ہٹا تھا کہ کاشف کو پتا نہیں چل سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے

والا ہے۔ اور جب اسے پتا چلا اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا کاشف کا ٹکراؤ پہلے ہوا اور یہ اتنا شدید ٹکراؤ تھا کہ یکایک میرے جسم پر سے اس کی گرفت ختم ہو گئی۔ میں نے اسے لہرا کر فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے گرنے کا انداز مجھے سمجھا گیا کہ سر پر آنے والی شدید ضرب نے اسے ہوش سے بے گانہ کردیا ہے۔ یہ ایک ہی زوردار چوٹ میرے دوست کے لئے نتیجہ خیز ثابت ہو گئی تھی۔

طویل قامت حملہ آور ابھی تک گھٹنوں کے بل زمین پر تھا' میں نے یہ موقع غنیمت جانا مجھے خبر تھی کہ اس شخص کو چند سیکنڈ کی مہلت مل گئی تو وہ پھر ایک خطرناک حریف کی صورت میں میرے سامنے ہوگا۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے وزنی ہتھے سے اس کی گدی پر بے رحمانہ ضرب لگائی۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی بھی اپنے حواس میں نہ رہ سکتا لیکن وہ خاصہ سخت جان تھا زمین پر گر کر اینٹھنے لگا۔ میں نے دوسری ضرب اس کے سر پر لگائی یہ ضرب اس کے لئے "تسلی بخش" ثابت ہوئی اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے اور نہ ہی مجھے اس حوالے سے کسی بات کی پرواہ تھی۔ یہ ایک جنون کی سی کیفیت تھی جس نے مجھے ہر مصلحت اور اندیشے سے آزاد کردیا تھا۔ طویل قامت شخص کو دوسری ضرب لگانے میں مجھے جو دو سیکنڈ لگے انہوں نے میرے چوتھے حریف کو بھاگنے کی مہلت فراہم کردی۔ جس وقت مجھے اس کے فرار کا علم ہوا وہ دروازے سے گزر کر مہمان خانے کی طویل راہداری میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے اپنا گرا ہوا ریوالور اٹھایا اور اس کی پشت کا نشانہ لے لیا۔ میری چلائی ہوئی گولی خبر نہیں اسے کہاں لگی؟ بس میں نے یہ دیکھا کہ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر گیا ہے اور وہیں ساکت ہو گیا ہے۔ باہر بارش ایک بار پھر زور پکڑ چکی تھی۔ گاہے گاہے بجلی چمکتی تھی اور بادلوں کی گرج سے در و دیوار لرزتے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا میرے اطراف میں میرے دشمن قابل رحم حالت میں پڑے تھے۔

ان میں سے دو دار فانی سے کوچ کر چکے تھے کاشف بے ہوش پڑا تھا اور اس کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ طویل قامت حملہ آور کے بارے میں' میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس کے سر پر لگنے والی دوسری ضرب کافی سنگین تھی مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس چوٹ نے اس کا سر ایک طرف سے پچکا دیا ہے۔ بظاہر وہ سانس لیتا بھی محسوس نہیں

ہوتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کے انجام کے بارے میں جان سکتا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ مہمان خانے کے اس حصے میں جو کچھ ہوا تھا۔ وہ بے حد سنگین اور تہلکہ خیز تھا۔ اس کی خبر کسی بھی وقت اس چار دیواری سے باہر نکل سکتی تھی اور یہ خبر باہر نکل جاتی تو پھر قیامت کا بپا ہونا یقینی تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا میں نے سوچا کہ مجھے کاشف سمیت فوراً سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہئے لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے؟ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور میری نظر پورچ میں کھڑی ایک اسٹیشن ویگن پر پڑی میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ویگن میرے کام آ سکتی ہے۔ ممکن تھا کہ اس اسٹیشن ویگن کی چابی کاشف کی جیب میں ہو یا ان افراد میں سے کسی ایک کی جیب میں ہو جو ابھی میرا نشانہ بنے تھے۔ میں نے پہلے کاشف کی جیب کی تلاشی لی۔ پھر دوسرے افراد کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جلد ہی مجھے کامیابی ملی۔ ایک ہلاک شدہ کی جیب سے ایک چابی برآمد ہو گئی۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ یہ اسٹیشن ویگن کی چابی ہے۔ تصدیق کے لئے میں بڑی احتیاط کے ساتھ مہمان خانے کے پورچ میں گیا اور چابی گاڑی میں لگا کر دیکھا یہی چابی اسٹیشن ویگن کی تھی۔ میں واپس پہنچا کاشف کو اچھی طرح دیکھا اس کی سانس ہموار تھی۔ دھڑکن بھی نارمل تھی۔ سر پر آنے والی گہری چوٹ کی وجہ سے وہ بے ہوش تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ آنکھیں کھول دے گا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے کندھے پر لادا اور اسٹیشن وین میں لے آیا۔ میں نے اس وین کے پچھلے حصے میں سیٹوں کے درمیان اس طرح لٹا دیا کہ وہ آسانی سے نظر نہیں آ سکتا تھا اس کے بعد میں نے مہمان خانے کے بیرونی دروازے مقفل کئے اور اسٹیشن ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں ابھی تک چغہ نما برساتی پہنے ہوئے تھا برساتی کی ٹوپی میرے چہرے اور سر کے زیادہ تر حصے کو ڈھانپ رہی تھی۔ میں نے ویگن اسٹارٹ کی اور محل کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میں آسانی سے نکل نہیں سکوں گا لیکن یہ کام اتنا دشوار ثابت نہیں ہوا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ ویگن کو دیکھ کر ایک پہریدار نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔ بس اس نے ایک طائرانہ سی نظر ویگن کے اندر ڈالی۔ [illegible] کے سبب شاید وہ ٹھیک سے اندر دیکھ بھی نہیں سکا۔

میں ویگن کو تیزی سے باہر نکالتا چلا گیا۔

تاریک سنسان رات میں موسلا دھار بارش کے دوران یہ سفر بڑا خطرناک تھا۔
مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں کس سمت میں جا رہا ہوں اور مجھے کہاں پہنچنا ہے۔

ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ میں جلد سے جلد اس محل سے دور نکل جاؤں۔ میں محل میں شوراق کے کم از کم تین کارندوں اور تین دیوہیکل کتوں کی لاشیں چھوڑ آیا تھا۔ یہ سب کچھ کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد یقیناً جزیرے میں وسیع پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جاتی۔ اس تلاش کا ہدف اس اسٹیشن ویگن کو ہی بننا تھا۔ بہتر تھا کہ میں جلد از جلد اس ویگن سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ ابھی میں محل سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہی آیا تھا کہ اچانک تاریک جنگل سے ابھرنے والی ایک طویل آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز ایک چنگھاڑ سے مشابہہ تھی۔ میں اس آواز کو پہچان سکتا تھا۔ اس سے پہلے جب تماشہ گاہ میں شوراق ایک سجے سجائے ہاتھی پر بیٹھ کر آیا تھا۔ تو یہ چنگھاڑ میں نے اور میرے ساتھ ہزاروں تماشائیوں نے سنی تھی یہ ہاتھی کی آواز تھی۔ چند لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز درختوں میں بڑی تیزی کے ساتھ میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ویگن ڈرائیو کرتے کرتے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ نظر نہیں آیا ہاں یہ احساس موجود تھا کہ کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے اور یہ کیا ہو سکتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی جنگلی ہاتھی تھا۔ جلد ہی مجھے اس کا سیاہ ہیولہ بھی نظر آ گیا۔ خدا کی پناہ وہ ایک تاریک پہاڑ کی طرح اسٹیشن ویگن کے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا فاصلہ دم بدم کم ہو رہا ہے اگر میں اسٹیشن ویگن میں نہ ہوتا تو شاید میں زمین کو پتے کی طرح لرزتا ہوا بھی محسوس کرتا۔ وہ یقیناً ایک بہت جسیم ہاتھی تھا۔ میں نے مست ہاتھیوں کے بارے میں سنا تھا۔ جو بڑی ورندگی سے اپنے شکار کا پیچھا کرتے ہیں اور طویل تعاقب کے بعد بھی اسے جا لیتے ہیں۔ کیا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا؟ یہ ویگن میرے اور کاشف سمیت اس وحشی جانور تلے روندی جانے والی تھی یہ سوال وزنی ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی خوف کا ایک عجیب احساس ذہن میں ابھرا اور پورے جسم میں پھیلتا چلا گیا۔ مجھے جرأت سنگھ کی وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں' جو اس نے مجھے شوراق اور اس کی پُراسرار صلاحیت کے بارے میں بتائی تھیں۔ اور صرف باتیں

ہی نہیں وہ سارے مناظر بھی یاد آئے جو میں اس حوالے سے دیکھ چکا تھا۔

بہت سے جانور اپنے عجیب و غریب رویئے سمیت میرے پردہ تصور پر ابھر آئے۔ لاہور کی گلیوں میں گھومنے والے پُراسرار کالے کتے سے لے کر ایبٹ آباد کی پولیس چوکی میں غرانے والی خوفناک بلی تک اور واجد کلینک کی چھوٹی سی چھپکلی سے لے کر اس جزیرے کے آسمان پر اڑنے والے پُراسرار شکرے تک بہت سے جانور پردہ تصور پر ابھرے اور اوجھل ہوئے۔

کیا یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں؟ کیا یہ سب ایک ہی طلسم کے مختلف روپ تھے؟ یہ کیا تھا؟ جو میرے اردگرد جال کی طرح بنا ہوا تھا۔ میں اسٹیشن ویگن کی رفتار حتی الامکان حد تک بڑھاتا چلا گیا۔ جنگل کے درمیان یہ کچا رستہ کیچڑ سے لت پت تھا۔ پہیئے بار بار پھسل رہے تھے۔ اسٹیرنگ وہیل کو تیزی سے گھما کر مجھے بار بار خوفناک گڑھوں سے بچنا پڑ رہا تھا۔ ایسے میں رفتار کو کسی حد تک بڑھایا جا سکتا تھا۔ میرے پیچھے آنے والا وحشی جانور کسی آفت کی طرح لپکتا چلا آ رہا تھا۔ ایک دوبار اسٹیشن ویگن اس بری طرح پھسلی کہ مجھے لگا وہ ابھی درختوں میں جا گھسے گی اور خوفناک حادثے کا شکار ہو جائے گی۔ جب دیوہیکل جانور چنگھاڑتا ہوا میرے بالکل قریب پہنچ گیا تو میں نے بے اختیار اسٹیشن ویگن کو راستے سے اتار کر جھاڑیوں میں داخل کر دیا۔ یہاں زمین اور بھی ناہموار تھی۔ اسٹیشن ویگن بری طرح اچھل رہی تھی اور اس پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ تاہم تھوڑا آگے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ غیرارادی طور پر میں ایک بہت مناسب قدم اٹھا چکا ہوں۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ درخت گھنے ہو رہے تھے۔ ان گھنے درختوں کی وجہ سے اسٹیشن ویگن کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے آنے والے وحشی جانور کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ اس کی چنگھاڑوں سے جھنجلاہٹ کا تاثر مل رہا تھا۔ ایک جگہ ویگن ناگ پھنی کے دو درختوں کے درمیان گھسی اور پھنس گئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی طرف کا دروازہ کھولا کاشف کو کھینچ کر اپنے کندھے پر ڈالا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وحشی ہاتھی اس وقت مجھ سے چالیس پچاس گز کی دوری پر رہا ہوگا۔ وہ گھنے درختوں سے الجھ رہا تھا اور انہیں توڑتا موڑتا ہوا اپنا راستہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا میں موقع غنیمت جان کر مزید گھنے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا میرے

اندر تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ کاشف کا بے ہوش جسم میرے کندھے پر تھا' زمین گیلی اور کیچڑ آلود تھی۔ ایک دو بار میں بری طرح پھسلا لیکن رکنے یا سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ ہاتھی کی چنگھاڑیں رات کے سناٹے میں کسی مشتعل بدروح کی طرح چاروں طرف چکرا رہی تھیں۔ یقیناً وہ بھی آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر اب اس کی رفتار میری رفتار سے کم تھی۔ دھیرے دھیرے میں اس مشتعل جنگلی ہاتھی سے دور ہوتا چلا گیا۔ میری سانس بری طرح' پھولی ہوئی تھی اور ٹانگیں شل ہو رہی تھیں لیکن رکنا میرے لئے بہت خطرناک تھا۔ میں جیسے تیسے بھاگتا رہا۔ بالکل بے دم ہو جاتا تو چلنے لگتا۔ اسی طرح میں نے بارش سے بھیگے ہوئے جنگل میں ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ ہاتھی کی آوازیں اب بہت دور سے آ رہی تھیں۔ بارش کے شور کی وجہ سے کسی وقت تو یہ آوازیں بالکل معدوم ہو جاتی تھیں۔ مجھے اب پناہ کی تلاش تھی میں پانچ دس منٹ یوں ہی درختوں میں بھٹکتا رہا کبھی کبھی بجلی چمکتی تو قرب و جوار روشن ہو جاتے۔ اچانک مجھے ایک بلند درخت پر مچان کی شکل کی کوئی شئے نظر آئی۔ اس کے ساتھ بانس کی بنی ہوئی سیڑھی بھی لٹک رہی تھی۔ قریب جا کر دھیان سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ کسی شکاری کی خستہ حال مچان ہے۔ غالباً یہ کافی پرانی ہو چکی تھی اور بہت کم استعمال میں آتی تھی۔ میں نے کاشف کو نیچے گھاس پر لٹایا بانس کی جھومتی ہوئی سیڑھی کا اندازہ کیا اور پھر فیصلہ کیا کہ اس تاریک خطرناک جنگل میں اس وقت یہ مچان ہم دونوں کے لئے مناسب پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ اندازہ تو میں اب تک لگا ہی چکا تھا کہ اس جنگل میں چھوٹے بڑے جنگلی جانور موجود ہیں ایسی جگہ پر رات کے وقت درخت کی بلندی ہی ایک اچھی اور محفوظ جگہ ہوا کرتی ہے۔

بے ہوش کاشف سمیت اس مچان پر پہنچنا میرے لئے کافی مشکل ثابت ہوا تاہم دو چار منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں نے کامیابی حاصل کی۔ یہ مچان بانس کی شاخوں اور گھاس پھونس سے بنائی گئی تھی۔ زمین سے اس کی بلندی پندرہ سولہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ یہ کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے خطرناک بھی کہا جا سکتا تھا تاہم میں اور کاشف مچان کے نسبتاً محفوظ گوشے میں تھے۔ اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے دھیان سے کاشف کو دیکھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں ابھی مجھے چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک نئی آفت سامنے آ گئی۔ اس درخت پر گرگٹ کی قسم

کا کوئی جانور موجود تھا۔ اس کی تعداد درجنوں میں تھی۔ وہ شاخوں پر حرکت کر رہا تھا اور پتوں میں سرسرا رہا تھا جلد ہی ایسے ہی کچھ چھپکلا نما جانور مچان میں بھی پہنچ گئے۔ اگر وہ صرف یہیں تک رہتے تو بھی کوئی بات نہیں تھی وہ باقاعدہ جارحانہ موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے میرے پاؤں پر کاٹا اور اردگرد چکرانے لگے۔ میں نے ایسے ہی دو تین چھپکلوں کو ریوالور کے دستے سے زخمی کر کے درخت سے نیچے پھینکا تو ان کی یورش ذرا کم ہو گئی۔ مگر ہمارے اردگرد وہ بدستور موجود رہے۔ ابھی میں اس آفت سے پوری طرح سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ ایک اور طرح کی تشویش نے گھیر لیا۔ مست جنگلی ہاتھی کی آواز جو کچھ دیر کے لئے بالکل معدوم ہو گئی تھی' ایک بار پھر انتہائی بائیں جانب سے سنائی دینے لگی۔ آواز کا فاصلہ کافی زیادہ تھا لیکن چونکہ ہوا کا رخ میری طرف تھا۔ لہٰذا آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی' کچھ دیر بعد میرا یہ شک یقین میں بدلنے لگا کہ یہ ہوشیار جنگلی جانور اب شمالی رخ سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ غالباً اس طرف جنگل کم گھنا تھا اور اسے کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنے کے لئے راستہ مل رہا تھا۔ اس کی آواز اب مجھے واضح سنائی دے رہی تھی اور مزید واضح ہو رہی تھی۔ یہ بڑے کٹھن لمحے تھے ایک طرف درخت پر پائے جانے والے نامانوس چھپکلے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے دوسری طرف ہاتھی کی چنگھاڑیں قریب پہنچ رہی تھیں۔ میرے پاؤں پر جس جگہ دو چھپکلوں نے کاٹا تھا وہاں جلن پیدا ہو رہی تھی اور خون بھی رسنا شروع ہو گیا تھا چھپکلوں کی ضرر رسائی دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوئی چھپکلا مچان کے اندر کودا تو میں اس پر فائر داغنے سے گریز نہیں کروں گا۔ میرے ایک ہاتھ میں بانس کی ایک مضبوط شاخ آ گئی تھی۔ میں اس شاخ کی مدد سے مہم جو چھپکلوں کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ ایک کامیاب کوشش تھی۔ وحشی ہاتھی کی چنگھاڑیں بلند تر ہوتی چلی گئیں اور پھر چند ہی منٹ بعد میں نے ایک بار پھر اسے اپنے مقابل پایا۔ نیم تاریکی میں' میں نے دھیان سے اسے دیکھا اور ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ایک عجیب سی پُراسراریت کا احساس اس ہاتھی کے ساتھ وابستہ محسوس ہونے لگا۔ دو چار منٹ تو یہ دیوہیکل جانور مچان کے اردگرد چکراتا رہا پھر اچانک اس کا انداز بے حد جارحانہ ہو گیا۔ اس نے بھاگ کر درخت کے تنے پر ایک ٹکر رسید کی' یہ ٹکر میرے تصور سے زیادہ تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سرکش لہروں پر اچھلتی ہوئی ایک کشتی پر موجود ہوں۔ اگر اسی طرح دو تین بار مزید ہاتھی کے سر اور اس تنے کا تصادم ہوتا تو یقینی بات تھی کہ میں اور کاشف مچان سے گر پڑتے ہاتھی کی دوسری ٹکر پہلی سے بھی زیادہ شدید تھی۔ مچان کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر گیا اور بے ہوش کاشف کی ٹانگیں نیچے لٹکنے لگیں۔ اس تہلکہ خیز ٹکراؤ کے نتیجے میں چھپکلا نما جانور بھی نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پورا درخت اپنے ذی نفوس سمیت سہم گیا ہے۔ ہاتھی ایک بار پھر نہایت خطرناک انداز میں پیچھے ہٹا۔ یقیناً وہ تیسری بار درخت پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ شاید اس مرتبہ درخت جڑوں سے اکھڑ جائے اور اگر درخت نہ بھی اکھڑتا تو مچان کا گرنا تو یقینی ہوگیا تھا۔ اچانک دو بار تاریکی میں شائیں شائیں کی عجیب سی آواز سنائی دی۔ ہاتھی کے حلق سے ایک طویل کربناک چنگھاڑ نکلی۔ میں نے اس کے ہیولے کو بری طرح اچھلتے مچلتے دیکھا۔ پھر دفعتاً اس نے درخت سے ٹکرانے کا ارادہ ملتوی کیا اور رخ موڑ کر مخالف سمت کے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کے جسم سے ٹکرا کر شاخوں اور درختوں کے ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔ میں حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تاریکی سے کسی نے اس سرکش جانور پر حملہ کیا ہے۔ جلد ہی میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ میں نے درختوں میں ایک روشنی کو متحرک دیکھا۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس روشنی بردار شخص کے چہرے پر ماسک ہے۔ یہ شخص انہی لوگوں میں سے تھا جو اس سے پہلے ایک سے زائد مرتبہ ہماری خیر خواہی کر چکے تھے۔ اس شخص کے ہاتھ میں جو روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ درحقیقت ایک لیمپ تھا۔ اس شخص نے مقامی زبان میں کچھ کہا اور مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس پر بھروسہ کیا اور درخت سے نیچے اتر آیا۔ اس بلند قامت شخص کے ہاتھ میں ایک طاقتور ایروگن تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس نے اسی ایروگن سے بدمست ہاتھی کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی انگلش بول سکتا تھا۔ اس نے ہنگامی لہجے میں مجھے سمجھایا کہ میں اپنے ساتھی سمیت مچان سے نیچے اتر آؤں کیونکہ یہ جگہ میرے اور میرے ساتھی کے لئے قطعی غیر محفوظ ہے۔ اس شخص کا لہجہ ہمدردانہ اور خیر خواہی کا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے اس خیر خواہ کی بات مانوں۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم کاشف کو مچان سے نیچے لے آئے۔ وہ شخص کاشف کو میرے کندھے سے اپنے کندھے پر لینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہ بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ میرے مددگار کے ہر انداز سے یہ بات واضح تھی کہ وہ میرے اور کاشف کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہمیں لے کر بھیگے ہوئے جنگل میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے درختوں کے اوپر تاریک ابر آلود آسمان پر ایک بار پھر وہی منحوس طویل آواز سنائی دی یہ اس شکرے کی آواز تھی جو شاید میرے ساتھ ساتھ ہی پرواز کر رہا تھا یوں لگتا تھا کہ یہاں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں میں اس پُراسرار پرندے کی نگاہ سے محفوظ رہ سکوں۔

وہ تیزی سے اڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ ایک بار پھر واپس آیا اور اس کی آواز دور مشرق میں معدوم ہوتی چلی گئی میرا دل چاہا کہ میں اپنے محسن سے اس پرندے کا ذکر کروں لیکن پھر خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ویسے ہی وہ بہت جلدی ہمیں نظر آتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جلد از جلد ہم دونوں کو کسی پناہ گاہ میں پہنچانا چاہتا ہے۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے تھے۔ کیبن صرف دس فٹ کا ایک چھوٹی چھت والا کمرا لگتا تھا۔ یہ کیبن دراصل ایک بہت پرانی اور زنگ آلود موٹر بوٹ کا حصہ تھا۔ یہ موٹر بوٹ نہ جانے کتنا عرصہ پہلے سمندر سے گھسیٹ کر یہاں لائی گئی تھی اور یہیں پڑی ہوئی تھی اس کا ایک چوتھائی حصہ زمین میں دفن ہو چکا تھا اور اس کو چاروں طرف سے درختوں اور گھاس پھونس نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس برستے موسم میں اور تاریک جنگل میں یہ موٹر بوٹ ہمارے لئے ایک بہترین پناہ گاہ تھی میں نے لیمپ کی روشنی میں اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا ایک روشندان تھا جس میں لکڑی لگا کر اسے بند کردیا گیا تھا۔ ایک زنگ آلود دروازہ تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی ہمارے نامعلوم ہمدرد نے یہ دروازہ اچھی طرح بند کردیا تھا۔ میں نے کاشف کو نیچے لٹا دیا۔ اس کی بے ہوشی اب گہری نیند میں بدل چکی تھی اور یہ نیند بھی بتدریج بیداری کی طرف آرہی تھی۔ میں کاشف کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھا۔ میں نے اس کے نتھنوں سے بہتا ہوا خون صاف کیا گیلے کپڑے سے اس کے چہرے کی صفائی کی اور سر کے نیچے تکیہ رکھ کر اسے نیم دراز کردیا۔ اس کیبن سے باہر قریب ہی بھیڑیوں کی دہشت ناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں یہ آوازیں

کبھی پاس آتیں کبھی دور چلی جاتیں۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی ہمارے ہمدرد نے کیبن کا دروازہ اچھی طرح بند کرنے کے بعد اس کی نچلی درز کو ایک کپڑے کی مدد سے بند کر دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ کیڑے مکوڑے اندر داخل نہ ہوں۔ میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔ ”دوست! میں تمہیں کسی خوف میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا لیکن جن پُراسرار حالات سے تم گزر رہے ہو ان کا کچھ احساس تمہیں بھی ہوگا۔ دراصل اس وقت تم دونوں شدید خطرے میں ہو اور یہ خطرہ تمہیں انسانوں سے نہیں ہے کسی اور چیز سے ہے۔“

”کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”دوست! تمہیں درپیش خطرے کا تعلق جانوروں سے ہے۔ اس وقت کوئی بھی جانور اپنی جبلت کے مطابق تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کوئی کیڑا‘ کوئی درندہ‘ کوئی پرندہ کچھ بھی۔“

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ آوازیں سن رہے ہونا‘ یہ بھیڑیئے ہیں لیکن ان میں کبھی ایک باریک تیز آواز بھی شامل ہو جاتی ہے۔ یہ بھیڑیئے کی نہیں ہے جانتے ہو یہ کس کی ہے؟ یہ کوگر کی آواز ہے۔ یہ شیر اور چیتے کی درمیانی نسل کا درندہ ہے۔“

”میں تمہاری بات کا مقصد نہیں سمجھا کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ جانور اس وقت ہمارے تعاقب میں ہے۔“

”حقیقت تلخ ہوا کرتی ہے۔ مگر اس کا بدل کوئی نہیں ہوتا۔“

اچانک میں نے ایک منظر دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔ دروازے کا نچلا حصہ جسے ہمارے ہمدرد نے کپڑے سے بند کر دیا تھا۔ میری نگاہوں کا مرکز تھا۔ میں نے دیکھا کہ درجنوں پاؤں والا ایک کریہہ کن کھجورا کسی درز میں سے پھنس پھنسا کر نکلا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرا ہمدرد لپک کر آگے گیا اس نے اپنے پاؤں سے اس کیڑے کو مسل دیا۔ پھر وہ دروازے کی نچلی درز کی طرف متوجہ ہوا اور ایک لکڑی سے کپڑے کو اچھی طرح درز کے اندر ٹھونسنے لگا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے دوست!“ میں نے اپنے ہمدرد سے پوچھا۔

”یہ ساری شوراق کی سحرکاری ہے وہ اس جنگل میں تمہاری موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہے اور اب تمہیں پکڑنا چاہتا ہے۔“

”لیکن اگر ایسا ہے تو اپنے آدمی بھیج کر میرا گھیراؤ کر سکتا ہے۔“

”یہی تو انوکھی بات ہے دوست! بے شک شوراق بہت بااختیار ہے لیکن آج کچھ مجبوریاں اس کی راہ میں حائل ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”تم زمین پر چاند ستاروں کے اثرات کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔“ میرے ہمدرد نے پوچھا۔

”نہیں کچھ زیادہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر تو تمہیں سمجھانے میں ذرا دشواری پیش آئے گی۔“

”تم کیا سمجھانا چاہتے ہو؟“

میرے ہمدرد نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”آج چاند کی پندرھویں تاریخ ہے‘ چاند اپنے پورے جوبن پر پہنچ کر زوال کی طرف جانا شروع ہو گیا ہے۔ جب چاند کا زوال شروع ہوتا ہے‘ اس کے بعد 24 پہر یعنی تین دن تک شوراق کی حاکمیت آدھی رہ جاتی ہے۔“

”آدھی حاکمیت کیا مطلب؟“

”اس جزیرے کے باشندوں میں برس ہا برس سے یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ زوال کے پہلے تین دنوں میں یہاں کا فرمانروا اپنے لوگوں کو کسی طرح کا کوئی حکم نہیں دے گا۔ اس کی حیثیت ایک عام شخص کی سی ہوگی۔ وہ کوئی حکم جاری کرے گا نہ اہم فیصلہ کرے گا۔ اگر ایسا کرے گا تو اس کا اقتدار اور وہ خود شدید آفات کا شکار ہو جائے گا۔ چاند کے زوال کے یہ تین دن یہاں کا حاکم بڑی خاموشی اور تساہل سے گزارتا ہے۔ شوراق بھی ایسا ہی کرتا ہے‘ مگر شوراق کو ایک برتری بھی حاصل ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جیسا کہ تم بھی جانتے ہو کہ شوراق حیوانات کے ذہن میں داخل ہونے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا ملکہ رکھتا ہے......... اس کی یہ صلاحیت اسے زوال

کے ان تین دنوں میں بھی متحرک رکھتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زوال کے ان دنوں میں بھی اسے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنا کام حیوانات کے ذریعے نکال لیتا ہے۔ شاید کوئی باہر کا شخص میری اس بات کو مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دے لیکن تم تو اب کافی عرصے سے اس جزیرے پر موجود ہو' میرا خیال ہے کہ تم میری بات کی حقیقت کو سمجھ رہے ہو۔

میں نے اثبات میں سرہلایا۔

وہ بولا۔ "تم نے دیکھ لیا ہے کہ محل سے فرار ہونے کے بعد ابھی تک کسی نے تمہارا تعاقب نہیں کیا اور نہ آئندہ تین دن تک تمہیں اس قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہے۔ ہاں جانوروں کی طرف سے تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔"

ایک بار پھر کچھ فاصلے سے اسی بدمست ہاتھی کی مدہم چنگھاڑیں سنائی دینے لگیں جو مسلسل میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میرے ماسک پوش محسن نے بھی یہ آوازیں سن لی تھیں۔ مطمئن لہجے میں بولا۔ "ان آوازوں کی طرف سے فکرمند ہونے کی تم کو اب زیادہ ضرورت نہیں۔ ہم جہاں موجود ہیں یہاں چاروں طرف تناور اور گھنے درخت ہیں۔ یہ درندہ جتنا مرضی سر پٹخے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ویسے بھی یہ زخمی ہے میرا چلایا ہوا ایک تیر یقیناً اس کی آنکھ میں لگا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں تمہاری شکل دیکھ سکتا ہوں؟"

وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں' ہماری شکل بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی عام بوگالیوں کی ہے۔ لمبے بال' کانوں میں بالیاں' ناک تھوڑی سی موٹی۔ کوئی علیحدہ بات نہیں ہے ہم لوگوں میں۔ ہمارے روحانی پیشوا کا ہمیں حکم ہے کہ ہم دن کے اجالے یا کسی بھی طرح کی روشنی میں کسی اجنبی کے سامنے اپنا منہ نہیں کھولیں گے......... اور معاف کرنا تم بھی ہمارے لئے اجنبی ہو۔"

"ایک اجنبی کے لئے اتنی خیر خواہی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ خیر خواہی اس لئے ہے کہ ہمارا اور تمہارا دشمن ایک ہے۔" اس نے شوراق کا نام تو نہیں لیا' مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ مطلب یہی ہے۔

میں نے کہا۔ "میں نے کہیں سے سنا ہے کہ تم لوگ شوراق کی بیوی معزز خاتون

قاردبا کے قبیلے سے ہو؟"

"تم نے درست سنا ہے اور ہمیں اس بات پر فخر ہے۔"

"میں تمہیں کس نام سے پکار سکتا ہوں؟"

"تم مجھے شوش کہہ سکتے ہو۔ شوش ہماری زبان میں باغی کو کہتے ہیں اور ہمیں اپنے باغی ہونے پر بھی فخر ہے۔ میں نے اپنی مرضی سے اپنا پہلا نام ترک کر دیا ہے اور اب صرف شوش کہلواتا ہوں۔"

باہر سے بھیڑیوں کی جو آوازیں آرہی تھیں وہ پہلے سے واضح ہو گئی تھیں۔ میرے ہمدرد شوش نے درست ہی کہا تھا ان میں کوگر کی نامانوس آواز بھی شامل تھی۔ شوش نے مجھ سے کہا کہ میں دروازہ اندر سے اچھی طرح بند رکھوں وہ میرے زخمی پاؤں کے لئے دوا لے کر ابھی آتا ہے۔

وہ احتیاط سے باہر نکل گیا۔ میں نے دروازے کی نچلی درز میں پھر سے اچھی طرح کپڑا ٹھونس دیا۔ میرا ذہن ہلچل کا شکار تھا۔ میری نگاہیں سامنے کاشف کے چہرے پر تھیں۔ کاشف کی آنکھیں بند تھیں اور ایک نتھنے سے پھر تھوڑا سا خون رس آیا تھا۔ میں نے اپنے رومال سے یہ خون صاف کیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ کیا یہ وہی کاشف تھا جسے میں اپنے جسم کا نصف حصہ سمجھتا تھا۔ یہ اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ مجھے گزرے دنوں کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ میرے ذہن میں رینگنے والے چھوٹے چھوٹے شک بڑے بڑے سانپ بن کر میرے سامنے آگئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کاشف اس دن سے آرزو کے چکر میں پڑ گیا ہو جس دن وہ ایبٹ آباد میں میرے ہمراہ پہلی بار آرزو کے گھر میں گیا تھا اور بعد میں اس نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا تھا۔ یار! بھابی تو زبردست ہے۔ بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے۔" اس کے بعد سے ہی مجھے کاشف کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا تھا۔ بہت سی باتیں ترتیب وار میرے ذہن میں آتی چلی گئیں' پھر چند ہفتے پہلے کی وہ بات بھی ذہن میں آئی جو ایک پھانس کی طرح میرے دماغ میں چھپی ہوئی تھی۔ لانچ پر سورن عرف پہلوان کی موت دیکھنے کے بعد ہم بھاگ کر ایک کھوہ میں چھپ گئے تھے۔ صبح سویرے کاشف پیشاب کرنے کے لئے کھوہ سے نکلا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر اچانک شوراق کے کارندوں نے کھوہ

پر ہلہ بول دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ.......... اس وقت میری گرفتاری میں بھی کاشف ہی کا ہاتھ ہو۔ میں جوں جوں سوچ رہا تھا واقعات ایک زنجیر کے حلقوں کی طرح آپس میں جڑتے چلے جا رہے تھے.......... ابھی کچھ ہی دیر پہلے محل کے مہمان خانے میں کاشف کے ساتھ میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی اس طویل زنجیر کا ایک حلقہ ہی تھی۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کاشف مجھ سے کبھی اس انداز میں بات کرے گا پھر مجھے وہ روح فرسا منظر یاد آیا جب لڑائی کے دوران کاشف نے کسی عقاب کی طرح مجھے عقب سے دبوچ لیا تھا اور میری گردن کے گرد ایسا شکنجہ کسا تھا کہ میری جان پر بن گئی تھی۔ میری سوچوں کے تانے بانے کو ہمارے ہمدرد کی آمد نے توڑا۔ وہ میرے پاؤں کے لئے دوا لے آیا تھا۔ دوا لگانے کے بعد اور کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اچانک کاشف کسمسایا اور چند سیکنڈ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے در و دیوار کو دیکھتا رہا' پھر اس کی نگاہ میرے چہرے پر مرکوز ہوئی اور وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرنے سے اس کے سر میں شدید ٹیس اٹھی تھی اور اس کا رنگ ہلدی کی طرف زرد ہو گیا تھا۔

کتنی ہی دیر گم صم رہنے کے بعد وہ بولا۔ "میں کہاں ہوں جلال؟"

"جنگل کے اندر ایک بہت بے کار سی جگہ پر۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں مہمان خانے میں اپنی شاندار خواب گاہ یاد آ رہی ہے۔"

"طنز مت کرو جلال! میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں لیکن پہلے مجھے یہ تو پتہ چلے کہ میں کہاں ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمارے درمیان کہنے سننے کو کچھ باقی نہیں رہا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ کچھ باقی ہو۔ تم بہت غلط انداز میں سوچ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ ہم کہاں ہیں؟"

میں پہلے تو خاموش رہا پھر اس کے اصرار پر مختصر الفاظ میں اسے بتا دیا کہ محل کے مہمان خانے سے نکلنے کے بعد وہ کہاں پہنچا ہے.......... اس کے سر پر آنے والی گہری چوٹ کے سبب اس کے نتھنے سے بار بار خون بہنے لگتا تھا۔ وہ میری بات بڑے دھیان سے سنتا

رہا پھر اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ تمہارے دل میں میرے متعلق بہت ی بدگمانیاں ہوں گی۔"

"بدگمانیاں تو پہلے تھیں کاشی! اب تو ساری دور ہو گئی ہیں۔"

وہ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ایک دم ہاتھ بڑھائے اور میرا سر اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا انداز اتنا غیر متوقع تھا کہ چند لمحے کے لئے میں حرکت تک نہ کر سکا۔ وہ میرے سر کو چوم رہا تھا۔ میری گردن کو میری پیشانی کو.......... اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا اور آنکھوں سے آبشار بہہ نکلے تھے۔ اس رد عمل نے مجھے ہلا ڈالا۔ میں نے اپنا آپ اس کے بازوؤں سے چھڑایا' اور دیوار کے ساتھ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"بند کرو یہ تماشا۔ تمہاری یہ حرکتیں مجھے زہر لگ رہی ہیں۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ بس اپنے ریشمی کرتے کی آستین میں اپنے آنسو جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دو تین منٹ تک کیبن میں خاموشی طاری رہی' پھر اس نے سرخ اشکبار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے نتھنے سے خون پونچھ کر گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے معلوم تھا تم نے مجھ سے بدگمان ہو جانا ہے۔ میں تم سے شکوہ نہیں کروں گا۔ شاید تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کچھ کرتا جو تم نے کیا ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو شاید میں تمہارے سامنے اپنی صفائی بھی پیش نہ کرتا۔ سب کچھ اپنے دل میں رکھ لیتا۔ مگر مجبوری ہے صورت حال کی وضاحت بھی ضروری ہے ورنہ ہماری مشکلات اور بڑھ جائیں گے۔"

"تم بات مختصر کرو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"مختصر ہی کر رہا ہوں۔ شاید زیادہ وقت بھی نہیں ہے ہمارے پاس.........." وہ چند لمحے سر جھکا کر مناسب الفاظ جمع کرتا رہا پھر کہنے لگا۔ "جلال! آج.......... میں تمہارے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ ایبٹ آباد سے روانہ ہونے سے پہلے میں ایک بار آنٹی تابندہ کے مرشد شاہ جی سے ملا تھا۔ یہ ملاقات میں کیسے اور کیونکر کر سکا یہ ایک علیحدہ کہانی ہے' بہرحال میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ جی سے ملنا اور ان سے باتیں کرنا

میرے لئے ایک بہت بڑے انقلاب کا سبب بنا تھا.......... تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ایک بالکل مختلف ذہن کا آدمی رہا ہوں۔ فلسفہ نفسیات اور روحانیت وغیرہ میرے نزدیک بے معنی لفظ تھے۔ اسی طرح جادو ٹونہ' آسیب اور اس طرح کی دوسری باتوں پر بھی مجھے بالکل یقین نہیں تھا۔ مگر اس روز ایبٹ آباد میں شاہ جی سے ملنے کے بعد اور دو تین گھنٹے ان کی صحبت میں رہنے کے بعد میرے ذہن اور فکر میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس ماحول میں گزرے ہوئے چند گھنٹوں نے میرے برسوں کے نظریات کو بکھیر کر رکھ دیا۔ اس روز یوں تو شاہ جی سے بہت سی باتیں ہوئیں لیکن جو باتیں آرزو کو پیش آنے والے واقعات اور آرزو کی گمشدگی کے متعلق ہوئیں وہ میرے لئے بے حد بے حد اہم تھیں۔ اس روز شاہ جی نے مجھے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ آرزو کسی نہایت طاقتور اور نامعلوم اثر کے گھیرے میں ہے۔ انہوں نے بڑی رازداری سے مجھے آگاہ کیا کہ وہ کئی دفعہ گہرے مراقبے میں گئے ہیں اور آرزو کی گمشدگی کے متعلق جاننے کی کوشش کی ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی.......... بس کچھ دھندلے دھندلے سے خاکے ہیں جو مراقبے کے وقت میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور اوجھل ہوجاتے ہیں۔ میرے اصرار پر شاہ جی نے مجھے اس بارے میں تفصیل سے بتایا۔ انہوں نے کہا۔

"جب میں مراقبے کی انتہا پر پہنچتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک نامانوس سا علاقہ آتا ہے۔ جیسے کوئی سمندری جزیرہ' جس پر ناریل اور تاڑ کے لمبے لمبے درخت ہیں۔ زمین ریتلی ہے۔ اس جزیرے کے درختوں کے نیچے گندمی اور سانولے رنگ کے لوگ گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ حبشی نہیں ہیں۔ ان کی شکلیں ویسی ہی ہیں جیسی مدراسیوں یا سری لنکا وغیرہ کے لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میں آرزو کو انہی لوگوں کے درمیان دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے پر مجھے پریشانی اور بے بسی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی آرزو کے آس پاس مجھے لمبے بالوں والا ایک سخت گیر شخص بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شکل میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پاتا ہوں۔ اس کے چہرے کے چاروں طرف مجھے ایک سیاہ ہالہ سا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی میدان میں بہت سے لوگوں کو جمع دیکھتا ہوں۔ یہ میدان اور یہ لوگ اسی جزیرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے لوہے کے کچھ بند دروازے بھی نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی دل میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان دروازوں کے پیچھے جان نکالنے والا

رشتہ کسی انسان یا جانور کے روپ میں بند ہے اور یہ کسی ایک مراقبے کا حال نہیں ہے۔ یں نے آرزو کے حوالے سے جب بھی خود پر یکسوئی کی کیفیت طاری کی ہے۔ میں نے ہی کچھ دیکھا ہے۔"

شاہ جی کی باتیں سننے کے بعد اور ان کے خیالات جاننے کے بعد نہ جانے کیوں مجھے ایک دم یقین آگیا تھا کہ آرزو زندہ ہوگی' اور اس کے ساتھ ہی میں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ آرزو کو ڈھونڈوں گا۔ شاہ جی ایک کامل بزرگ ہیں' میرا اندازہ ہے کہ وہ ذہنوں کے اندر اٹھنے والے خیالات بھی بھانپ لیتے ہیں۔ انہوں نے بوقت رخصت مجھ سے کہا۔ "تم کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ اپنے ارادے سے میں کسی کو شریک نہ کرنا اور نہ کسی پر ظاہر کرنا۔ خاص طور سے اپنے دوست پر۔ اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو کسی حد تک سنبھالا ہے۔ اس کو کوئی ایسی امید نہ دلانا جو بعد میں پوری نہ ہو اور اس کو پھر توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہ ایک دھندلا سا بہت دھندلا سا امکان ہے۔ اس کو بس اپنے تک ہی رکھنا۔"

"میں نے شاہ جی سے وعدہ کیا کہ جب تک مجھے کوئی ٹھوس بات نظر نہیں آجائے گی میں ان ساری باتوں کو اپنے تک ہی رکھوں گا۔"

کاشف نے ذرا توقف کرکے ایک بار پھر اپنے نتھنے سے بہنے والا لہو پونچھا اور بولا۔

"اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا جلال! تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے اپنی پلاننگ تم پر ظاہر نہیں ہونے دی مگر سوچ وہی تھی جو میں شاہ جی کے حجرے سے لے کر چلا تھا۔ ہم انڈیا پہنچے اور وہاں سے گھومتے گھماتے سری لنکا آگئے۔ ہم خلیج بنگال اور ہند کے سمندر میں مختلف جزیروں پر بھٹکتے رہے ہیں' وہاں کے لوگوں سے ملتے رہے ہیں' معلومات اکٹھی کرتے رہے ہیں' بہرحال ہم جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں' وہ درحقیقت صرف اور صرف آرزو کی تلاش کے سلسلے میں تھا۔ کئی بار جی میں آتی تھی کہ سب کچھ تمہیں بتادوں مگر پھر شاہ جی کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے تھے' پھر میں سوچتا تھا کہ شاید کوئی ایسا وقت آجائے جب انہی ویران جزیروں پر بھٹکتے بھٹکتے میں تمہیں کوئی انتہائی خوشگوار سرپرائز دے سکوں' تم میری باتیں سن رہے ہو ناں جلال؟"

"ہاں سن رہا ہوں' مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ کیوں تم ایک دم اتنا بدل گئے۔ یہاں

تک کہ ...." میں کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ "ہاں ہاں' جو کہنا چاہتے ہو کہو۔ میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔"

"تم اجنبی نہیں ہو' مگر کبھی کبھی اتنے اجنبی لگے ہو کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کیا تم نے یہ سب کچھ؟"

اس کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ آگئی۔ بولا "پہلے سب کچھ سن تو لو' پھر کوئی فیصلہ صادر کرنا یار........ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ میری کایا پلٹ ہو چکی ہے۔ میں جو سرے سے روحانیت اور پُراسراریت کا منکر تھا اب بالکل برعکس ہو چکا ہوں۔ مجھے اب ان دیکھی چیزوں پر یقین ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو انسانی عقل و دانش کے دائرے سے باہر ہے۔ اس جزیرے پر آنے کے دو ہی دن بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم اس پُراسرار سرزمین پر پہنچ چکے ہیں جس پر ایک ماورا ذہن حکومت کرتا ہے اور جس کی تیز نظریں یہاں ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ ہم اس شخص سے بچ نہیں سکیں گے' جس کا نام شوراق ہے' اور جو اپنی انوکھی صلاحیت کی طاقت سے اس جزیرے کا حاکم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک یہ بات تم پر بھی بڑی اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ شوراق ہپناٹزم کی ایک انوکھی طرز کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے' وہ حیوانات کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور انہیں اپنی منشا کے مطابق ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے........ آج میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے جب تم کھوہ کے اندر سے گرفتار ہوئے تو اس گرفتاری میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ میری ہی اطلاع پر تمہیں شوراق کے کارندوں نے پکڑا تھا اور جرأت سنگھ نامی قیدی کے ساتھ کوٹھڑی میں بند کیا تھا۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال چیخ رہا ہو گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ تو میرے یار' اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا جتنا تم سے دور رہ کر اور شوراق کے قریب رہ کر پہنچا سکتا تھا۔ میں نے تم سے بے وفائی کی لیکن یہ بے وفائی ہی میری وفا ہے شہزادے۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر سے بولنا شروع کر دیا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس نے جو کچھ مجھے بتایا وہ چشم کشا و حیرت ناک بھی تھا اور نہایت مدلل

ہی........ اس نے جو کچھ کہا اس کا لب لباب کچھ اس طرح ہے۔

"شوراق اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت ہمارے اس جزیرے پر اترتے ہی بلہ شاید اترنے سے پہلے ہی ہمارے بارے میں جان چکا تھا' جزیرے پر ہمارے اترنے کے یک دن بعد تک شوراق کی یہ خواہش تھی کہ ہم ڈر کر یہاں سے واپس چلے جائیں اسے اشف اور دیگر ساتھیوں سے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا مجھ سے تھا' یہ بات اس کے علم میں ی کہ میں آرزو کی محبت میں گرفتار ہوں اور آرزو بھی مجھ سے محبت کرتی ہے شروع ں اس نے ہمیں اپنی شعبدہ بازی سے خوفزدہ کر کے جزیرے سے بھگانے کی کوشش کی۔ ارے دسترخوان پر کوؤں کا خونی حملہ اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ بعد ازاں جب ہم جزیرے ں موجود آبادی سے آگاہ ہو گئے تو شوراق نے ہمیں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ہم بھاگ لئے۔ پراتھا' اکبر خان' جولیا اور راجہ تو یکے بعد دیگرے پکڑے گئے مگر ہم روپوش ہونے ں کامیاب رہے۔ شوراق اس بات پر سخت پریشان تھا کہ سب سے اہم شخص یعنی میں روپوش ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اس موقع پر کاشف نے کھوہ سے نکل کر مجھے رامائی انداز میں گرفتار کرا دیا اور یوں شوراق کی نگاہ میں وعدہ معاف گواہ کی حیثیت تیار کر لی۔ اس کے بعد کاشف نے اپنی ذہانت اور ہوشیاری سے شوراق کو شیشے میں ارنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے اسلحہ سازی میں اپنی مہارت اور استعداد کے سلے میں شوراق پر اپنی دھاک بٹھائی اور اسے بتایا کہ اگر اس جزیرے پر اسے تھوڑے ے وسائل مہیا کر دیئے جائیں تو وہ زبردست رائفلیں' ہینڈ گرنیڈ اور ڈائنامیٹ وغیرہ بنا تا ہے۔ اب شوراق اور اس کے قریبی ساتھیوں نے بھانپ لیا تھا کہ کاشف ایک کارآمد ص ہے' اور کچھ لالچی بھی ہے۔ اس کو آرام دہ زندگی اور عیش و عشرت کا سامان مہیا رکے وہ اس سے اہم کام لے سکتے ہیں۔ اب مستقبل میں کوئی اچھا کام لینے کے لئے راق نے کاشف کو اپنی گڈ بک میں شامل کر رکھا تھا اور مہمان خانے میں رہنے کا اعزاز ل رکھا تھا۔ اس قربت سے کاشف کے بقول وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس نے راق اور اس کے خانوادے کے حوالے سے کئی اہم نہایت مفید حقائق دریافت کئے ہے۔"

میں بڑی توجہ سے کاشف کی باتیں سن رہا تھا۔ بیچ میں' میں نے چند ایک سوال بھی

کئے۔ کاشف نے کہا۔ ”میں یہاں شوراق کے لئے ایک اور نہایت اہم کام بھی انجام دے رہا ہوں اس کے بارے میں جان کر تمہیں یقیناً نہایت حیرانی ہو گی۔“

”حیرانی تو ہربات پر ہو رہی ہے۔“

وہ بولا۔ ”تم میرا لباس اور میری ٹپ ٹاپ دیکھ رہے ہو۔ جانتے ہو یہ کس لئے ہے؟“

”جہاں اتنا کچھ بتایا ہے یہ بھی بتا دو۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ وہ بولا۔ ”یہ سب کچھ قاردبا کو ورغلانے کے نہایت خفیہ منصوبے کا حصہ ہے؟“

”ورغلانے کا منصوبہ؟“

”میرا خیال ہے کہ میں شروع سے بات بتاؤں گا تو تمہیں آسانی سے سمجھ میں آئے گی اور یہ پتہ بھی چلے گا کہ آرزو کئی ماہ سے شوراق جیسے حسن پرست کے قبضے میں ہونے کے باوجود ابھی تک محفوظ کیوں ہے؟“

”ہاں......... کہو۔“

”تم نے اپنے قید خانے سے بھاگنے کے لئے گارڈ کی وردی پہنی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس وردی کی جیب میں سگریٹ بھی موجود ہو۔“

میں نے جیب ٹٹولی۔ ”ہاں سگریٹ تو موجود ہے مگر‘ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہاں دھوئیں کے گزرنے کے لئے کوئی درز موجود نہیں۔ بہتر ہے کہ صبر کرو۔“

”اوکے ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ چند لمحے کے لئے اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں‘ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”جو معلومات مجھے اب تک حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے اس جزیرے کا حاکم روبیل نام کا ایک شخص تھا۔ وہ حد درجہ عیاش اور بدمست شخص تھا۔ خوبصورت عورت اس کی کمزوری تھی۔ نوخیز لڑکیوں سے لے کر جواں سال اور درمیانی عمر کی عورتوں تک کوئی بھی خوش شکل اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں تھی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ہر رات ایک نئی عورت کے ساتھ گزارتا ہے ممکن ہے کہ درست نہ ہو لیکن اس کی بوالہوسی اپنی مثال آپ تھی۔ جزیرے کے محل میں ایک بہت بڑا حرم اس نے آباد کر رکھا تھا اور اس میں ہر رنگ و

نسل کی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ ان میں وہ بہت سی قیدی عورتیں بھی شامل تھیں جو روبیل کو بحری قزاقی کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھیں۔ جزیرے کا روحانی پیشوا جو اس جزیرے کا معمر ترین بزرگ بھی تھا روبیل کی ان ساری خرمستیوں پر دل ہی دل میں بہت نالاں تھا۔ وہ روبیل کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر یہ سب نصیحتیں اس بدمست سانڈ پر بے کار تھیں۔ جب معاملات حد سے زیادہ بگڑ گئے تو جزیرے کے اس اباد نامی معمر ترین شخص نے روحانی پیشوا کی حیثیت سے روبیل کو منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس منصوبے کے سلسلے میں اس کی نگاہ انتخاب جزیرے کے ایک صحت مند‘ مضبوط اور ہوشیار شخص پر پڑی۔ اس کا نام شوراق تھا۔ ان دنوں وہ بیس بائیس سال کا نوجوان تھا اور کھیتی باڑی کرتا تھا۔ روحانی پیشوا اباد نے شوراق کے سر پر اپنا دست کرم رکھا اور اسے اپنے جسم میں موجود ایک ایسی روحانی قوت سے نواز دیا جس کا کوئی بدل تھا اور نہ توڑ......... اس عظیم قوت یا مہان شکتی کو ہپناٹزم کی ایک خاص قسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قوت کا حامل شخص حیوانات سے ذہنی رابطہ قائم کرتا ہے اور سوچ کی لہروں سے انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس قوت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ہپناٹزم یا مسمریزم میں سجیشن کے لئے عامل کے سامنے معمول کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن شوراق کی صلاحیت ایسی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ بہت دور سے بغیر کسی ظاہری رابطے یا شناخت کے اپنے معمول پر حیرت انگیز کامیابی سے اثر انداز ہوتا ہے......... ہاں تو میں بات کر رہا تھا روبیل کو منظر سے ہٹائے جانے کی۔ شوراق کے پاس یہ قوت آئی تو اس جزیرے کی ساری حیوانی قوت بھی اس کے پاس آ گئی۔ اس نے چند دنوں کے اندر روبیل سے جزیرے کا اختیار چھین لیا۔ روبیل جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش میں شارک مچھلیوں کا شکار ہو گیا اور اس کے قریبی ساتھی بھی جزیرے کے مختلف حصوں میں مارے گئے۔ روبیل کا صفایا ہونے کے بعد شوراق پوری تمکنت کے ساتھ جزیرے کے محل میں جلوہ افروز ہو گیا.........

”روحانی پیشوا اباد نے شوراق کو اپنی مہان شکتی چند اہم شرائط کے ساتھ دی تھی۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جزیرے میں عورتوں کے حقوق کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کی جائے گی۔ جن دنوں اباد اور شوراق مل کر عیاش روبیل سے اختیار چھیننے کی

کوشش کر رہے تھے' انہی دنوں اباد کی قبول صورت بیٹی قاروبا سے شوراق کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ اباد نے شوراق کی نجی زندگی پر بھی کچھ پابندیاں عائد کی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ بیوی قاروبا اور دو عدد کنیزوں کے سوا کوئی چوتھی عورت کبھی شوراق کی زندگی میں داخل نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوگا تو شوراق کو اس مہان شکتی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے جو روحانی پیشوا کی طرف سے اسے ودیعت ہوئی ہے۔"

"اس وقت تو شوراق کو یہ شرط معمولی لگی تھی۔ ایک خوبصورت بیوی اس کی ملکیت تھی' اس کے علاوہ مقامی رواج کے مطابق وہ دو خوش شکل جوان کنیزوں کی قربت سے بھی مستفید ہوسکتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا شوراق میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ ایک بااختیار حاکم ہونے کے باوجود اور نہایت رنگین ماحول میں رہنے کے باوجود صرف دو تین عورتوں تک محدود رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال وہ اپنے عہد کے جال میں جکڑا ہوا تھا۔ وقت گزرتا رہا' اور واقعات اپنے راستوں پر آگے بڑھتے رہے۔ پندرہ بیس سال گزر گئے۔ شوراق باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کم جانتا تھا لیکن جتنا بھی جانتا تھا وہ اس کا تجسس بڑھانے کے لئے کافی تھا۔ شوراق کے دل میں سیاحت کا شوق چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ خاص طور سے اسے تاریخی جگہوں اور پرانے کھنڈرات سے دلچسپی محسوس ہوتی تھی......... ایک مرتبہ وہ اپنے دو قریبی ساتھیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر نکلا اور کئی ماہ تک سری لنکا اور ہندوستان کی سیاحت میں مصروف رہا۔ ہندوستان پُراسرار علوم کی سرزمین ہے' وہاں شوراق کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں تھیں۔ وہ عام سیاحوں کی طرح دہلی آگرہ اور کلکتہ کے بازاروں میں گھومتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے درمیان ایک پُراسرار جزیرے کا ایسا حاکم موجود ہے جس کی ماورائی صلاحیتیں ناقابل یقین ہیں۔ آگرہ میں پرانے محلات کے کھنڈروں کی سیر کے دوران میں اس کی نگاہ ایک حسین و جمیل لڑکی پر پڑی یہ لڑکی ایک تیر کی طرح سیدھی شوراق کے دل پر لگی اور وہ لوٹ پوٹ ہوگیا۔ تم جانتے ہو' وہ لڑکی کون تھی؟" کاشف نے مجھ سے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ "وہ لڑکی آرزو تھی۔ میرا خیال ہے کہ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ کہیں انڈیا گئی تھی اور اس نے اپنے والدین کے ساتھ آگرے کی تاریخی جگہوں کی سیر کی تھی۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے آرزو کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ اس نے

ایک مرتبہ بتایا تھا کہ جب وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی اپنے گھر والوں کے ساتھ انڈیا گئی تھی۔ انڈیا میں اس کی والدہ کی ایک مسلمان سہیلی تھیں جو دوپٹہ بدل بہن بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاں کسی کی شادی میں شرکت کے لئے انہیں انڈیا جانا پڑا تھا۔ وہاں وہ لوگ ایک مہینہ رہے تھے۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" کاشف نے پوچھا۔

"بس یونہی ایک خیال آگیا تھا' تم اپنی بات جاری رکھو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "شوراق نے آگرے کے ان کھنڈرات میں آرزو کو دیکھنے کے فوراً بعد ہی اسے اپنے دل دماغ کا روگ بنالیا تھا۔ وہ اپنی تمام تر غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگیا' اور اس سے بہت دور رہتے ہوئے بھی ہر وقت اسے اپنی نگاہ میں رکھنے لگا۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک آسیب تھا جو آرزو کی بے خبری میں اس سے چمٹ گیا تھا۔ وہ پاکستان اور لاہور سے ہزاروں میل دور بحرہند کے اس جزیرے میں بیٹھا تھا اور آرزو کی ہر ہر حرکت سے آگاہ رہتا تھا۔ یہ باتیں ناقابل یقین لگتی ہیں مگر ان کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے......... اب تم سے زیادہ میں ایسی باتوں پر یقین رکھنے لگا ہوں۔ تمہاری کہی ہوئی بہت سی پرانی باتیں یاد آتی ہیں اور ان کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ کبھی تم لاہور کی گلیوں میں گھومنے والے ایک کالے کتے کا ذکر کیا کرتے تھے اور میں اس بات کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سب کچھ حقیقت کے بہت قریب تھا۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ اس جزیرے سے ہزاروں میل دور وہ کتا شوراق کے ہرکارے کی حیثیت ہی رکھتا ہو۔ آرزو کے پہلے شوہر کو اپنی سہاگ رات میں جو جان لیوا حادثہ پیش آیا اس کا سبب وہ کتا ہی بنا ہو......... اور بعد ازاں اسی کتے نے ایبٹ آباد میں ڈاکٹر رفیق کی جان بھی سہاگ رات میں لی ہو۔"

میں نے کاشف کی بات قطع کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شوراق کی پُراسرار قوت ہی آرزو کی شادیوں میں رکاوٹ بنی ہے؟"

"یہ بات کم از کم میرے لئے اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔"

"اگر ایسی بات تھی تو شوراق نے اپنی مہان شکتی اور لمبے ہاتھوں کا استعمال کیوں نہ کیا۔ آرزو کی زندگی میں آنے والے لڑکوں کو مارنے کی بجائے اسے جزیرے میں اٹھا کر

کیوں نہ لے گیا؟"

"میں اب تمہیں اسی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق شوراق کی بیوی قاروبا اس سارے معاملے میں پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ آرزو کے لئے شوراق کی روز افزاں دیوانگی دیکھ کر اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر شوراق نے اس لڑکی کو اس جزیرے میں لانے کی کوشش کی تو ان کی ازدواجی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ شوراق نے ہر وقت آرزو پر نگاہ تو رکھی مگر اسے جزیرے پر لانے کی کوشش نہیں کی.......... جوں جوں وقت گزر رہا تھا' شوراق کی بیوی قاروبا اور دونوں کنیزیں اپنی کشش کھوتی جا رہی تھیں۔ ان کا شباب ڈھل رہا تھا' دوسری طرف آرزو کے حوالے سے شوراق کی آتش شوق تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ جب پیر شاہ جی کے منع کرنے کے باوجود آرزو کے والدین نے تیسری مرتبہ آرزو کا گھر بسانے کی کوشش کی تو شوراق کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کو اپنے پاس لے آئے گا' یہ ان دنوں کی بات ہے جب ڈاکٹر رفیق کے پُراسرار قتل کے بعد آرزو تھانے کچہری کے چکر میں پڑی ہوئی تھی۔ شوراق نے اپنی پُراسرار ذہنی قوتوں کو اس طرح استعمال کیا کہ آرزو کے دل و دماغ میں ایک آگ لگ گئی۔ کوئی نامعلوم کشش اپنے ہزاروں ہاتھوں سے اسے اپنی طرف کھینچنے لگی.......... آرزو ایبٹ آباد کی اس منحوس پولیس چوکی سے غائب ہو گئی۔ وہ وہاں سے ہزاروں میل دور اس جزیرے تک کیسے پہنچی' وہ خود کھنچتی چلی آئی یا اسے کسی طریقے سے پہنچایا گیا اس بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔ بہرحال وہ یہاں پہنچ گئی اور اب تک یہاں ہے۔ شوراق اپنی ان گنت آنکھوں کے ذریعے ہر گھڑی اس کا نگران ہے لیکن وہ اسے پا نہیں سکتا۔ آرزو کو حاصل کرنے کا شوراق کے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ شوراق کی کسی کوشش کے بغیر قاروبا اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ وہ طبعی موت مر جائے یا پھر اپنی رضا و رغبت سے شوراق سے علیحدگی اختیار کر لے یہ دونوں کام مستقبل قریب میں تو ہوتے نظر نہیں آتے۔ تاہم شوراق کے ارادے اٹل ہیں۔ اسی طرح تیس چالیس سال بھی گزر جائیں تو شوراق آرزو کو آزاد نہیں کرے گا۔ وہ خود اس کے قریب آئے گا اور نہ کسی اور کو جانے دے گا۔ اگر کوئی ایسی جسارت کرے گا تو اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے ابھی کچھ دیر پہلے بتایا ہے کہ تم شوراق کے لئے ایک بہت خاص کام بھی انجام دے رہے ہو۔ اس حوالے سے تم نے اپنی ظاہری ٹپ ٹاپ کا ذکر بھی کیا ہے۔"

"میں اب اس طرف آ رہا تھا۔" کاشف نے اپنے زخمی سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہیں کافی عجیب لگے گی۔ مگر میں جو کچھ بھی تمہیں بتا رہا ہوں وہ اول تا آخر سچ ہے.......... شوراق ہر صورت میں قاروبا سے چھٹکارہ چاہتا ہے۔ اس نے میرے ذمے ایک اہم کام لگایا ہے' اور وہ کام ہے قاروبا کو ورغلانے کا۔ شاید تم نے قاروبا کو دیکھا ہی ہوگا۔ اس کی عمر اب پینتالیس سال کے لگ بھگ ہے' مگر وہ نسبتاً کم عمر نظر آتی ہے اور اب بھی اس میں تھوڑی بہت کشش موجود ہے۔ شوراق کی خواہش تھی کہ میں قاروبا سے میل ملاقات بڑھاؤں اور اس کو اپنے اندر دلچسپی لینے پر مجبور کر دوں۔ غالباً وہ قاروبا کو آزمانا بھی چاہتا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں' میں اکثر قاروبا سے ملنے محل کے زنان خانے میں جاتا رہا ہوں۔ وہ کارڈز بہت اچھے کھیلتی ہے' تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں بھی کارڈز اچھے کھیل لیتا ہوں۔ ہم گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے ہیں لیکن.........."

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ شوراق کی دلی تمنا پوری نہ ہو سکے۔ اس کے دل میں یہ خواہش چھپی ہوئی ہے کہ قاروبا مجھ میں Involve ہو جائے.......... اور یہ بات اتنی زیادہ آگے بڑھے کہ ایک دن قاروبا خود ہی شوراق کے راستے سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے اب تک جو تجزیہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ قاروبا گمراہ عورت نہیں ہے۔ وہ ایک بارہ سالہ بچے کی ماں بھی ہے۔ اس بچے کو بالآخر شوراق کی جگہ سنبھالنی ہے۔ وہ مجھ سے بے تکلف ضرور ہے اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ بے تکلفی اور بڑھ جائے مگر وہ ازدواجی رشتے کو مقدس سمجھتی ہے اور اس کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شوراق صرف ایک ہی صورت میں قاروبا کو اپنے راستے سے ہٹا سکتا ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ وہ اسے قتل کرا ڈالے لیکن اس صورت میں اسے شدید ترین نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شوراق کو سو فیصد یقین ہے کہ اس صورت میں حیوانات پر حکم چلانے کی طاقت اس سے چھن جائے گی

اور اس کے ساتھ ہی وہ اس جزیرے پر اپنا اقتدار بھی برقرار نہیں رکھ سکے گا۔"

میں کاشف کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اس کی گفتگو نے میرے ذہن سے شک کے کئی جالے صاف کر دیئے تھے۔ مگر دو اہم سوال ابھی تک ذہن میں کھٹک رہے تھے میں نے کہا۔ "کاشف' میں تمہاری ساری باتیں مانتا ہوں مگر ایک دو سوالوں کے جواب اب بھی مجھے نہیں ملے.......... ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے میں تم سے محل کے مہمان خانے میں ملا تو تمہارا رویہ سخت بیگانگی کا تھا۔ تم نے اپنے کارندوں کے ساتھ مل کر.........."

"مجھے معلوم تھا شہزادے' تم یہ سوال کرنے والے ہو۔" کاشف نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ "اور تمہارے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس وقت تم میری خواب گاہ میں داخل ہوئے' عین اس وقت ان لوگوں کو تمہاری موجودگی کا پتہ چل گیا تھا جو شوراق نے میری حفاظت پر مامور کر رکھے ہیں۔ وہ کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے ہماری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔ ان مسلح کارندوں کا انچارج ایک سری لنکن ہے اور وہ ہندی اردو وغیرہ بھی سمجھتا ہے' اگر میں تم سے نارمل لہجے میں بات کرتا تو میرا وہ بہروپ ختم ہو کر رہ جاتا جو میں نے شوراق کا اعتماد پانے کے لئے دھار رکھا ہے۔ تم اس صورت حال کی گہرائی تک پہنچو تو ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ جس وقت مسلح محافظوں سے لڑائی شروع ہوئی میں نے تمہیں عقب سے دبوچ لیا تھا' میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان لوگوں کو جانی نقصان پہنچا دو' کیونکہ ایسی صورت میں تم نے خطرناک مجرم قرار پانا تھا' افسوس کہ میں تمہیں اس الزام سے بچا نہیں سکا ہوں۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا' اب تو ہمیں آئندہ کے بارے میں سوچنا ہے.......... یہاں سے نکلنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے جہاں ہمیں سرتوڑ کوشش کرنا ہوگی وہاں کسی معجزے کی توقع بھی رکھنی ہوگی۔"

کاشف دیر تک اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ اس کی باتوں میں سچائی کی جھلک تھی۔ آخر وہ میرا یار تھا' میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اس کے اندر کے سچ یا جھوٹ کو پرکھنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرے اندر کاشف کے لئے جو ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی تھی وہ غلط فہمیوں کی اینٹوں

سے تعمیر ہوئی تھی۔ اب وہ روبرو تھا تو یہ اینٹیں خود بخود گرتی چلی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "کاشی' تم نے مجھے بڑا دکھ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ تم نے میری بہتری کے لئے ہی مجھ سے یہ باتیں چھپائی ہوں' مگر میں ایک عرصہ عذاب میں مبتلا رہا ہوں۔ میں تم سے چھپاؤں گا نہیں کیونکہ اس سے پہلے کبھی تم سے کچھ نہیں چھپایا۔ ایسے ایسے خیالات ذہن میں آتے رہے ہیں جن کے بارے میں سوچ کر اب شرمندگی میں ڈوب رہا ہوں۔ شاید لوگ سچ کہتے ہیں۔ جس سے پیار زیادہ ہو اس کی طرف سے بدگمانی بھی جلدی پیدا ہو جاتی ہے۔"

ہم دیر تک گلے شکووں میں مصروف رہے۔ ہمارا خیر خواہ شوش ہمیں چھوڑ کر ایسا گیا تھا کہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا.......... بہرحال اس کی طرف سے ہم پوری طرح مطمئن تھے.......... باتوں باتوں میں' میں نے کل رات کے سارے حالات بھی کاشف کے گوش گزار کردیئے۔ میں نے اسے بتایا کہ کل رات کیسے میں تین دیوہیکل کتوں کو شوٹ کرنے کے بعد آرزو سے ملنے اس کی خواب گاہ میں پہنچا.......... پھر کیسے میں نے محل کے برآمدے میں اسے (یعنی کاشف کو) دیکھا اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ آرزو کے بیڈ روم میں کاشف کے داخل ہونے اور آرزو سے باتیں کرنے کے حوالے سے بھی میں نے اپنی "باخبری" کاشف کو بتائی۔ وہ سب کچھ بڑے اطمینان سے سنتا رہا اور کہیں کہیں سوالات بھی کرتا رہا۔

آخر میں اس نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ "جلال! میری ایک ہی سگی بہن ہے اور وہ عاطفہ ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ لندن میں رہتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اگر میں کہوں کہ غلط کہہ رہا ہوں تو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کبھی کبھی تم ذرا دیر سے سمجھتے ہو.......... اگر میں یہ کہوں کہ میری دو سگی بہنیں ہیں' ان میں سے ایک کا نام عاطفہ ہے اور دوسری کا آرزو ہے تو پھر؟"

میں حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آرزو سے میرا خون کا رشتہ نہیں ہے جلال' لیکن وہ میرے

لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو عاطفہ کی ہے۔ جلال......... پچھلے ڈیڑھ مہینے میں' میں آرزو سے کئی بار ملا ہوں۔ اس کا ظاہر تو خوبصورت ہے ہی باطن اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ تم اپنی قسمت پر جتنا رشک کرو اتنا ہی کم ہے کہ تمہیں آرزو جیسی لڑکی کا پیار ملا ہے۔ وہ ایک......... آسمانی تحفے کی طرح ہے جلال' جسے بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ اس وقت ایک جان لیوا زہریلی آندھی کی زد میں ہے مگر اس آندھی میں بھی اس نے تمہارے پیار کے چراغ کو بجھنے سے بچا رکھا ہے۔ وہ اتنا پیار کرتی ہے تم سے......... کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

نہ جانے مجھے کیا ہوا' میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جاگ اٹھی' میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک دم کاشف کو سینے سے لگالیا۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں ایک دوجے سے پیوست رہے۔ مجھے ایک کندھے پر ہلکی سی نمی کا احساس ہوا۔ یہ آنسوؤں کی نہیں خون کی نمی تھی......... میں نے جلدی سے کاشف کو خود سے جدا کیا۔ اس کے نتھنے سے پھر خون رس رہا تھا۔ خاصی چوٹ آئی تھی اس کے سر میں اور میرے لئے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ میرے یار کو یہ چوٹ میرے ہاتھوں لگی تھی......... میں نے کاشف سے راجا کے بارے میں پوچھا۔ کاشف نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک اور محل میں ہی ہے۔

اس کیبن سے باہر اب یقیناً صبح کا اجالا پھیل چکا تھا تاہم کیبن کے اندر صرف ایک ٹارچ کی روشنی تھی' یہ ٹارچ بھی کئی گھنٹے روشن رہنے کے بعد اب کافی مدہم روشنی دے رہی تھی......... میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کاشف سے پوچھا۔ "اب کیا مشورہ ہے تمہارا۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے ہماری پلاننگ کیا ہونی چاہئے۔"

"پلاننگ تو طے ہو چکی ہے الو کے........." وہ میرا ہاتھ تھام کر جوش سے بولا۔

"اتنا عرصہ میں نے یہاں جھک نہیں ماری ہے' کوئی کام کیا ہے۔"

"کچھ وضاحت کرو گے؟"

وہ بولا۔ "تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہے کہ چاند کے زوال کی پہلی تین راتیں اس جزیرے میں بالکل مختلف طریقے سے گزرتی ہیں' ان راتوں میں شوراق انسانوں کی بجائے جانوروں سے کام لیتا ہے۔ یہ سلسلہ پورے تین دن تک جاری رہتا ہے' اس کے بعد تیسری رات کو عین جس وقت صبح کاذب کا اجالا مشرق سے نمودار ہوتا ہے' پہلی والی

صورت حال بحال ہو جاتی ہے' یعنی پھر سے جانوروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں پر بھی شوراق کے احکامات چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس تیسری رات میں ایک گھڑی بڑی اہم ہوتی ہے......... سمجھو کہ یہ چند منٹ کا وقت ہوتا ہے۔ یہ وہی صبح کاذب کے نمودار ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت تین چار منٹ کے لئے شوراق کا تسلط نہ حیوانات پر رہتا ہے نہ یہاں کے باشندوں پر اور......... میں نے جو منصوبہ بنایا ہے اس کے لئے یہ وقت اہم ترین ہے......... میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

کاشف کی یہ ڈرامائی گفتگو میں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اچانک مجھے کیبن سے باہر مدہم سی آہٹ سنائی دی۔ مجھے لگا شاید ہمارا ہمدرد شوش دستک دے رہا ہے۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا۔ پھر درز میں ٹھونسا گیا کپڑا بہ آہستگی نکالا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ مجھے دروازے کے سامنے کوئی کیڑا مکوڑا دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی کسی اور جانور کی جھلک نظر آئی۔ رات کو کہیں قریب سے بھیڑیوں اور کوگر کی جو آواز آتی رہی تھی وہ اب مدہم تھی۔ بس کبھی کبھار خاصے فاصلے سے رات والے دشمن جاں کی چنگھاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ چنگھاڑ کا فاصلہ اتنا ہی تھا جتنا رات کو تھا' اور یہ ایک تسلی بخش بات تھی۔ میں نے سائیلنسر لگا ریوالور ہاتھ میں لیا اور احتیاط سے باہر نکل آیا۔ اچانک مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میرے سامنے صرف دو گز کے فاصلے پر ہمارے ہمدرد شوش کی لاش پڑی تھی۔ اس کا نرخرہ کسی جانور نے یوں ادھیڑا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی تک نظر آنے لگی تھی۔ ماسک ابھی تک اس کے چہرے پر موجود تھا مگر خون سے لتھڑ چکا تھا۔ اس کی ایروگن بھی پاس ہی پڑی تھی۔

اچانک مجھے اپنے بالکل قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹتا کوئی نرم لچک دار سی شے ایک دم مجھ سے لپٹ گئی۔ خدا کی پناہ' وہ ایک اژدہا نما طویل سانپ تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے میرے جسم کے گرد دو بل کھائے اور اپنا خوفناک منہ میرے چہرے کے بالکل سامنے لے آیا۔ یہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر لمبی گھاس میں گر چکا تھا۔ اب میرے دونوں ہاتھ خالی تھے' میں نے ایک اضطراری حرکت کے تحت دونوں ہاتھوں سے اس سانپ کو سامنے سے دبوچ لیا۔ یہ رد عمل دکھانے میں مجھے ایک لمحے کی تاخیر بھی مزید ہوتی تو یقیناً یہ موذی مجھے اپنے ڈنک

کا نشانہ بنا چکا ہوتا۔ میں نے پورا زور لگا رکھا تھا تاکہ سانپ کے دانت میرے جسم سے دور رہیں' اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں اور منہ سے پھنکار نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ زور آزمائی کرتے ہوئے میں پشت کے بل شوش کی لاش کے بالکل پاس ہی گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ہراساں کاشف کا چہرہ دیکھا۔ اس نے بے جگری کا ثبوت دیتے ہوئے میری طرف قدم بڑھائے اور سانپ کے وہ بل کھولنے کی کوشش کرنے لگا جو میرے زیریں بدن کو جکڑتے چلے جارہے تھے پھر اچانک وہ واپس کیبن کی طرف لپکا' یقیناً کوئی ایسی شے ڈھونڈنا چاہتا تھا جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہوسکے۔ ابھی وہ موٹر بوٹ کے کیبن سے دو چار قدم دور ہی تھا کہ ایک اور دہشت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ مینگوشین کی ایک شاخ سے الٹا جھولتے ہوئے ایک رنگدار سانپ نے بڑی پھرتی سے کاشف پر حملہ کیا۔ اس نے ایک سیکنڈ کے اندر کاشف کی گردن میں پھانسی کا پھندا سا بنا دیا اور پھر اس کی پیشانی پر ڈنک مارا۔ کاشف کا جسم یوں اچھلا جیسے ہزاروں وولٹ کے ننگے تار سے چھو گیا ہو' اس کی ٹانگوں نے جیسے ایک دم اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ شاخ سے لٹکے ہوئے سانپ کے ساتھ ہی جھول گیا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ میں نے گھاس میں دیوانہ وار ہاتھ چلا کر اپنا ریوالور ڈھونڈا' میرا دوسرا ہاتھ اژدھا نما سانپ کے منہ کو بدستور مجھ سے دور رکھے ہوئے تھا۔ میں نے موذی جانور کی آنکھوں کے درمیان نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا کر اس کے سر کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ سانپ کے بل یک لخت میرے جسم پر ڈھیلے پڑ گئے اور پھر خود ہی کھلتے چلے گئے' میں چیختا ہوا کاشف کی طرف بڑھا۔ اسے ڈسنے والا سانپ اس وقت تک اسے چھوڑ چکا تھا اور اب خود کو سمیٹ کر درخت کی گھنی شاخوں میں اوجھل ہو رہا تھا۔ اس پر گولی ضائع کرنا اب بے کار تھا' میں کاشف پر جھپٹا اور اسے اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری نگاہ کاشف کے چہرے پر پڑی اور مجھے لگا کہ میری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی کاشف کے ہونٹ نیلے ہوگئے تھے اور پتلیاں اوپر چڑھنے لگی تھی۔ "کاشی........ کاشی۔" میں نے اسے دیوانہ وار جھنجھوڑا۔ نہایت زود اثر زہر بڑی سرعت سے کاشف کو مفلوج کر رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرر خرر کی آواز ہی نکل سکی۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس

کی پیشانی سے پیوست کیے اور زہریلا خون چوس چوس کر زمین پر تھوکنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں اسے آوازیں دے رہا تھا اور جھنجھوڑ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے زمین پر لٹایا اور کیبن کی طرف لپکا' یہاں پانی موجود تھا' میں نے ایک گلاس میں پانی لیا۔ قریب ہی شوش کی بھری ہوئی سیون ایم ایم رائفل بھی رکھی تھی۔ میں نے رائفل بھی اٹھائی اور باہر آگیا۔ کاشف کی صورت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ جھٹکوں سے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اسے پانی پلایا وہ اس کی باچھوں سے بہہ گیا' اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں مگر نہیں بھی دیکھ رہی تھیں........ اردگرد کی جھاڑیوں اور درختوں سے کئی اور سانپ لٹکنے لگے تھے۔ میں طیش سے بے قابو ہو کر اٹھا۔ سیون ایم ایم لوڈڈ تھی۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اندھا دھند فائر کرنے لگا۔ زمین پر رینگتے اور درختوں سے جھولتے کئی سانپوں کو میں نے نشانہ بنایا' ان کے خون کے چھینٹے اور کھال کے چیتھڑے فضا میں اڑتے دکھائی دیئے۔ وہ شاخوں سے اوجھل ہوگئے اور اردگرد کی گھاس میں بھی ان کی سرسراہٹ معدوم ہوگئی۔

میں پھر کاشف کی طرف متوجہ ہوا........ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں تارا ہوگئی تھیں اور چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ جھاگ کے چھوٹے چھوٹے بلبلے اس کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے لیکن میرا دل مان نہیں رہا تھا' میری آنکھیں میری نگاہ کو جھٹلا رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر دیوانہ وار اسے جھنجھوڑنے لگا۔ کربناک انداز میں اسے پکارنے لگا۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تم نہیں جاسکتے........ تم نہیں جاسکتے۔" میں جنونی انداز میں چیختا چلا جا رہا تھا۔

میں نے اس کے منہ سے منہ لگایا اور آخری کوشش کے طور پر اس کے سینے میں اپنا سانس داخل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میں نے اس کے سینے کو دل کے مقام پر دبانا شروع کردیا دکھ کی شدت سے میں جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں اس کی چھاتی پر مکے برسا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ "اٹھ جا کاشی........ اٹھ جا........ مجھے ایسے نہ ستا۔ یہ مذاق اچھا نہیں کاشی۔"

آخر اسے جھنجھوڑتے جھنجھوڑتے اور چیختے چیختے میں تھک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اپنی اور میری سلامتی کے تمام منصوبوں سمیت' سارے ارادوں سمیت وہ ہمیشہ کے لئے سو چکا تھا۔ زمین و آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے' ایک ایسی آتش بھڑکی تھی

میرے اندر جس سے کہیں پناہ نہیں تھی۔ جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں نے کاشف کو اپنی گود میں اٹھا کر موٹر بوٹ کے کیبن میں رکھا اس کی پیشانی کا خون پونچھا' پھر باہر سے شوش کی لاش کو بھی اٹھا کر کاشف کے قریب ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے کینوس کا وہ بیگ اٹھایا جس میں سیون ایم ایم رائفل کا ایمونیشن موجود تھا۔ میکانکی انداز میں جھک کر میں نے اپنے یار کی پیشانی کا ایک طویل بوسہ لیا اور آتشیں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرے قدموں کے نیچے زمین نہیں تھی' دہکتے ہوئے انگارے تھے۔

☆==========☆==========☆

میں جنگل میں اس مقام کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں رات کو میں نے گاڑی چھوڑی تھی۔ ابھی میں اس جگہ سے اندازاً دو تین فرلانگ دور ہی تھا کہ اچانک ایک شخص میرے سامنے آیا اور میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ اکبر خاں تھا۔ اس نے ایک بڑی چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کی بکل کو دور ہی سے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے چادر کے نیچے رائفل وغیرہ چھپا رکھی ہے۔

اس نے مجھے شانوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ "تم کدھر چلا گیا تھا برادر۔ ام تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا تھا۔"

میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کچھ باقی نہیں رہا اکبر بھائی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔"

میرے تاثرات دیکھ کر اکبر کا رنگ متغیر ہو گیا۔ "خو تم کو کیا ہوا ہے برادر۔ یہ تمہارے کپڑوں پر خون کے چھینٹے کیسا ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو اکبر بھائی.......... مجھے جانے دو۔ ان خنزیروں کو مار لینے دو یا خود مر جانے دو۔"

میں اکبر کو پیچھے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اکبر نے پھر لپک کر مجھے تھام لیا۔ "تم کیا کرتا ہے برادر۔ آگے بڑا خطرہ ہے۔ شوراق کے تین کتوں اور تین کارندوں کا لاشیں محل سے مل گیا ہے۔ اب وہ سارا حرامی لوگ پاگلوں کے مافق تم کو ڈھونڈتا پھرتا ہے ام تم کو آگے نہیں جانے دے گا۔" اکبر خان نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

میں نے زور لگا کر خود کو اکبر خان سے چھڑا لیا۔ "نہیں اکبر بھائی تم پیچھے ہٹ

جاؤ۔" میں دوڑنے والے انداز میں اس مقام کی طرف بڑھنے لگا' جہاں گاڑی چھوڑی تھی مجھے گاڑی دکھائی دینے لگی۔ اچانک جھاڑیوں سے خوفناک غراہٹیں ابھریں اور مجھے دو بھیڑیئے نظر آئے' دو تین بھیڑیئے ان کے پیچھے گھاس میں بھی تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جانور گاڑی کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ خون آشام جانور تیزی سے میری طرف لپکے۔ میں تو خود کسی ایسے لمحے کا انتظار کر رہا تھا' میں نے بلا تردد فائرنگ شروع کر دی' چند سیکنڈ کے اندر گاڑی کے گرد تین بھیڑیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور باقی فرار ہو چکے تھے۔

میں گاڑی میں بیٹھا' وہ ابھی تک درختوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے اسٹارٹ کر کے میں نے ریورس کیا اور راستے پر آ گیا۔ چاروناچار اکبر خان نے بھی میرے ساتھ نشست سنبھال لی۔ چند منٹ بعد ہم آندھی کی رفتار سے بوگالیوں کی وسیع بستی میں داخل ہو رہے تھے۔ میرے تیور دیکھنے کے بعد اکبر خاں کے تیور بھی خطرناک ہو چکے تھے اور اب وہ سرتاپا جنگ جو پٹھان نظر آ رہا تھا۔ بستی میں ہمیں کوئی مسلح پہریدار نظر نہیں آیا۔ پہریداروں کی جگہ ہر طرف رکھوالی کے خوفناک سینٹ برنارڈ کتے چکرا رہے تھے۔ یہی کتے محل کے اردگرد بھی موجود تھے۔ ابھی ہم محل سے کچھ دور ہی تھے کہ ان کتوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک شدید حملہ تھا۔ مگر اس کا جواب بھی شدید تر تھا۔ میں نے اور اکبر خان نے بے دریغ رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ چند سیکنڈ کے اندر ڈیڑھ دو درجن کتے ہلاک ہوئے اور بہت سے زخمی ہو کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ کتوں کی وحشیانہ یلغاروں سے گاڑی کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی اور چاروں طرف بڑے بڑے ڈینٹ پڑ گئے۔ گاڑی عین محل کے مین دروازے کے سامنے جا کر رکی۔ یہاں بھی فقط ایک پہریدار دکھائی دے رہا تھا اس کے اردگرد کتے ہی تھے۔ ایک بار پھر کتے ہم پر جھپٹے اور ایک بار پھر ہم نے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ قیامت کا سا سماں تھا۔ یہی وقت تھا جب تیز چمکیلی دھوپ میں کوئی چیز ہوا میں تیرتی ہوئی تیر کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے بروقت جھک کر خود کو بچایا۔ مڑ کر دیکھا یہ وہی شکرا تھا جو اس سے پیشتر کئی بار ہمارے اردگرد منڈلا چکا تھا۔ اس نے بلندی سے مجھ پر غوطہ لگایا تھا اور اب سیدھا اوپر اٹھ رہا تھا۔ اکبر خاں نے پختون روایت پر عمل کرتے ہوئے شاندار نشانہ لگایا اور سنگل شاٹ سے اس خطرناک پرندے کو مار گرایا وہ ہماری گاڑی سے چند گز کے فاصلے پر گرا اور تڑپنے لگا۔ مگر اسی دوران میں اس شکرے

کی مادہ نمودار ہوگئی اور اس نے عقب سے زور دار حملہ کر کے اکبر خان کو اوندھے منہ گرا دیا۔ دو کتے وحشیانہ انداز میں اکبر خان پر جھپٹے میں نے چھ گولی کا برسٹ چلایا اور ایک ہی حملے میں انہیں ہلاک کر دیا اس دوران شکرے کی مادہ بھی میری گولی سے ہلاک ہوئی۔ اچانک کسی نے عقب سے نمودار ہو کر بہت وزنی چیز میرے سر پر ماری' میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میری انگلی بدستور ٹرائیگر پر تھی۔ اس سے پیشتر کہ میں گھوم کر دیکھ سکتا' دوسری ضرب سر پر لگی اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

ہوش آیا تو میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ مسلح افراد نے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے دے کر مجھے جگایا تھا' میرے کانوں میں ایک نامانوس سا شور پڑ رہا تھا۔ غور کیا تو یوں لگا جیسے یہ شور میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔ کسی جگہ جب بے شمار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور بولتے ہیں تو ایسی ہی آواز ابھرتی ہے۔ ذہن میں ایک دم جھماکا سا ہوا' یہ اسی تماشاگاہ کا شور تو نہیں تھا' جہاں ایک ماہ قبل میں نے ایک نہایت خوفناک تماشا دیکھا تھا۔ درندہ صفت بارہ سنگھے میری نگاہ میں گھوم گئے۔ اچانک میری نگاہ آہنی سلاخوں والی کھڑکی کی دوسری جانب ایک دوسری کوٹھڑی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ اس کوٹھڑی میں جرأت سنگھ موجود تھا اور بڑی تاسف بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ جرأت سنگھ اس کوٹھڑی میں تھا جہاں چند ہفتے قبل اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اے کلاس کوٹھڑیوں میں سے کسی کوٹھڑی میں ہوں۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ مجھے ایک نہایت خوفناک آزمائش درپیش ہو۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں میرے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ میرے ساتھ وہی کچھ ہونے والا تھا جس کا تصور کرنا بھی کسی شخص کے لئے ایک ہولناک تجربہ تھا...... لیکن عجیب بات تھی کہ سب کچھ واضح ہوجانے کے باوجود میرے دل و دماغ کی حالت اتنی بری نہیں ہوئی تھی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کاشف کی ناگہانی موت کے غم سے میرے دل و دماغ میں مزید رنج و غم کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی تھی۔ میرے جسم کے ہر ہر مسام میں ایک بھٹی دہک رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اس

وقت شوراق میرے سامنے آئے اور میں اس کے ہزارہا ٹکڑے کر کے خود بھی ہزارہا ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاؤں۔ آرزو کا حصول میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی لیکن اس وقت یہ تمنا بھی پس منظر میں کہیں دور چلی گئی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے خود کو اس وسیع و عریض تماشاگاہ میں پایا جس کے بیچوں بیچ ایک گول جنگلے کے اندر Ring سا بنا ہوا تھا اور ایک دیوار میں چار منحوس دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں پُرجوش بوگالی یہاں موجود تھے۔ انہوں نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لمبے بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور مرد و زن کے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں چمک رہی تھیں۔ میں قریباً پندرہ عدد قیدیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ ان میں ایک جواں سال عورت بھی تھی۔ یہ سارے وہی قیدی تھے جنہیں آج ایک جاں گسل آزمائش سے گزرنا تھا۔ یوں تو میں ان قیدیوں کے ساتھ موجود تھا لیکن میرے ساتھ خصوصی سلوک کیا گیا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پاؤں میں بیڑی کی شکل کی زنجیر تھی۔ میرا لباس خونخوار جانور کے ساتھ دھینگا مشتی میں پھٹ چکا تھا اور جسم زخموں سے چُور تھا۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں سے شوراق اور اس کے خانوادے کی خصوصی نشستیں بھی نظر آتی تھیں۔ ان کے شاندار لباس اور زیورات ڈھلتے سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی یہ روشنی ایک ایسے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی جو اس دنیا میں مجھے سب سے عزیز تھا لیکن جو مجھ سے بہت دور جا چکا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ آرزو کے ساتھ ہونے والی آخری ملاقات نے مجھے انتہا درجے تک مایوس کیا تھا۔ اس ملاقات نے میرے محبت بھرے دل پر ایک ایسا گھاؤ لگایا تھا جو آسانی سے مندمل ہونے والا نہیں تھا۔ میں اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود آرزو کو اس کے خول سے باہر نکالنے میں ناکام رہا تھا اور یہ ناکامی میرے لئے محبت کی ناکامی سے بھی بڑھ کر تھی۔

گھڑیال نے کھیل تماشے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ انسانوں اور جانوروں کی بازی گری' مختلف کرتب اور مقابلے اس تماشے میں شامل تھے۔ آخر میں نیم عریاں بوگالی لڑکیوں نے ٹیبلو کے انداز کا رقص پیش کیا جس میں حیوانات کی اہمیت اور برتری کو مختلف انداز سے اجاگر کیا گیا۔ بالآخر گھڑیال پر خاص انداز میں چوٹ پڑی اور وہ آزمائش شروع ہوئی جس کا سب کو انتظار تھا۔ ہزاروں تماشائی دل تھام کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن متوجہ

ہوگئے۔ پہلی باری ایک فربہ اندام قیدی کی تھی۔ ایک روحانی پیشوا قسم کا شخص آگے بڑھا اور اس نے چند مذہبی کلمات ادا کرنے کے بعد قیدی سے اس کی آخری خواہش پوچھی۔ قیدی نے اپنی خواہش لکھوا دی۔ اسے جنگلے کے اندر بھیج دیا گیا۔ اس شخص نے جو دروازہ کھولا اس میں سے چمکدار اور طشتری میں رکھے ہوئے سیب برآمد ہوئے اور ایک ماہ کے لئے اس فربہ اندام شخص کی خوش خوراکی کا انتظام ہوگیا۔ مجھے یاد آیا کہ اس فربہ اندام شخص کو پچھلی آزمائش میں بھی اچھی خوراک کی خوش خبری ہی ملی تھی۔

دوسرا نمبر قیدی عورت کا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ آخری خواہش کی دریافت اور مذہبی کلمات کی ادائیگی کے بعد اسے بھی Ring میں بھیج دیا گیا۔ یہ عورت بدقسمت نکلی' یہ اس کی پہلی آزمائش تھی اور پہلی ہی آزمائش میں اسے درندہ صفت بارہ سنگھے نے پھاڑ کھایا۔ عورت کے جسم کے کچھ لوتھڑے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح بارہ سنگھے کے سینگوں پر جھولتے رہے۔ یہ مناظر اتنے دہشتناک تھے کہ اپنی باری کے منتظر قیدی مرمر کر جی رہے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دبلے پتلے اٹالین ملاح کی پتلون گیلی ہوگئی اور وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح کانپنے لگا جیسے اسے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو' ایک اور ادھیڑ عمر قیدی بھی اختلاج قلب کا شکار نظر آنے لگا تھا۔

عورت کے بعد تین اور قیدی جنگلے میں گئے اور ایک ماہ کی زندگی لے کر واپس آ گئے۔ چوتھی باری میری تھی۔ روحانی پیشوا نے مجھ سے آخری خواہش پوچھی' مختلف زبانیں جاننے والا ایک مترجم پیشوا کے ساتھ تھا۔ میں نے اپنی آخری خواہش بیان کرتے ہوئے کہا۔ "میں محترم شوراق سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ بڑی انوکھی خواہش تھی۔ پیشوا اور مترجم حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ بہرحال ضابطے کے مطابق میری یہ خواہش شوراق تک پہنچائی گئی۔ تھوڑے سے تذبذب اور تھوڑی سی تاخیر کے بعد شوراق نے مجھے بلا بھیجا۔ ایک مسلح محافظ اور تین خونخوار کتوں کے نرغے میں مجھے شوراق تک پہنچایا گیا۔ میرے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر بندھے تھے اور پاؤں آہنی بیڑی کی وجہ سے ہر قدم پر زخمی ہو رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اور مضحکہ خیز انداز میں چل رہا تھا۔ بالآخر میں شوراق کی عالی شان نشست کے سامنے پہنچ گیا۔

اس کے پاؤں میں اس کا پالتو بھیڑیا بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا' اردگرد مصاحبین کا جمگھٹا تھا۔ شوراق کے خدوخال ہوبہو بھیڑیے کے تھے اور بات صرف شوراق ہی کی نہیں تھی۔ میں نے تھوڑا سا غور کیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ شوراق کے پورے خانوادے کی شکل و شباہت میں بھیڑیے کی جھلک موجود ہے..........

میں نے بڑی آہستگی سے کہا۔ "میں محترم شوراق سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔"

"تمہاری سزا تو بہت کڑی ہونی چاہئے تھی۔ ہم تمہیں پھر بھی زندہ بچ نکلنے کا ایک چانس دے رہے ہیں۔ اب تک کے اعداد و شمار کے مطابق پندرہ میں سے ایک شخص ضرور زندہ بچ جاتا ہے۔"

"میں سزا کے سلسلے میں رحم کی درخواست نہیں کر رہا' میں آخری بار آرزو سے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

"تم دس باتیں کہہ کر دیکھ لو' اس کا جواب وہی ہوگا جو کل رات تھا۔"

"گویا آپ کی طرف سے اجازت ہے؟"

"اجازت ہے لیکن بات مختصر ہو۔"

میں آرزو کی طرف متوجہ ہوا وہ چند نشستیں چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ بھاری بھرکم کپڑوں اور زیورات سے لدی پھندی' زیتون کی نازک سی شاخ پر جیسے بہت سے فولادی پھل لٹک رہے ہوں وہ اتنی حسین تھی کہ اس پر نگاہ جمتی نہیں تھی۔ وہ میرے پھٹے پرانے کپڑوں سے جھانکتی ہوئی خستہ حالی کی ضد نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی نمناک آنکھوں میں جھانکا اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ "آرزو مجھے لگتا ہے کہ آج میں تم سے آخری بار مخاطب ہوں۔ آج میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔ میں اپنی محبت کا ثبوت مانگنے آیا ہوں۔ آج میں جاننا چاہتا ہوں کہ واقعی تمہارے دل میں میرے لئے چاہت ہے یا پھر وہ ایک دھوپ چھاؤں جیسا بے یقین سا جذبہ ہے' جو ہر دم خوف میں جکڑا رہتا ہے اور اپنی مصلحتوں کو گنتا رہتا ہے۔ آج مجھے فقط ایک جواب دو آرزو! تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا اپنی مصلحتوں سے محبت کرتی ہو اور اپنی آسانیوں کو پوجتی ہو؟"

اس کے ہونٹ لرزے' اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے ابھری۔ "جلال

خدا کے لئے خود پر رحم کھائیں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں لیکن........"

"لیکن نہیں۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "آج میں اس "لیکن" کو قتل کر دوں گا۔ یا خود قتل ہو جاؤں گا۔ اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو تو اس کا واشگاف اظہار کرنا ہو گا سن رہی ہو میری بات؟" میں اردو میں بات کر رہا تھا۔

"جلال! مجھے آپ کی زندگی کی سلامتی........"

"مت نام لو میری زندگی کا اپنی' کم ہمتی اور بزدلی کے لئے مت ڈھال بناؤ میری زندگی کو........ یہ زندگی آج ویسے بھی ختم ہو رہی ہے' تمہاری اسی تماشا گاہ میں تمہاری انہی آنکھوں کے سامنے' اگر تم نے محبت کا ثبوت نہیں دیا تو ابھی اس سامنے والے اکھاڑے میں میرے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ میرا پھٹا پرانا جسم بھی پڑا ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"ایسا نہیں کریں گے آپ۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" میں نے ہر لفظ پر زور دیا۔ "تم نے پچھلی آزمائش میں دیکھا ہی ہو گا۔ جس قیدی نے پہریداروں کی مسلسل کوشش کے باوجود اپنے ہاتھوں سے ایک دروازہ نہیں کھولا تھا' اس کے لئے خونخوار درندے والا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ میرے لئے بھی آج پہریدار ہی درندے والا دروازہ کھولیں گے........ یقین رکھو ایسا ہی ہو گا۔ تم آج تک یہی کہتی رہی ہو ناں کہ میری عزت' میرے سکھ اور میری زندگی کے لئے مجھ سے دور رہی ہو' آج یہ سب کچھ تمہارے سامنے ختم ہو جائے گا........ آج تمہارے پاس کوئی جواز نہیں ہے مجھ سے دور رہنے کا۔ آج بھی دور رہو گی تو اپنی آسانی اپنے سکھ اور اپنی زندگی کے لئے رہو گی۔"

"میں کہتی ہوں ناں کہ مجھے اپنے ہاتھوں مار ڈالیں۔"

"تمہیں کیوں ماروں' میں خود کو موت کے حوالے کر دوں گا۔"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے جلال۔ میں کیا کروں؟"

"تمہیں ہمت کرنا ہو گی' یا پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

میں سراپا اٹل فیصلے کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے سر جھکایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ وہ انکار میں سر ہلا رہی ہے۔ وہ

واقعی انکار میں سر ہلا رہی تھی لیکن یہ انکار میرے لئے نہیں تھا' اس کے اندر صدیوں سے جم کر بیٹھی ہوئی کم ہمتی کے لئے تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی........ اس نے اپنے بھاری بھرکم آنچل کو سنبھالا' اس کے حسین جسم پر سجے ہوئے وزنی زیورات چھن چھنائے' پھر جیسے اندھیری سنسان راتوں میں بجلی تڑپتی ہے' وہ لپک کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے گداز بازوؤں نے مجھے یوں دبوچا جیسے مرنے والا زندگی کو دبوچتا ہے' اس کا سینہ ہچکیوں سے متلاطم تھا........ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں یوں چھپایا تھا جیسے کوئی پرندہ طوفانی رات سے گھبرا کر اپنے گھونسلے میں دبک جاتا ہے۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے' میرے ہونٹ بے ساختہ اس کے بالوں کو اس کے گالوں کو چومتے چلے گئے۔ وہ لمحے میری زیست کا حاصل تھے۔ میری زندگی کا جوہر تھے۔ میں برسوں سے ان لمحوں کا منتظر تھا۔

اس کے بعد جبر کی ایک آندھی سی چل پڑی' خونخوار کتوں نے مجھے کھینچ کھینچ کر آرزو سے جدا کر دیا۔ میں سیڑھیوں پر گرا اور لڑھکتا چلا گیا۔ میرا نام پکارتی ہوئی آرزو کو محافظ عورتوں نے کھینچا اور گھیر کر دور لے گئیں۔ تماشا گاہ کے اندر دور تک ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سب چکرا کر رہ گئے تھے........ پھر ایک دم میرا زخم زخم جسم خونخوار کتوں کی زد میں آ گیا' ان کے دانت' ان کے پنجے میرے جسم کو اور بھی لہولہان کرنے لگے۔

☆==========☆==========☆

اندھیرا پھیل رہا تھا' تماشا گاہ میں ہر طرف قندیلیں لیمپ اور مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ تماشا گاہ میں وی آئی پی نشستوں کے عین سامنے جو سنسنی خیز ہنگامہ برپا ہوا تھا اب اسے نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ تماشائی پھر سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے اور کھیل پھر سے شروع ہو رہا تھا........ میری آخری خواہش' پوری ہو چکی تھی اور اب مجھے موت کا اعصاب شکن سامنا کرنے کے لئے اکھاڑے میں داخل ہوتا تھا۔ آج اس تماشا گاہ میں اکثر انتظامی امور مختلف نسلوں کے کتے' سدھائے ہوئے ہاتھی اور دیگر جانور انجام دے رہے تھے۔ ان کا ہر ہر انداز حیرت انگیز ذہانت اور تربیت کا عکاس تھا۔ جانوروں کی ہر ہر حرکت میں پُراسرار انوکھا پن تھا۔

چند کتے مجھے گھیرتے ہوئے اکھاڑے کی طرف لے چلے۔ ان کی خوفناک غراہٹیں بتا

رہی تھیں کہ ان کی حکم عدولی کا مطلب اپنے جسم پر چند اور گہرے زخم سجانا ہے۔ اکھاڑے کے دروازے کے عین سامنے پہنچ کر مسلح افراد نے میرے ہاتھ کھول دیئے اور پاؤں سے بیڑی نکال کر مجھے اندر دھکیل دیا۔ ہزاروں لوگوں کی نگاہیں مجھ پر تھیں اور میری نگاہیں چار آہنی دروازوں پر تھیں۔ میں بڑی حیرت سے ان دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ تاریکی میں دور سے ٹھیک دکھائی نہیں دیا تھا' اب نظر آرہا تھا کہ ان دروازوں میں سے دو پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ صرف دو دروازے بند تھے۔ لمبے بالوں والے طویل قامت پہریدار نے مجھے شکستہ انگلش میں بتایا کہ مجھے ان دو بند دروازوں میں سے ہی ایک دروازے کا انتخاب کرنا ہے' ان میں سے ایک کے اندر تمہارے لئے ایک ماہ کی زندگی ہے اور دوسرے میں فوری موت۔

"لیکن دوسروں کے لئے تو چار دروازے تھے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "تم جو کچھ کر چکے ہو اس کے سامنے یہ رعایت بھی بہت بڑی ہے۔"

میرے سینے میں اٹھتی ہوئی سنسنی کی لہریں کچھ اور بھی بلند ہوگئیں۔ دل جیسے سینے میں نہیں پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے لئے موت کا امکان $\frac{1}{4}$ سے $\frac{1}{2}$ کر دیا گیا ہے۔ میرے سامنے دو دروازے تھے اور ان میں سے ایک مجھے کھولنا تھا تاکہ ایک ماہ کی زندگی مزید مل سکے......... زندگی بہت......... بہت دکھی ہو گئی تھی' پھر بھی آرزو کے رخسار چومنے کے بعد میرے اندر جینے کی نئی خواہش پیدا ہوئی تھی' میں دونوں دروازوں کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ میں نے زندگی میں ہزاروں بار دروازہ کھولا ہو گا لیکن یہ دروازہ کھولنے کے لئے دل و دماغ کو آگ اور پانی کے سات سمندروں کے اوپر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

اچانک ایک سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔ "کوئی سا بھی دروازہ کھول لو نوجوان اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے چونک کر دیکھا' سرگوشی کرنے والا وہی طویل قامت پہریدار تھا۔ جو تن تنہا میرے ساتھ اس Ring میں موجود تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ درندہ صفت بارہ سنگھے اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

میں نے کہا۔ "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

اس نے ڈرامائی لہجے میں سرگوشی کی۔ "دونوں دروازوں کے پیچھے تمہاری موت ہی بند ہے۔ شوراق اپنے مجرموں کو آسانی سے معاف نہیں کرتا۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے صورت حال کی اصل سنگینی کا احساس ہوا۔ یہاں دونوں دروازوں کے پیچھے درندہ صفت جانور موجود تھے۔ پہریدار کے لہجے میں مجھے عجیب سی دوستانہ جھلک نظر آئی تھی' میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم شوش ہو؟"

اس نے چند لمحے کے توقف سے کہا۔ "ہاں۔ ابھی ماسک میرے چہرے پر نہیں آیا مگر میں شوش ہوں......... تمہارے لئے زندگی کا چانس نہ ہونے کے برابر ہے مگر اپنے دیرینہ تجربے کی بنا پر ایک رائے میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

"بتاؤ۔ میں عمل کروں گا۔"

"دروازہ کھلنے کے بعد یہاں کھڑے ہو کر جانور (بارہ سنگھے) کا انتظار مت کرنا۔ اگر ہمت ہے اور بازوؤں میں طاقت بھی ہے تو پھر ایک انوکھا کام کرو' ایک ایسا کام جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ دروازہ کھلنے کے بعد خود بھاگ کر اندر گھس جاؤ۔ وہ ایک تنگ سا کمرا ہے' وہاں جانور پیچھے سے بھاگ کر زور دار حملہ نہیں کر سکتا' اس کمرے کا جو دروازہ دوسری طرف باہر کی جانب کھلتا ہے وہ بہت مضبوط نہیں ہے' اگر تم کسی طور اسے توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہاری جان کم از کم ایک ماہ کے لئے تو بچ سکتی ہے۔"

پہریدار مجھ سے اس انداز میں بات کر رہا تھا کہ دور سے دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوتا ہو گا کہ وہ مجھے دروازہ کھولنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

شوش پہریدار کی پوری بات سننے اور سمجھنے کے بعد میں نے خود کو ذہنی و جسمانی طور پر تیار کیا اور آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھول دیا۔ ایک تاریک خلا میرے سامنے تھا۔ تماشا گاہ میں جیسے ہر شخص کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ میں جانور کا انتخاب کرنے کی بجائے خود دوڑتا ہوا اس تاریک خلا میں گھس گیا۔ میرے جسم میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ مارشل آرٹ کی سخت مشقوں کا صلہ آج ایک بھرپور اعتماد کی صورت میرے دل و دماغ میں موجود تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے قدم زمین پر نہیں ہوا پر پڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنے سامنے اس منحوس جانور کو پایا جو دیکھنے میں بارہ سنگھا لیکن حقیقت میں ایک طلسمی درندہ تھا اس کی

خونخواری اور طاقت کسی بھی شیر یا چیتے سے کم نہیں تھی۔ اس کے جسم پر سب سے خوفناک چیز اس کی آنکھیں تھیں جو حلقوں سے باہر نکلی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بے پناہ تیزی سے مجھ پر جھپٹا' میں نے خود کو اس کی زد سے بچایا پھر بھی اس کا ایک سینگ میرے کولہے کی ہڈی میں لگا اور میں لڑکھڑا کر رہ گیا' درندہ نما جانور نے پھر مجھ پر حملہ کیا اس مرتبہ اس نے میری ناف میں اپنے دانت گاڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سینگوں سے پکڑا لیکن اس میں یقیناً ماورائی قوت تھی اس نے ایک جھٹکے سے مجھے ہوا میں اچھال دیا۔ میں گرتے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدم بھاگ کر اس کمرے کے دروازے کو کندھے سے بھرپور ٹکر ماری۔ دروازہ تھرایا مگر اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ میرا حریف اپنے سینگ جھکا کر مجھ پر پھر حملہ آور ہو چکا تھا' اس مرتبہ میں نے اسے کراٹے کے انداز میں کک رسید کی' یہ اس کے نتھنوں پر لگی وہ اچھل کر رہ گیا۔ میں نے کندھے سے ایک زور دار ٹکر دروازے کو رسید کی' اس دوران میں' میں نے گائیڈڈ میزائل کی طرح اس طلسمی درندے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ عین موقعے پر میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی' درندے اور دروازے کا بھرپور تصادم ہوا۔ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ دروازے کی چولیں ہل گئی ہیں۔ رہی سہی کسر میرے کندھے کی ایک اور طوفانی ٹکر نے پوری کر دی۔ دروازے کی مضبوط کنڈیاں اکھڑ گئیں۔ میں اندھا دھند باہر نکلا' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرف جاؤں' اچانک ایک شخص نے میرا بازو تھاما اور مجھے کھینچتا ہوا درختوں کی طرف لے بھاگا۔ تیس چالیس گز آگے درختوں میں دو سیاہ گھوڑے موجود تھے۔ ایک گھوڑے پر بیٹھے شخص کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والے شخص نے مجھے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی اور پھر گھوڑے کی پیٹھ پر چھڑی رسید کر کے اسے بھگا دیا۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں سیاہ گھوڑے آگے پیچھے گھنے درختوں میں گھستے چلے جا رہے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تماشا گاہ کی دیوار کے پاس سخت افراتفری تھی اور بھاگو پکڑو کی صدائیں تھیں۔ تماشا گاہ کی بے شمار روشنیوں کی وجہ سے آسمان سرخ انگارہ نظر آ رہا تھا........ تماشا گاہ کے اصل محافظ ان خاص دنوں میں خونخوار کتے اور بھیڑیئے تھے' ان کی غراہٹیں لرزہ خیز تھیں۔

☆==========☆==========☆

بانس' تاڑ اور مینگوشین کے نہایت گھنے درختوں کے اندر ایک طویل سرنگ نما غار

تھا۔ اس غار میں کئی شاخیں بھول بھلیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں' میرا اندازہ تھا کہ دیواروں پر لکھی ہوئی نشانیوں کے بغیر اس سرنگ میں سفر کرنا ناممکن تھا۔ میں پانچ ماسک پوش افراد کے ساتھ سرنگ نما غار کے ایک کشادہ حصے میں موجود تھا۔ ایک عورت جس کا نصف سے زائد چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ایک نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی سحر انگیز تمکنت تھی۔ یہی قاروبا تھی۔ اس نے مترجم کے ذریعے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”نوجوان! تم جو کچھ کر چکے ہو' یہ حد سے زیادہ ہے۔ اب اس جزیرے پر تمہارے زندہ بچ رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہاں کے ہر انچ پر شوراق کی حکمرانی ہے۔ یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اپنے کسی جانی دشمن سے تمہاری مڈبھیڑ نہ ہو سکے۔ جنگل میں گھومنے والے تیندوے سے لے کر اپنی بل میں بیٹھے ہوئے مکوڑے تک کوئی بھی موقع ملنے پر تمہاری جان لے سکتا ہے' لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایسی کشتی فراہم کر سکتی ہوں جو ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہو اور تمہیں کسی آباد جزیرے کے ساحل کے قریب اتار دے۔ تم ایک بہادر شخص ہو اور ایسے لوگوں کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ جہاں تک تمہاری محبوبہ کا تعلق ہے۔ میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ میری زندگی میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ وہ یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میں اس لڑکی کو اور تمہارے دیگر ساتھیوں کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

میں نے کہا۔ ”میں آپ کی پیشکش کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں محترم خاتون........ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' میں آرزو کے بغیر اور اپنے ساتھیوں کے بغیر یہاں سے واپس جانے پر یہاں مرنے کو ترجیح دوں گا۔“

قاروبا خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ کچھ غمزدہ بھی نظر آتی تھی۔ آنکھیں روئی روئی تھیں۔ کاشف کی ناگہانی موت نے میرے دل کو تو ٹکڑے کیا ہی تھا' قاروبا کو بھی سوگوار کر دیا تھا۔ جیسا کہ کاشف نے اپنی آخری ملاقات میں بتایا تھا' قاروبا سے اس کی کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ دونوں قریباً روزانہ ہی ایک دوجے سے ملتے تھے۔

قاروبا نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”اگر تم یہاں

سے جانا نہیں چاہتے تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو۔"

میں نے عزم سے کہا۔ "میں آزاد ہونا چاہتا ہوں محترم خاتون' یا یہاں ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دفن ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم شوراق سے لڑنا چاہتے ہو۔ ایسی دلیری کو حماقت کہا جاتا ہے۔ شوراق سے ٹکرانے کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں.......... ہم تمہیں سوچنے کے لئے آٹھ پہر مزید دیتے ہیں۔ تم کل اپنے حتمی جواب سے ہمیں آگاہ کرنا۔"

قاروبا کسی نامعلوم راستے کے ذریعے اس سرنگ نما غار سے واپس چلی گئی۔ وہ اس جزیرے کے محترم ترین بزرگ کی بیٹی تھی اور اپنی شخصیت سے ایسی نظر بھی آتی تھی۔ یہاں کے اکثر لوگ شوراق کے علاوہ قاروبا کے سامنے بھی تعظیماً سجدہ ریز ہوتے تھے۔

قاروبا کے جانے کے بعد' میں نے اس غار میں اس طویل قامت پہریدار کو دیکھا' کل جس نے موت کے اکھاڑے میں مجھ سے دوستانہ سرگوشیاں کی تھیں اور ایک دو مفید مشورے بھی دیئے تھے۔ میں نے اس شخص کو فقط آواز سے پہچانا کیونکہ اس غار میں موجود دوسرے لوگوں کی طرح آج اس کے چہرے پر بھی مخصوص ماسک نظر آرہا تھا.......... وہ غار میں دو تین گھنٹے میرے ساتھ رہا' اس کا نام ڈوزے تھا۔ ڈوزے سے مجھے اس جزیرے کے اندرونی حالات کے بارے میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ڈوزے کی باتوں سے پتہ چلا کہ جزیرے کے باشندوں کی اکثریت اپنے دلوں میں شوراق کے لئے مخالفت کے جذبات رکھتی ہے کیونکہ وہ اپنے اقتدار کے لئے انسانوں سے زیادہ حیوانوں پر انحصار کرتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ جزیرے کا انتظام چلانے کے لئے مشورے بھی جانوروں سے ہی کرے.......... ڈوزے نے شوراق اور اس کی بیوی قاروبا کے شدید اندرونی اختلافات کی کہانی بھی سنائی۔ اس نے بتایا کہ شوراق اپنی محبوبہ (آرزو) کے لئے بالکل پاگل ہے اور وہ اس کی خاطر خواہ قاروبا کی زندگی کے خلاف کوئی بھی بدترین سازش کرسکتا ہے۔ ڈوزے کے ساتھ سرنگ نما غار میں گھوم پھر کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کافی تعداد میں شوش افراد موجود ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماسک رات سوتے وقت بھی نہیں اتارتے ہیں۔ یہ ماسک ان کے جسم کا حصہ ہی بن چکے تھے۔ مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ سرنگ نما غار "اینیمل فری" ہے یعنی اس غار میں انسانوں کے سوا کسی

جاندار چیز کو موجود نہیں رہنے دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ تمام قسم کے حشرات الارض اور دیگر حیوانات شوش لوگوں کے لئے ناقابل اعتبار تھے۔ وہ کسی بھی وقت شوراق کی پُراسرار قوت کے زیر اثر اس کے ایجنٹ بن جاتے تھے اور اپنی جبلت کے مطابق ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے تھے۔

میں یوں تو ڈوزے کے ساتھ غار میں گھوم پھر رہا تھا' باتیں بھی کر رہا تھا' باتیں سن بھی رہا تھا' مگر میرا دل و دماغ کہیں اور تھا۔ ایک نیلی آگ تھی جو سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک میرے بدن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے یار کی آخری ہچکیاں کانوں میں گونج رہی تھیں اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں تصور کے پردے کو ٹکڑے کر رہی تھیں۔ وہ مر گیا تھا اور اپنی انصاف طلب نگاہوں سے میرا کلیجہ چھلنی کر گیا تھا.......... کاشف کی موت کے بعد کا ہر لمحہ میں نے انگاروں پر کھڑے ہو کر گزارا تھا.......... پھر کبھی کبھی آرزو کا خیال بھی ایک جھلک کی طرح میرے ذہن میں آتا تھا' اس نے تماشا گاہ میں ہزاروں تماشائیوں کے سامنے مجھے گلے سے لگایا تھا۔ اس جرم عظیم کی پاداش میں اس نازک اندام کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا.......... میرا دماغ دن بھر ہانڈی کی طرح کھولتا رہا اور میرے دل و دماغ میں شوراق کے خلاف نفرت کا سمندر ہلکورے لیتا رہا۔ ایک ایسی سوچ میرے ذہن میں پروان چڑھتی رہی جو کسی مصلحت کسی اندیشے کو خاطر میں نہیں لاتی اور جو آتش فشاں سے پھوٹنے والے لاوے کی طرح بے اماں ہوتی ہے۔

وہ رات کا تیسرا پہر تھا' میرے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔ رائفل کے کئی بھرے ہوئے میگزین بھی میرے لباس میں موجود تھے۔ میرے ساتھ ماسک پوش ڈوزے تھا۔ ہم دونوں شوراق کے محل کے عقبی درختوں میں ایک جیپ کے اندر موجود تھے۔ ڈوزے نے اس جیپ کی کھڑکیاں دروازے بڑی اچھی طرح بند کر دیئے تھے اور جہاں کہیں درز وغیرہ موجود تھی اسے بھی کپڑے کی مدد سے مسدود کر دیا گیا تھا۔ ڈوزے کا کہنا تھا کہ مجھے اس وقت حشرات الارض سمیت ہر قسم کے حیوانات سے شدید خطرہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے جسم سے اٹھنے والی ہلکی سی باس یا پسینے کی بو بھی میرے متلاشی جانوروں کو میری جانب متوجہ کر سکتی ہے.......... اس جیپ میں ڈوزے اور میں اکیلے تھے مگر اس

مقام پر ہم اکیلے نہیں تھے۔ ہمارے عقب میں کم و بیش ایک سو شوش افراد موجود تھے' جو ضرورت پڑنے پر شوراق کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا سکتے تھے۔ شوراق کے محل کی حفاظت خونخوار کتے اور جنگل کے دوسرے درندے کر رہے تھے۔ کتوں کے شور کے ساتھ ساتھ کسی وقت کوگر غرانے لگتا تھا۔ محل کے اطراف میں بھیڑیئے بھی مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا' مگر ہمارے سامنے تھا۔ میں نے مصیبت زدہ آرزو کے بارے میں سوچا اور زخمی دل سے خون رسنے لگا۔ وہ نازک طبع تو بلی چوہے سے ڈرتی تھی۔ گلیوں میں گھومنے والے بے ضرر کتے کی آواز بھی اسے دہلا دیتی تھی' اب وہ درندوں کے گھیرے میں تھی' اپنی چاروں جانب خوفناک آوازیں سنتی تھی اور تاریک راتوں میں تن تنہا اپنے آپ میں سمٹی چلی جاتی تھی۔

ڈوزے جیپ کے اندر بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے پچھلے آدھ گھنٹے میں قریباً بیس مرتبہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ آخر وہ بول پڑا۔ "بھائی! تمہیں کس بات کا انتظار ہے میرے خیال میں ہمارے شب خون کے لئے یہ وقت بہترین ہے......... اور میرے حساب سے ہمیں وقت کی اتنی پرواہ بھی نہیں ہونی چاہئے۔ ہم تو......... اپنی جان فدا کر دینے کی نیت سے آئے ہیں۔ کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں' جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں ان میں سے ایک بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ شوراق کے خلاف لڑے گا یا مرجائے گا۔"

ڈوزے یہی بات تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ پہلے بھی تین' چار مرتبہ کہہ چکا تھا۔ میں نے اسے وہی جواب دیا' جو پہلے تین چار مرتبہ دیا تھا۔ میں نے کہا۔ "میرے بھائی! بس تھوڑا سا انتظار اور......... تم دیکھ ہی رہے ہو ابھی پہریدار جانور پوری طرح چوکس ہیں۔"

"میرے برادر! یہ سلسلہ تو ایسے ہی رہے گا' بلکہ ابھی کچھ دیر بعد جانوروں کے ساتھ پہریدار بھی محل کی چوکیداری شروع کر دیں گے۔ زوال کی تیسری رات افق سے دن کی پہلی روشنی پھوٹتے ہی ختم سمجھی جاتی ہے اور اس کے بعد شوراق پھر سے جانوروں کے ساتھ ساتھ انسانوں سے بھی کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے سینکڑوں کارندے اور سپاہی اسی وقت سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیتے ہیں۔"

ڈوزے کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ دیگر لوگوں کی طرح ڈوزے کو بھی وہ انتہائی اہم بات معلوم نہیں ہوئی ہے جو دو دن پہلے میرے بچھڑے یار کاشف نے اپنی موت سے تھوڑی دیر قبل بتائی تھی۔ اس نے صبح کاذب کا ذکر کیا تھا اور چند منٹ کے اس خاص الخاص وقفے کا ذکر کیا تھا جب شوراق اس جزیرے کا ایک عام شخص بن جاتا تھا' حیوانی طاقت کے ساتھ ساتھ انسانی طاقت ملنے سے کچھ دیر پہلے وہ حیوانی طاقت کا مالک رہتا تھا اور نہ انسانی طاقت کا۔ یہ لمحے بے حد اہم تھے اور آج چاند کی اس سترہویں رات کو یہ لمحے کچھ ہی دیر بعد پہنچنے والے تھے......... ان لمحوں کے حوالے سے میرے بچھڑے یار نے کوئی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ کوئی شاندار منصوبہ......... پتہ نہیں وہ کیا منصوبہ تھا' اب وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نامعلوم منصوبے کی بس ایک شہ سرخی میرے سامنے لکھی رہ گئی تھی......... چاند کے زوال کی تیسری رات اور صبح کاذب کے نمودار ہونے کا وقت۔"

ہم منتظر بیٹھے رہے اور پھر میں نے زندگی میں پہلی بار مشرق سے صبح کاذب کو نمودار ہوتا دیکھا۔ دور افق کی سیاہ چادر پر ایک روشن داغ سا نمودار ہوا۔ یہ روشن داغ دھیرے دھیرے پھیلنے لگا۔ یوں لگا جیسے سورج کہیں بہت فاصلے سے اس خطہ زمین پر جھانک رہا ہے۔ صبح کاذب کا مطلب جھوٹی صبح ہے۔ یقیناً اس روشنی کو یہ نام ٹھیک ہی دیا گیا تھا' ابھی صبح صادق کی روشنی نمودار ہونے میں کافی دیر تھی۔ جب روشنی ہمیں نمایاں طور پر نظر آنے لگی تو ہم نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ شوراق کے محل کے گرد غراتے اور دھاڑتے ہوئے درندے اور شور مچاتے کتے ایک دم خاموش ہو گئے۔ جیسے سب کے سب ایکا ایکی سو گئے ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ عمل کا وقت ہے' یہ اس جادونگری کے سفاک ساحر پر کاری ضرب لگانے کا وقت تھا۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور جست لگا کر نیچے اتر آیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا جیپ سے صرف تین چار گز کے فاصلے پر دو سیاہ ناگ پھن اٹھائے کھڑے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ میری طرف حرکت کریں گے لیکن انہوں نے حرکت نہیں کی۔ بس دیکھتے رہے میری طرف۔ میں ان کے قریب سے دوڑتا ہوا گزرا' میرے عقب میں رائفل بدست ڈوزے تھا اور ہمارے عقب میں شوش

جانبازوں کا دستہ تھا۔ یہ سب لوگ سروں پر کفن باندھ کر یہاں آئے تھے۔ اپنی پلاننگ کے مطابق ہم برق رفتاری سے مین گیٹ پر پہنچے۔ یہاں ان لمحوں میں حیرت انگیز طور پر کوئی جانور موجود تھا اور نہ انسان۔ بس چند خونخوار کتے ٹہل رہے تھے۔ ہم دیواریں پھاند کر اندر داخل ہوئے' ہماری انگلیاں رائفلوں کے ٹرائیگرز پر تھیں لیکن خونخوار کتے الگ تھلگ کھڑے رہے جیسے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو اس محل سے۔ اپنے اپنے ٹارگٹ ہم نے پہلے ہی چن رکھے تھے۔ ڈوزے چند مسلح افراد کے ساتھ بالائی منزل پر واقع آرزد کی خوابگاہ کی طرف بڑھا میں چار افراد کی ایک ٹولی کے ساتھ شوراق کی عالی شان خواب گاہ کی طرف لپکا' راستے میں ہمیں راہداریوں کے اندر پہریداروں کی جگہ چیتے گھومتے ہوئے ملے' سیاہ داغوں والے ان کے سنہری جسم ٹارچ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف ایک چیتے کو ہلاک کرنا پڑا کیونکہ وہ ایک دروازے کو روکے کھڑا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے اسے ٹرپل ٹو رائفل کا برسٹ مارا اور وہ وہیں گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے بھی ایک برسٹ شوراق کی خواب گاہ کے دروازے پر چلایا اور ہینڈل تالے سمیت سب کچھ اڑا کر رکھ دیا۔ دروازے کو ٹانگ مار کر میں اندر گھسا۔ خواب گاہ میں نائٹ بلب روشن تھا۔ قوی ہیکل شوراق شب خوابی کے لباس میں تھا اور دیوار پر آویزاں اپنی رائفل اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

"اسٹاپ" میں نے چیخ کر کہا اور شوراق کے سامنے جاکھڑا ہوا۔ شوراق کا خوفناک پالتو جانور قالین پر بیٹھا تھا۔ شوراق نے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ بھیڑیا مجھ پر جست کرے گا۔ مگر زوال کی اس تیسری شب کے وقت کا حساب کتاب شاید اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ بھیڑیا اپنی جگہ مست بیٹھا رہا۔ اچانک شوراق نے جست لگائی اور میرے اوپر گرا۔ اس کا چہرہ سو فیصد بھیڑیئے کا چہرہ نظر آتا تھا اور جسم سے وہی مخصوص حیوانی بو اٹھ رہی تھی جو اس جزیرے پر اترنے سے پہلے ہی میرے لئے جانی پہچانی ہو چکی تھی۔ قریباً ایک منٹ تک میرے اور شوراق کے دوران خوفناک جدوجہد ہوئی۔ وہ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود حیرت انگیز جسمانی طاقت کا مالک تھا۔ اچانک میرا داؤ چل گیا..........

شوراق کا ایک وحشیانہ وار بچانے کے بعد مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ میں اس کے سینے میں اس مخصوص مقام پر اپنا دایاں مکہ مار سکوں جسے کراٹے کی زبان میں پن پوائنٹ بھی کہا جاتا

ہے.......... یہ میرا سب سے موثر وار تھا۔ آج سے چھ سات سال پہلے جب میں مارشل آرٹ کے میدان کا ایک مانا ہوا کھلاڑی تھا' میرا یہ وار میرے مدمقابل کو چاروں شانے چت کر دیا کرتا تھا۔ درحقیقت یہ وار آخری بار میں نے چھ سات سال پہلے کیا تھا میرا مکہ کچھ زیادہ قوت کے ساتھ میرے مدمقابل کھلاڑی حافظ عبدالواحد کے سینے میں لگا تھا.......... اور وہ ختم ہوگیا تھا۔ آج برسوں بعد میں نے یہ وار پورے ارادے اور بھرپور قوت کے ساتھ شوراق کے سینے پر کیا تھا۔ اثر وہی ہوا جو سات سال پہلے ہوا تھا۔ آج یہ اثر میری امنگوں اور آرزوؤں کے عین مطابق تھا۔ شوراق کا سینہ پھٹ گیا تھا۔ وہ تڑپ کر دبیز قالین پر گرا اور اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا.......... محل کے مختلف حصوں میں فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا محل کے ادھر جو تھوڑی بہت مزاحمت ہوئی وہ شوراق کے محافظوں یا سپاہیوں کی طرف سے نہیں' خاندان کے افراد کی طرف سے ہوئی۔ دو طرفہ فائرنگ میں شوراق کی فیملی کے پندرہ بیس افراد مارے گئے ماسک پوش جانبازوں میں سے بھی تین چار افراد کو قربانی دینا پڑی۔

جس وقت شوراق میرے قدموں میں پڑا جان کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا' اچانک محل کے اردگرد سے درندوں کی ملی جلی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ صبح کاذب کے نمودار ہونے کے بعد وہ خاص وقت گزر چکا تھا جب شوراق کے حیوانی اور انسانی ہرکارے اس کے لئے غیر مفید تھے۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے کے عین سامنے ایک چیتے کو ایک ماسک والے شوش جانباز کے پیچھے لپکتے دیکھا۔ پھر اچانک ایک پرچھائیں سی میری طرف بھی آئی۔ میں اس درندے کو چند لمحوں کے لئے فراموش کر گیا تھا۔ یہ شوراق کا پالتو بھیڑیا تھا۔ اس نے ایکدم غرا کر مجھ پر جست کی تھی۔ مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی اس نے پلٹی کھائی اور اس تپائی پر جاکر گرا جہاں شوراق کے لئے قیمتی شرابوں کی بوتلیں اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ بھیڑیئے کو نشانہ بنانے والا' مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہرحال اس کی چلائی ہوئی گولی بھیڑیئے کے عین نرخرے میں لگی تھی.......... چند سیکنڈ بعد اچانک محل کے نگران درندوں کی آوازیں ایک بار پھر تھم گئیں۔ کتوں کا بلاخیر شور بھی ایکا ایکی دم توڑ گیا۔ یوں لگا جیسے ایک بہت تیز آندھی چلنے سے پہلے ہی رک گئی ہے۔ میں نے چونک کر قالین کی طرف دیکھا۔ شوراق دم توڑ چکا تھا۔

شوراق کے ساتھ ہی اس کا سحر بھی مرگیا تھا۔ روحانیات کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ جب عامل ہی نہیں رہا تھا تو معمول پر "سجیشن" بھی بے اثر ہوگئی تھی۔ وہ درندے جو چند لمحوں کے لئے بے حد فعال اور مشتعل نظر آئے تھے ایک دم نارمل ہوگئے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ جنگل کا رخ کر گئے ہیں اور کچھ تاریک رات کے کونے کھدروں میں سمٹ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ بے حد افسانوی ہونے کے باوجود ایک ٹھوس حقیقت کی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔

میں نے ڈوزے اور اس کے ساتھی جانبازوں کو دیکھا' وہ بالائی منزل سے آرزو کو لے کر آرہے تھے' ان کے چہرے جوش و خروش سے تمتما رہے تھے۔ آرزو کے بال منتشر تھے اور وہ ہکا بکا سی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر میں نے اکبر خاں کو دیکھا' وہ رائفل لہراتا ہوا ایک طرف سے نکلا اور شوراق کی لاش دیکھنے کے بعد بے خودی میں ناچنے لگا۔

☆==========☆==========☆

جو کچھ ہوا' وہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ پورے جزیرے کے لوگ سکتے میں آگئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایک خونریز لیکن مختصر لڑائی کے بعد شوراق ہلاک ہوگیا ہے اور اس کے اقتدار کا سورج ذلت آمیز موت کی دلدل میں غرق ہوگیا ہے۔ لوگوں کا پہلا ردعمل تو حیرانی اور تعجب کا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس جھٹکے سے سنبھلے اور ان کا اصل ردعمل سامنے آنا شروع ہوا۔ وہ بستی کے بازاروں میں نکل آئے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ جوشیلے لوگوں نے شوراق کے خانوادے میں سے مرنے والے دو فربہ اندام افراد کی لاشوں کو ان کے قیمتی لباس سمیت بازار میں گھسیٹا ہے۔ بہت سے لوگوں نے نعرے بازی کے ذریعے شوراق کے لئے اپنی چھپی ہوئی نفرت کا اظہار کیا۔ بے شمار لوگوں نے قاروبا کے حق میں نعرے زنی کرکے شوراق کی موت کو خوش آمدید کہا۔ شام تک جزیرے کے پچاس فیصد لوگوں نے شوراق فیملی کے چند عشرت کدوں کے علاوہ اس وسیع تماشا گاہ کو بھی آگ لگا دی تھی۔ جہاں ہر ماہ چاند کی مخصوص تاریخوں میں چار دروازوں والا ہولناک کھیل کھیلا جاتا تھا.......... اگلے روز صبح سویرے ہم نے جو سب سے پہلے خبر سنی وہ یہ تھی کہ جزیرے کا سارا نظم و نسق قاروبا اور اس کے قریبی ساتھیوں نے سنبھال لیا ہے۔ ڈوزے کو اس کی جانبازی کی وجہ سے اس نئے "سیٹ اپ" میں ایک اہم عہدہ

دیا گیا تھا۔

میں اکبر خاں اور آرزو محل ہی کے ایک کمرے میں موجود تھے' اگلے روز دوپہر کو جولیا اور راجا بھی ہم سے آملے۔ جولیا اور آرزو گہری سہیلیوں کے انداز میں ایک دوسرے سے ملیں۔ راجا اس تمام عرصے کے دوران میں محل ہی کے ایک حصے میں نظربند رہا تھا۔ اس نظربندی کے باوجود اس نے جزیرے کے حوالے سے اپنا شاندار سفرنامہ مکمل کرلیا تھا' جولیا کا حلیہ حیرت انگیز طور پر بدل چکا تھا۔ میں نے اسے نیکر شرٹ کی بجائے ایک پاجامہ کرتے میں دیکھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے سر پر چادر بھی لے رکھی تھی۔ وہ جب بھی اکبر خان کی جانب دیکھتی تھی اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور اپنائیت ابھر آتی تھی۔ اکبر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ بہت بدل چکی ہے' اور شاید وہی نہیں بدلی تھی' تھوڑا بہت اکبر خاں بھی بدلا تھا۔ میں نے حیرت ناک طور پر محسوس کیا تھا کہ کل سے اس نے سگریٹ پیا تھا اور نہ نسوار کھائی تھی' حالانکہ میں جانتا تھا کہ نسوار کا اسٹاک اب بھی اس کے پاس موجود ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کہاں اکبر خاں.......... کہاں ماڈرن تتلی جولیا؟ کسی نے سچ کہا ہے' دل دریا سمندروں ڈونگے' کون دلاں دیا جانے ہُو.......... مجھے ایک اور اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ کل شوراق کی خواب گاہ میں بھیڑیے کو گولی مارنے والا اکبر خاں تھا۔ عین جس وقت بھیڑیئے نے مجھ پر جست کی تھی اکبر خاں نے کھڑکی سے فائر مار کر اسے ڈھیر کردیا تھا۔

جب ہم سب اکٹھے ہوئے تو کسی کی کمی کا احساس اور بھی شدت سے ابھر آیا۔ آج ہمارے درمیان ہمارا سب سے ہنس مکھ ساتھی کاشف موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے راستے ہمیشہ کے لئے الگ کرچکا تھا۔ اسے یاد کرکے میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آئے تو سبھی سوگوار ہوگئے۔ میرا دل چاہنے لگا' میں اپنا گریبان پھاڑوں' اپنے سر میں خاک ڈالوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاؤں.......... آہ میں اب یہاں سے واپس جاکر اس کے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ لاہور کی سونی سونی گلیوں کو کیا جواب دوں گا؟ وہ میری محبت کا اسیر میری خاطر دربدر بھٹکتا رہا' جزیرہ جزیرہ گھومتا رہا.......... صرف میری خاطر' میرے زخموں کے مرہم کے لئے میرے ہاتھوں میں آرزو کے ہاتھ دیکھنے کے لئے اور ایک بار.......... ہاں ایک بار اسے بڑے پیار سے بھابی کہنے کے لئے۔ میری پلکوں کے بند ٹوٹ

گئے۔ آنسو تند سیلابی ریلے کی طرح میری آنکھوں سے بہنے لگے۔ آرزو بھی رو رہی تھی۔

☆==========☆==========☆

آج ان واقعات کو قریباً تین برس گزر چکے ہیں۔ ان تین برسوں میں کچھ بدل چکا ہے اور بہت کچھ بدل بھی جائے گا لیکن کاشف کا غم آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ اس کے دیئے ہوئے جدائی کے ناقابل علاج زخم سے اب بھی خون رستا رہتا ہے۔ ہولو جزیرے سے ہماری واپسی کی روئیداد ایک الگ کہانی ہے۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہمیں ہماری ہی مرمت شدہ لانچ میں سوار کیا گیا تھا اور دو روز کے اندھے سفر کے بعد سری لنکا کے مشرقی ساحل کے نزدیک ایک جزیرے پر اتار دیا گیا تھا۔ انڈین صحافی جرأت سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے بعد ہم ایک نہایت طویل اور کٹھن سفر کے بعد پاکستان پہنچے تھے۔ اکبر خاں پر چونکہ پولیس والے کے قتل کا سنگین کیس تھا اس لئے وہ پاکستان نہیں آیا تھا بلکہ کالی کٹ میں اپنے پرانے دوست راجے سنگھ کے پاس چلا گیا تھا.......... جولیا بھی اس کے ساتھ تھی' وہ اکبر خاں کے ساتھ دنیا کے آخری کنارے تک جانے کے لئے تیار تھی۔ پاکستان واپس آکر مجھے اور آرزو کو مقدمات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چند ماہ کے لئے ہم دونوں گرفتار بھی رہے تھے پھر سچائی بول اٹھی تھی اور یکے بعد دیگرے ہم بری ہو گئے تھے۔ تھانے کچہری کے چکروں سے راجا کی جان ہم سے بھی پہلے چھوٹ گئی تھی۔ راجا کا سفر نامہ تہلکہ خیز تھا مگر جس طرح ہماری باتوں پر کم لوگوں نے ہی یقین کیا تھا اس طرح راجا کے سفرنامے کو بھی صرف ایک دلچسپ کہانی کے طور پر ہی پڑھا گیا جزیرے کی چند ویڈیو بھی کاشف نے بڑی محنت سے تیار کی تھیں لیکن جزیرے کے لوگوں نے یہ ویڈیوز اور تصویریں ہمیں ساتھ نہیں لانے دی تھیں۔ جزیرے کے حیوانات پر شوراق کے حیرت انگیز اثر و رسوخ کے بارے میں ہم نے جو بھی کہا اور راجا نے جو بھی لکھا اسے اکثر لوگوں نے مبالغہ قرار دیا۔ اس حوالے سے مختلف تبصرے کئے گئے۔ عام تبصرہ یہی تھا کہ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ مختلف پالتو جانوروں کی سخت ٹریننگ کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ بہت کچھ ایسا تھا جو صرف ہماری نظر کا واہمہ تھا۔ ان خیالات پر تبصرہ میرے نزدیک فضول تھا۔ جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ ہم پر بیتی تھی اور جو کچھ بیتی تھی وہ ہمارے ذہنوں پر نقش ہو چکی تھی۔

اکبر خاں پھر پاکستان واپس نہیں آیا' وہ جولیا کے ساتھ انگلینڈ شفٹ ہو چکا ہے۔ میں ایک بار وہاں جاکر اس سے مل بھی چکا ہوں۔ انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنا پٹھانی رکھ رکھاؤ اور مشرقی انداز مکمل طور پر برقرار رکھا ہوا ہے۔ جولیا سے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ میں جب شلوار قمیض والی جولیا سے ملا تو ایک ننھا سا اکبر خاں اس کے کندھے پر چڑھا ہوا تھا اور دوسرا اس کی قمیض میں منہ چھپا کر دودھ پی رہا تھا۔ اکبر خاں نے برمنگھم میں فرنیچر کا شوروم کھول رکھا ہے۔ جولیا نے گوشت کی درجنوں ڈشیں پکانا سیکھ لی ہیں۔ راجا بھی گھربار والا ہو چکا ہے۔ میں اپنے لاہور والے مکان میں دوسری منزل کے کمرے میں آج بھی تنہا ہوں شام کو ورزش سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی کھڑکی کھولتا ہوں اور چوکھٹ پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ دور کہیں مشرقی افق کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ اسی نامعلوم جنگل کی جانب جہاں میرا یار گم ہو گیا تھا۔

آرزو ایبٹ آباد میں اپنی والدہ اور ماموں کے ساتھ مقیم ہے۔ آرزو اور میں محبت کے اٹوٹ رشتے میں بندھے ہیں۔ آرزو کی آنکھوں میں یہ خواب سجا رہتا ہے کہ وہ دلہن بن کر میرے گھر کی دہلیز پار کرے گی' میں بھی اسے اپنانا چاہتا ہوں۔ اپنے دل کے آنگن میں بٹھانا چاہتا ہوں۔ مگر.......... کاشف کا غم مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ آج بھی مجھے یہی لگتا ہے کہ وہ جزیرے کے گھنے جنگل کے اندر میرے ہاتھوں میں دم توڑ رہا ہے۔ میں اس کے دل کو حرکت میں لانے کے لئے اس کے سینے پر دوہتڑ مار رہا ہوں۔ اس کے منہ میں اپنی سانس داخل کر رہا ہوں.......... چیخ رہا ہوں۔ پھر وہ مرجاتا ہے۔ بے حرکت ہو جاتا ہے۔ اس کے بے حرکت لاشے پر کھڑے ہو کر میں شادی کیسے رچاؤں؟ کیسے دلہا بنوں؟ میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ مگر پھر کبھی کبھی کاشف ہی کی گمشدہ آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے۔ اس نے اپنی موت سے کچھ دیر قبل کہا تھا' آرزو ایک آسمانی تحفے کی طرح ہے جلال! اسے بہت سنبھال کر رکھنا۔ وہ تم سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

چند دن پیشتر عید کا تہوار تھا۔ چاند رات کو میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا اور اس گھر کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں کبھی آرزو کا رخ روشن نظر آتا تھا۔ ایسے میں میرے بچھڑے یار کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ آواز مجھ سے پوچھ رہی

تھی۔ "جلال! آرزو تیرے ساتھ کیوں نہیں۔ اسے تیرے ساتھ دیکھنے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ تو آسمانی تحفہ ہے یار.......... میں نے تم سے کہا تھا اسے سنبھال کر رکھنا۔ کیا تحفے کو ایسے سنبھالتے ہیں۔"

میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ بھابی سمن چاند رات کے کپڑے پہنے میرے عقب سے آئی تھیں اور خاموش کھڑی ہوگئی تھیں۔ ننھی رومی بھی ان کے ساتھ تھی۔ بھابی نے رومی سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔ "رومی اپنے چاچو سے کہو کیا اسی کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہونے کا ارادہ ہے۔ آج چاند رات ہے چاند رات میں آہیں نہیں بھرتے۔ چاند رات کو تو روٹھے ہوؤں کو مناتے ہیں اور بچھڑے ہوؤں سے ملتے ہیں۔"

میں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "ٹھیک ہے بھابی۔ آپ جو کہیں گی' میں ویسا کروں گا۔ آپ آنٹی تابندہ سے بات کر لیجئے۔"

بھابی تو جیسے برسوں سے تیار بیٹھی تھیں۔ پچھلے چھ سات دنوں سے وہ اور امی بھاگی بھاگی پھر رہی ہیں آنٹی تابندہ کو بھی اطلاع کردی گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی تھی۔ یہ فون ایبٹ آباد سے تھا۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہا تھا مگر دوسری طرف سے فقط سانسوں کی آواز آتی رہی تھی۔ شوخ شرمیلے سانسوں کی آواز.......... میں آرزو کو اب صرف اس کے سانسوں سے بھی پہچان لیتا ہوں..........

میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ "پیارے نقاب پوش ڈاکو۔ تم سے پھر ملاقات ہو گی۔"

تمت بالخیر